گمشدہ افراد کا دکھ مجھے اپنی ماں سے ملا، **حامد میر** سے سنسنی خیز انٹرویو

احساس آزادی نمبر

اُردو ڈائجسٹ

اگست 2013ء

/urdudigest.pk

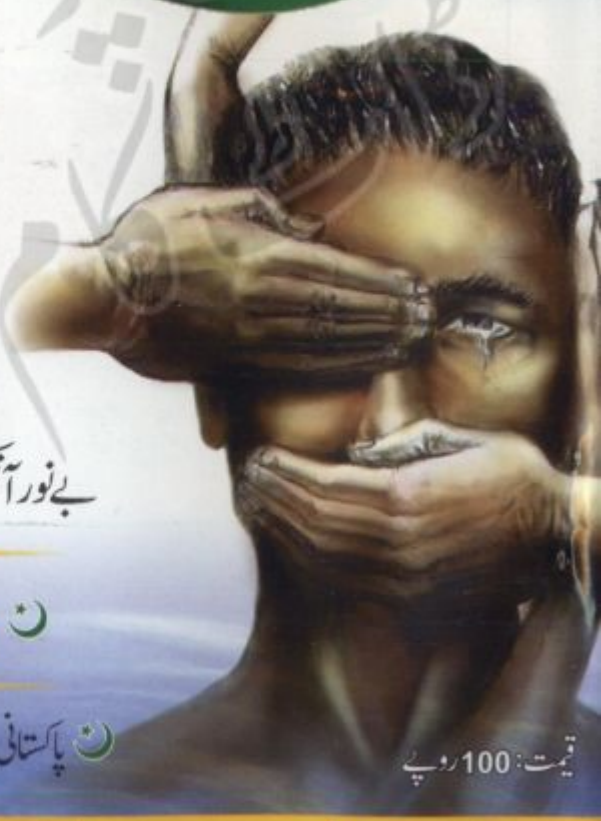

- مہیب خطرات اور عظیم امکانات کے درمیان !
- ایک ناکام سیاسی ڈرون حملہ
- کیا قائداعظم برطانوی شہری تھے ؟
- دل ہلا دینے والی داستان
- بے نور آنکھوں میں آزادی کا کیسا تصور سجا تھا ؟
- ایک برازیلی کا حیران کن سفرِ پاکستان
- پاکستانی رینجرز نے بھارتی عوام کا دل جیت لیا

قیمت: 100 روپے

کیا لاکھوں اخوانیوں کو اس بار جھکانا ممکن ہوگا؟

کیوں "داؤدی روزے" سے بہتر کوئی اور روزہ نہیں ؟

بھارتی کھلاڑیوں نے شرفا کے کھیل کو کیسے بدنام کیا ؟

کچی یا پکی..... کون سی سبزیاں بہتر؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

اللہ کی باندھی ہوئی حدیں

روزوں کی راتوں میں تمہارے لیے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا ہے۔O

(سورۃ البقرہ 187:2)

اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔ پھر روزہ رات تک پورا کرو اور جب تک تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو عورتوں سے نہ ملو۔ یہ حدیں باندھی ہیں اللہ کی سو ان کے پاس نہ جانا۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ بچتے رہیں۔O

(سورۃ البقرہ 187:2)

رسول ﷺ کا فرمان

روزے دار کی دو مسرتیں

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس دن کوئی شخص روزے سے ہو تو اسے چاہیے کہ نہ تو فحش کلامی کرے، نہ چیخے چلائے اور جھگڑے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''روزے دار کو دو مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جب افطار کرتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور جب اپنے رب سے ملے گا تو وہ بھی اس کے روزے کے سبب اس سے خوش ہوگا۔''

(بخاری کتاب 30: باب 9 مسلم کتاب الصیام۔ باب 30)

جنت کا دروازہ

حضرت سہیل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں ایک دروازہ ہے، جس کا نام ''ریان'' (سیراب کرنے والا) ہے۔ اس دروازے سے روزِ قیامت صرف روزے دار داخل ہوں گے۔''

(بخاری کتاب 30: باب 4 مسلم کتاب الصیام۔ باب 30)

اُردو ڈائجسٹ

اگست 2013ء
رمضان المبارک 1434ھ
جلد نمبر 53 شمارہ نمبر 8
www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
مینیجنگ ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی

ایڈیٹر: اختر عباس
ایڈیٹر (ریسرچ): پروفیسر محمد فاروق قریشی
مجلس تحریر: حافظ افروغ حسن، نوید اسلام صدیقی، سلمیٰ اعوان
سب ایڈیٹرز: غلام سجاد، حنا انور
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
تجارتی کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
تخلیق و تزئین: واصف ملک، راسخہ رضا
کمپوزر: اشرف سکندر، اشفاق علی
پروف خوان: کلیم اللہ فاروقی

مارکیٹنگ/اشتہارات

adv

ڈائریکٹر مارکیٹنگ: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: احمد فیاض 0324-4255178
لاہور: ندیم حامد 0300-4242620
گجرات/گوجرانوالہ: احسان اللہ بٹ 0300-9620294

سالانہ خریداری

خریداری نمبر ضرور تحریر کیجیے
فون: +92-42-37589957 subscription@urdu-digest.com

اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

330 روپے کی شاندار بچت کے ساتھ

پاکستان 1080 کے بجائے 750 روپے میں
بیرون ملک 50 امریکی ڈالر
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
editor@urdu-digest.com

قیمت 100 روپے

ناشر و طابع الطاف حسن قریشی نے جسارت پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

ہم آزادی کی خوشیوں کے اہل کب ہوں گے!

جون میں بچوں کو تعطیلات ہوئیں تو کینیڈا اور امریکا جانے کا پروگرام طے تھا۔ کینیڈا کے شہر وینکوور (Vancouver) اس لیے کہ میں اپنے دیرینہ دوست شیخ داؤد کو ملنا چاہتا تھا جو ایک سال پہلے بیوی بچوں سمیت قسمت آزمائی کے لیے کینیڈا آیا تھا اور امریکا کے شہر سیٹل (Seattle) میں ایک تقریب میں شرکت کرنا تھی۔ وینکوور ائیر پورٹ پر میرا دوست ہمیں لینے آیا ہوا تھا۔ اسے گلے لگایا اور اس کے ساتھ اس کے گھر روانہ ہو گئے۔ نظم و ضبط اور قانون کی حکمرانی کے پاسدار کینیڈین معاشرے میں پُرمشقت اور تھکا دینے والے معمولات زندگی کے باوجود دونوں میاں بیوی اور بچے بہت خوش اور مطمئن لگ رہے تھے۔ ویک اینڈ پر وہ مجھے اپنے پاکستانی دوستوں سے ملوانے لے گیا جن میں سے بیشتر ڈاکٹر تھے۔ کھانے پر جب گفتگو کا سلسلہ چلا تو وہ سب پاکستان کے حوالے سے فکرمند تھے۔ خاص طور پر وطن عزیز میں خسرہ اور پولیو سے ننھے بچوں کی ہلاکتوں اور فرسودہ نظام تعلیم پر رنجیدہ تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ کینیڈا میں کسی گورے کو کالے پڑا میر کو غریب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ ڈرائیونگ لائسنس کے حصول سے لے کر بچوں کے اسکول میں داخلے تک ہر کام میرٹ پر ہوتا ہے۔ سب کو قطار میں کھڑے ہونا پڑتا ہے۔ اسکول کی تعلیم بالکل مفت ہے۔ ملک کے تمام افراد دیانت داری کے ساتھ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ٹیکس، بجلی یا گیس چوری کا کوئی تصور ہی نہیں۔ گردوارے، چرچ اور مسجدیں بھی آباد ہیں۔ کوئی کسی کے معاملے میں دخل اندازی نہیں کرتا۔ قانونی عمل داری اس حد تک ہے کہ اگر سڑک پر 'STOP' کا سائن بورڈ لگا ہوا ہے تو وہاں پر ہر گاڑی کے لیے رکنا ضروری ہے چاہے وہاں ٹریفک پولیس موجود نہ ہو۔

لائبریری ہر بچے اور بڑے کی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ اس مفت سہولت کے تحت کوئی بھی شہری ایک مہینے میں 20 کتابوں کا اجراء کروا سکتا ہے اور ای۔لائبریری کے تحت تو لاتعداد کتابیں گھر بیٹھے ہی پڑھ سکتا ہے۔

یکم جولائی کو کینیڈین قوم، جس کا بڑا حصہ دنیا کے مختلف ممالک سے نقل مکانی کر کے آنے والوں پر مشتمل ہے جن میں سکھ، ہندو، مسلمان، چینی وغیرہ شامل ہیں اپنا یوم آزادی بڑے جوش و خروش سے منا رہے تھے اور میں اپنے وطن پاکستان کے حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیسے ایک سال کے دوران 18 ہزار گیس چور پکڑے گئے، لیکن ابھی بھی لاکھوں کی تعداد میں گیس اور بجلی چوری کرنے والے قانون کی گرفت میں نہیں آسکے۔ وہ نہ صرف خود بجلی اور گیس چوری کرتے ہیں بلکہ اردگرد کے گھروں کو بھی بڑی دیدہ دلیری سے بیچتے ہیں۔ وطن عزیز میں 20 کروڑ افراد میں سے صرف چند لاکھ ہی ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ اگر کوئی افسر قانون پر عمل درآمد کرانے کے لیے آگے بڑھتا ہے تو اسے ملازمت سے معطل کر کے ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے۔

ہم نے پاکستان میں رہ کر کمایا، جائدادیں بنائیں، کاروبار بڑھائے، لیکن حکومت کو ٹیکس نہیں دیتے۔ میں یہ بات بڑے وثوق سے لکھ رہا ہوں کہ ہمارے وطن میں ایک بڑی اکثریت کے کاروبار کی بنیاد ٹیکس، بجلی اور گیس کی چوری پر کھڑی ہے۔ ہم کسی قسم کا بھی ٹیکس دینا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ بجلی اور گیس چوروں کے خلاف شروع کی جانے والی مہم میں حکومت کو ہر طرح کی سیاسی وابستگیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بلاتفریق کارروائی کرنی ہوگی۔ جب تک معاشرے سے اس سرطان کو سفاک سرجری کے ذریعے جڑ سے نہیں اکھاڑا جاتا ہم آزادی کی خوشیوں اور مبارک باد کے اہل نہیں ہو سکتے۔

طیب اعجاز قریشی
tayyab.aijaz@urdu-digest.com

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اٹھائیے

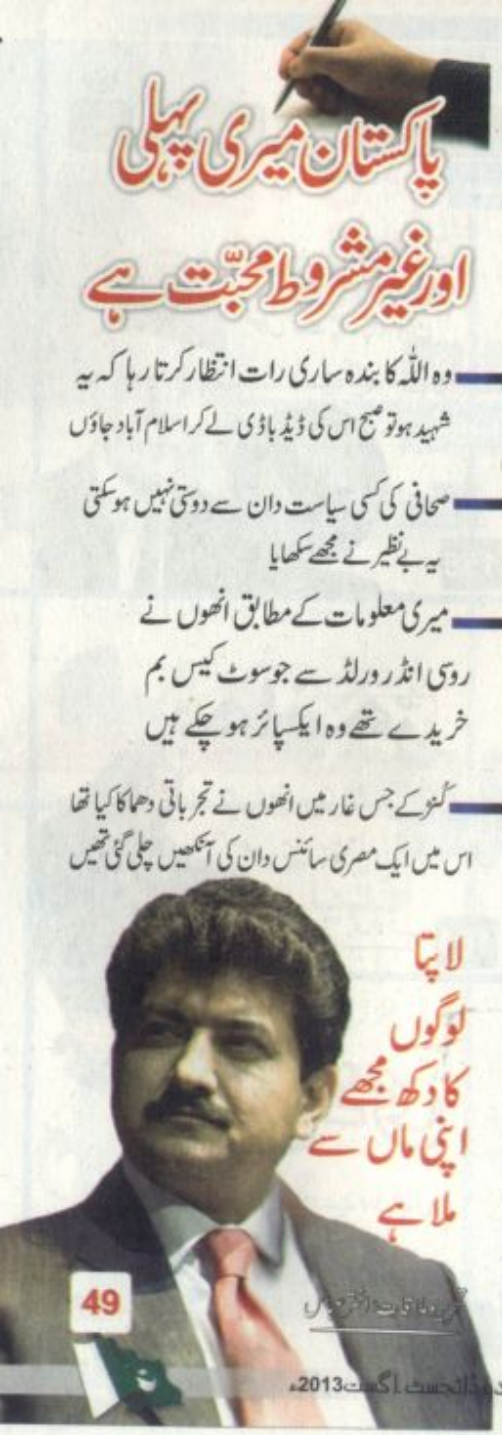

پاکستان میری پہلی اور غیر مشروط محبت ہے

وہ اللہ کا بندہ ساری رات انتظار کرتا رہا کہ یہ شہید ہو تو صبح اس کی ڈیڈ باڈی لے کر اسلام آباد جاؤں

صحافی کی کسی سیاست دان سے دوستی نہیں ہو سکتی یہ بے نظیر نے مجھے سکھایا

میری معلومات کے مطابق انھوں نے روسی انڈر ورلڈ سے جو سوٹ کیس بم خریدے تھے وہ ایکسپائر ہو چکے ہیں

گنو کے جس غار میں انھوں نے تجرباتی دھماکا کیا تھا اس میں ایک مصری سائنس دان کی آنکھیں چلی گئی تھیں

لاپتا لوگوں کا دکھ مجھے اپنی ماں سے ملا ہے

تحریر: ثاقب اختر عباس

اگست 2013ء

فہرست

احساس آزادی

"احساسِ زیاں"

زخموں سے چور چور بدن لیے ایک دیس کی کہانی

نبیلہ ثقلین

155

بابا جناح

قائد کی زبان نہ سمجھنے والے بھی اس پر یقین رکھتے تھے

اشفاق احمد

114

بھانبھڑ

ایک نمانی ماں کی آنکھوں کے گہرے گڑھوں میں بہتے آنسوؤں کی داستان

نجمہ ثاقب

161

چراغ

اپنی لو روشنی کے لیے ترساں و ترساں ایک چراغ کی داستان

174

آزادی

ایک اندھی لڑکی کی دل دہلا دینے والی کہانی

میرزا ادیب

191

بوڑھی چیل

ایک بوڑھی چیل کا حیران کن ماجرا

سجاد قادر

1947 کی ہجرت کے پس منظر میں لکھی گئی خاص کہانی

205

طنز و مزاح و شکاریات

تباہ کُن شاہین

ایک عظیم الجثہ شاہین کے ساتھ پوٹھوہار میں شکار کے یادگار لمحات

عزیز احمد لیل احامد مشہور

89

آئینہ سے شیشہ بننے تک

ہوسٹل میں گزرے زندگی کے ان جاندار اور شاندار لمحات کا تذکرہ

مبشر الحق عباسی

81

صحت

کچی یا پکی کون سی سبزیاں بہتر؟

صحت کے لیے مفید سبزیاں کون سی ہیں؟

ڈاکٹر عائشہ خان

65

تخیلاتی قوت

سوچ کے عمل کو تیز کرنے کے پانچ طریقے کون سے ہیں؟

شکیل احمد

73

فیچر

انڈیا "پیسہ" لیگ کا تماشا

بھارتی کھلاڑیوں نے شرفا کے کھیل کو گندگی میں لتھیڑ دیا

عالیہ احمد

267

مکہ کلاک ٹاور

دنیا کی دوسری بلند ترین عمارت کا تذکرہ

نقیر اللہ خاں

221

فہرست اگست 2013ء

اداریہ

15 کچھ اپنی زبان میں — الطاف حسن قریشی
میرے ہم وطنو! آزادی کی حفاظت میں سردھڑ کی بازی لگا دو

17 ہم کہاں کھڑے ہیں — الطاف حسن قریشی
مہیب خطرات اور عظیم امکانات

اسلامی زندگی کی کہکشاں

33 ہے دعا یاد مگر — رخسانہ بشیر
ایک ایسی کیفیت کا بیاں جس کی سب کو تلاش رہتی ہے

39 نتھا دامی — عبدالمالک مجاہد
ہالینڈ کی ایک بڑھیا کی کہانی

43 اپنی ہی طرز کا آدمی — خالد محمد خالد/ارشاد الرحمن
ان کے کانوں نے وفاداری کا حق ادا کر دیا

سائنس و ٹیکنالوجی

97 انسان کی بدنصیبی — قاضی مظہر الدین طارق
ایک مضحکہ خیز غیر علمی اور غیر منطقی دلیل کا دلچسپ ماجرا

102 ہارڈ ڈسک کو تیز رفتار بنائیے — عبداللہ خان
ہارڈ ڈسک کو تیز رفتار اور موثر بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے

105 حسرت ان غنچوں پہ — معظم علی
ان ایجادات کا تذکرہ جو مقبولیت حاصل نہ کر سکیں

109 مفادات کی جنگ — ایرک ونی کوف/فیضان اللہ خان
ایک اور سیارے پر پائی جانے والی زندگی کا پُر اثر ماجرا

احساسِ آزادی

120 ورثے میں ملے تین عشق — اوریا مقبول جان
وارث میر کا لکھا ہوا 1971ء کا خط

123 پاکستانی رینجرز — عالیہ احمد
بارڈر کراس کرنے والی ایک سات سالہ راجستھانی بچی کی کہانی

126 برازیلی نے پاکستان کو کیسا پایا؟ — وے شین
اتنے کم خرچ میں شاید ہی کسی ملک کی سیاحت ممکن ہو

130 کیا قائداعظم برطانوی شہری تھے؟ — ابو صارم
ایک ناکام سیاسی ڈرون حملہ

133 آزادی کا ترجمان — شمع شریف
قرارداد پاکستان کی یاد میں تعمیر کیے جانے والے منار کی داستان

135 کامیاب وکیل — رضی الدین سید
اسلامی نظام کی موجودگی میں ہمیں اب کوئی دوسرا "ارم" نہیں چاہیے

140 انسان اور آزادی — نوید اسلام صدیقی
ایک تحریر ان کے لیے جو سوچنا اور غور کرنا پسند کرتے ہیں

148 پاکستان اور بچے — عائشہ انعام
کم عمر بابر اقبال نے مائیکروسافٹ میں چار عالمی اعزازات حاصل کیے

150 تحریک پاکستان کے نعرے — رانا محمد شاہد
پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ

152 مفہوم آزادی — جاوید احمد صدیقی
مہاجروں کے ساتھ انصار نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے

174 چراغ — نذیر انبالوی
اپنی ہی روشنی کے لیے لرزاں و ترساں ایک چراغ کی کہانی

182 کیتھارسس — محمد الیاس
ایک نرالے اطوار والے اعلیٰ حضرت کا دلچسپ ماجرا

191 آزادی — میرزا ادیب
ایک اندھی لڑکی کی دل دہلا دینے والی کہانی

200 شرافت — سلیم خاں گمی/نوید سروش
ایک مکان مالک کی شریفانہ مہربانی کا احوال

209 پاکستان میں اوّل اوّل — زاہد حسین انجم
ہم اپنی ہی تاریخ کی خوب صورتی سے ناواقف ہیں

213 کہاوتوں کی دلچسپ کہانیاں — پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی
اُردو زبان کی خوبصورتی محاوروں اور اس کی کہانیوں سے ہے

فیچر

257 انکشاف انگیز کتاب — عمیر محمود
نکسن نے کہا "میں پاکستان کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

219 ڈورے مون — زینب محمود
کاش میرے پاس بھی ڈورے مون کا گیجٹ ہوتا

سفر نامہ

225 سفر نامہ غزہ — اختر عباس

باتیں نئی تحریریں نئی

241 تصویر — ناجیہ ملک
ایک معصوم بچی کی گمشدہ کتاب کا ماجرا

243 سمندر کنارا — عبدالقیوم
سمندر کی بپھری موجوں کی ساحرانہ کشش کا احوال

247 توجہ دیں تعریف کریں — محمد عاطف سلیم
والدین اور اولاد کے درمیان دوری کی اصل وجہ کیا ہے؟

251 چھوٹا سا سفر — محمد قاسم رضا
ایک بے روزگار نوجوان کے ارمانوں کا قصہ

مستقل سلسلے

داؤدی روزہ (نوشین ناز) تبصرہ کتب (غلام سجاد)، دانش مشرق (رفیدہ کلیم فاروقی)، قصہ کوئز (غلام سجاد)، بوجھیں تو جانیں (ادارہ)، چمن خیال (قارئین کے خطوط) دل پہ دستک (اختر عباس)

میرے ہم وطنو!
آزادی کی حفاظت میں سر دھڑ کی بازی لگا دو

14 اگست ہماری سیاسی تاریخ کا سب سے روشن اور مبارک دن ہے کہ اِس روز برصغیر کے مسلمان قائداعظم کی بصیرت افروز اور اولوالعزم قیادت میں انگریزوں کی صد سالہ غلامی اور ہندو اکثریت کے جبر سے آزاد ہوئے اور دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ برہمن جن کے ہاتھ میں ہندو اکثریت کی لیڈرشپ تھی، اُنھوں نے ہندوستان کی تقسیم رکوانے کے لیے ہر طرح کے جتن کیے، سازشوں کے بہت جال بُنے، مگر ناکام ہو جانے کی صورت میں سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف اتنا مشتعل کیا کہ مشرقی پنجاب میں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان بڑی سفاکی اور بے دردی سے شہید کر دیے گئے اور ہزاروں خواتین اپنی عزت بچانے کے لیے کنوؤں میں کود پڑیں اور اتنی ہی تعداد میں غیر مسلموں کی ہولناکیوں کا شکار ہوئیں۔ پاکستان بنا، تو ہر سو خون بہہ رہا تھا اور بڑی تعداد میں لٹے پھٹے قافلے اپنی منزلِ مراد کی سرحدوں میں داخل ہو رہے تھے۔ سات آٹھ ماہ میں ایک کروڑ کے لگ بھگ مسلمان پنجاب، سندھ اور سرحد میں پناہ لے چکے تھے جبکہ غیر مسلموں کے چلے جانے سے پاکستان کا پورا نظم و نسق شدید ابتری کی حالت میں تھا اور ہماری سیاسی قیادت ناتجربے کار اور اتنا زیادہ بوجھ اُٹھانے کی صلاحیت سے محروم دکھائی دیتی تھی۔ مؤرخین کی نظر میں پاکستان کی تخلیق دنیا کا بہت بڑا معجزہ تھا، تو مشکلات کے گرداب میں اِس کا قائم رہنا دوسرا بڑا معجزہ تھا۔

پاکستان میں آنے والے مہاجرین کا مقامی آبادی نے اِسی عظیم جذبے سے استقبال کیا جس بے نظیر جذبے کا مظاہرہ مدینے کے انصار نے مہاجرین کا خیر مقدم کرتے وقت کیا تھا اور اُنھیں اخوت کے رشتوں کے اندر جذب کر لیا تھا۔ بیسویں صدی کا یہ ایک تاریخ ساز منظر نامہ تھا جس میں ایثار اور جذبہ مؤاخات کی ناقابلِ فراموش داستانیں رقم ہوئیں اور پنڈت نہرو کی یہ پیش گوئی حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی کہ پاکستان چھ مہینوں میں

انتظامی اور معاشی طور پر ناکام ہو جائے گا اور بھارت کے اندر دوبارہ مدغم ہونے کے لیے منتیں کرے گا۔ عوامی سطح پر عظیم الشان جذبوں نے سیاسی قیادت کے حوصلے بلند کیے جس نے بے سروسامانی اور شدید افراتفری کی حالت میں انتظامی ڈھانچہ کھڑا کیا اور اقتصادی امور میں ایسی مہارت کا ثبوت دیا کہ پاکستان کا پہلا بجٹ انتہائی مناسب اور فاضل تھا۔ چار پانچ برسوں میں ہماری معیشت اس قدر مستحکم ہوگئی کہ بھارت کا روپیہ پاکستانی روپے کے مقابلے میں اپنی قدر کھو بیٹھا۔ بھارتی قیادت نے الٹی میٹم دیا کہ اگر پاکستان نے اپنے روپے کی قیمت کم نہ کی، تو اُس پر فوجیں چڑھ دوڑیں گی۔ ہماری بیدار مغز قیادت نے یہ الٹی میٹم پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ پاکستان کے معماروں نے فی الواقع عظیم الشان کارنامے سرانجام دیے تھے۔

نعمتِ آزادی کی بدولت آج پاکستان کے مسلمان تعلیم، سائنس، ٹیکنالوجی اور بینکنگ سیکٹر میں بڑا نام پیدا کر چکے ہیں اور عوام کا معیارِ زندگی عہدِ غلامی سے کہیں بہتر ہے۔ فزیکل انفراسٹرکچر میں بھی قابلِ ذکر ترقی ہوئی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان اسلامی دنیا کی واحد ایٹمی طاقت ہے، مگر 1971ء میں اُسے جس ہولناک حادثے سے گزرنا پڑا، وہ آج بھی اُس کا تعاقب کر رہا ہے۔ فاٹا سے لے کر کراچی تک اور بلتستان سے لے کر بلوچستان تک پاکستانیت پر دہشت گرد، علیحدگی پسند اور غیر ملکی ایجنٹ پوری قوت سے حملہ آور ہو رہے ہیں اور پاکستان سے محبت کرنے والے لوگ خودکش حملوں، بموں اور گولیوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ پاکستان دشمن عناصر معاشرے میں طرح طرح کے شوشے چھوڑ رہے ہیں اور عوام اور فوجی اداروں کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ اِس وقت پاکستان کی ریاست سخت دباؤ میں ہے اور اِس کی رٹ محدود ہوتی جا رہی ہے۔

اہلِ وطن کو اِس روح گداز صورتِ حال کا بڑی جرأت، مردانگی اور ہوش مندی سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ اِس وقت قومی آزادی بھی خطرے میں ہے اور قومی سلامتی کی حفاظت کرنے والے ادارے بھی مشرقی پاکستان کی طرح اِس بار بھی غارت گر ہمارے اندر موجود ہیں اور ہم داخلی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ حالات میں بہتری لانے کے لیے ہمیں اِس اصول پر کاربند رہنا ہوگا جو قراردادِ مقاصد میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے کہ اقتدار صرف چُنے ہوئے نمایندوں کے ذریعے ہی بروئے کار لایا جا سکے گا۔ یہ نازک وقت سر جوڑ کر بیٹھنے اور اخلاص کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ چلنے کا ہے۔ اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ہماری قیادت اپنے عمل کے ذریعے عوام کے اندر آزادی کے تحفظ کی جوت جگائیں اور مستقبل کے بارے میں ایک مثبت سوچ کی پرورش کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے والے اندھیروں کو شکست دیں گے اور عزیمت اور ایقان کی شمعیں فروزاں کریں گے۔

الطاف حسن قریشی

مہیب خطرات اور عظیم امکانات کے درمیان

تحریکِ پاکستان میں بڑی وسعت اور گیرائی تھی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے تاریخ سے رشتے کمزور پڑتے، فکری خلجان پیدا ہوتے اور پاکستان کو سیاسی اور سماجی طور پر کمزور کرتے گئے۔

قدرت ایک بار پھر ہمیں آزمائشوں کی بھٹی سے گزار کر امکانات کا ایک جہاں بخش دینا چاہتی ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے بال و پر میں پرواز کی کتنی طاقت ہے اور کیا سمت کا صحیح تعین ہو چکا ہے اور ہماری قیادت میں قائداعظم جیسی بصیرت اور اخلاص کی جھلک کس قدر ہے۔

حالات کا تجزیہ: الطاف حسن قریشی

ہم اِسے محض حُسنِ اتفاق نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ گہرے تہذیبی شعور کا ایک ناگزیر اظہار تھا کہ جب 23 مارچ 1940ء کے تاریخ ساز دن برصغیر کے مسلمانوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے قائد حضرت محمد علی جناح کی قیادت میں اپنے لیے جُداگانہ وطن کا مطالبہ کیا، تو اِس کے ساتھ ہی آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کی حمایت میں قرارداد منظور کی۔ بنیادی طور پر تحریکِ پاکستان پوری دنیا کے محکوم مسلمانوں کی تحریکِ آزادی کے مانند تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب 46-1945ء کے انتخابات میں آل انڈیا مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت کی حیثیت مسلم ہوگئی، تو قائداعظم نے عالمِ اسلام کی اہم شخصیتوں کے ساتھ ملاقاتوں، مسئلہ فلسطین کے حوالے سے عرب زعماء کو برصغیر کے مسلمانوں کی حمایت کا براہِ راست یقین دلانے اور پاکستان کی جدوجہد کے مقاصد پوری مسلم دنیا پر واضح کرنے کے لیے لندن جاتے ہوئے قاہرہ میں تین روز قیام کیا۔ وہ 16 دسمبر 1946ء کی سہ پہر قاہرہ ائیرپورٹ پر اُترے، تو اُن کے استقبال کے لیے اخوان المسلمون کے پُرجوش نوجوان موجود تھے جو اپنے مرشد عام امام حسن البنا کی ہدایت پر آئے تھے۔ امام حسن البنا جنہوں نے اخوان کے لاکھوں پیروکاروں میں روحانی کیفیت پیدا کی تھی، وہ اسلام اور عصرِ حاضر کی سیاسی جہتوں کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔

مفتیٔ اعظم فلسطین جناب امین الحسینی جنہوں نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران فلسطینیوں کی آزادی کے لیے ایک زبردست کردار ادا کیا تھا اور اُن کی حضرت علامہ اقبالؒ بڑی قدر کرتے تھے، اُن کی ایک تحریر سے پتا چلتا ہے کہ قائداعظم نے قاہرہ میں اپنے قیام کے دوران کن کن اہم شخصیتوں سے عالمِ اسلام کے سُلگتے مسائل پر تبادلۂ

خیال کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں: ''مجھے یاد ہے کہ ایک دعوت کا اہتمام عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عبدالرحمٰن عزام نے قائداعظم محمد علی جناح کے اعزاز میں کیا تھا۔ قائداعظم کے ہمراہ لیاقت علی خاں بھی تھے۔ عزام صاحب کے گھر سب سے پہلے پہنچنے والے امام حسن البنا تھے۔ ہم قائداعظم سے دیر تک محوِ گفتگو رہے۔ اِس موقع پر امام حسن البنا نے قائد تحریکِ پاکستان سے یک جہتی کے طور پر قرآن کا نسخہ پیش کیا تھا۔ یہ نسخہ مزارِ قائداعظم کے گوشۂ نوادرات میں آج بھی موجود ہے۔ قائداعظم نے قاہرہ میں اسلام کی بے مثل شخصیتوں سے ملاقاتوں کے علاوہ پبلک تقریریں بھی کیں' ایک پریس کانفرنس سے خطاب بھی کیا اور ریڈیو قاہرہ سے اُن کی تقریر بھی نشر ہوئی۔ اُس وقت عالمِ اسلام ایک مشترک دور سے گزر رہا تھا اور قائداعظم دنیا میں پھیلی ہوئی مسلم اقوام سے رابطے میں رہتے تھے اور رابطوں کا یہ دائرہ لاطینی امریکا میں آباد مسلمانوں اور بوسنیا تک پھیلا ہوا تھا۔ مصر کے امام حسن البنا قائداعظم سے ملاقات کے بعد اُن کے ساتھ خط کتابت بھی کرتے رہے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ تحریکِ پاکستان کو اسلامی دنیا میں روشناس کرانے میں اخوان المسلمون نے عظیم الشان کردار ادا کیا تھا جبکہ اُس وقت عالمِ عرب خاص طور پر مصر کے سیکولر اور قوم پرست عناصر گاندھی اور نہرو کے سحر میں گرفتار تھے۔ اسی لیے صدر جمال عبدالناصر کا واضح جھکاؤ بھارت کی طرف تھا۔

☆☆☆

یہاں اُس خط کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو چالیس سالہ مرشد عام نے ستر سالہ قائد کو 28 مئی 1947ء کو لکھا تھا: ''میرے محترم قائد محمد علی جناح۔۔۔ مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے انتہائی مسرت ہو رہی ہے کہ پوری وادیٔ نیل پورے خلوصِ دل سے آپ کی مکمل تائید کرتی ہے اور بھرپور اعتماد رکھتی ہے کہ آپ کی زیرِ قیادت یہ جدوجہد ہندوستان کی اسلامی قوم کو اتحاد سے سرفراز کرے گی اور آزادی کے لیے جدوجہد کامیاب ہوگی۔'' اُنہی کا ایک اور خط اِن عظیم جذبوں کی ترجمانی کرتا ہے جو عالمِ اسلام کی قیادتوں کے درمیان مشترک تھے۔ یہ خط 24 نومبر 1947ء کا ہے۔ اِس میں قائداعظم کو خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے: ''ہم وہ مبارک گھڑیاں فراموش نہیں کر سکتے جن میں اہلِ مصر کو آپ کی زیارت اور ہمیں آپ سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی۔ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہماری وہ آرزوئیں پوری کر دی ہیں جن کے بارے میں ہم نے باہم گفتگو کی تھی اور پاکستان کی اسلامی ریاست ایک حقیقت کی صورت میں نقشۂ عالم پر موجود ہے' ہم آپ کی خدمت میں مبارک باد اور نیک تمنائیں پیش کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ ہم آپ کے شانہ بہ شانہ ہر قربانی کے لیے تیار ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں اخوان المسلمون کے سیکرٹری جنرل اور مجاہد صالح عشماوی کو بھیج رہا ہوں۔''

تحریکِ پاکستان سے اسلامی دنیا کے ساتھ رشتوں کی بدولت قیامِ پاکستان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی تھی اور اسلامی ذہن رکھنے والی تمام قوتیں اِس نئی مملکت کی پشت پر کھڑی تھیں۔ تقسیمِ ہند کے وقت جب خونیں فسادات پھوٹ پڑے' تو امام حسن البنا نے قائداعظم کے نام تار ارسال کیا جس میں گہری ہمدردی کا اظہار تھا جبکہ بھارت کی قیادت کو بھیجے ہوئے تار میں فسادات پر شدید احتجاج کیا گیا تھا۔ اُن دنوں تحریکِ پاکستان دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں میں بسی ہوئی تھی اور ترکی کے سیکولر بھی پاکستان کے حامی تھے۔ قائداعظم فلسطین کے مسئلے کا گہرائی سے جائزہ لیتے اور بیانات

جاری کرتے رہتے تھے۔ اقوامِ متحدہ نے جب اسرائیلی ریاست کے قیام کا منصوبہ منظور کیا' تو اُنہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا اور کامل غور و خوض کے بعد یہ قرارداد منظور ہوئی کہ اقوامِ متحدہ نے انصاف کے تمام تقاضے پامال کر ڈالے ہیں اور وہ ایک ناجائز بچے کو جنم دینے پر تُلا ہوا ہے جسے برصغیر کے مسلمان کبھی قبول نہیں کریں گے اور فلسطینیوں کی جدوجہدِ آزادی میں پورا پورا ساتھ دیں گے۔ اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان ہوتے ہی یہودیوں کی دہشت گرد تنظیموں نے فلسطینیوں کو اُن کے علاقوں سے بے دخل کرنے کے لیے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا' بستیوں کی بستیاں نذرِ آتش کر ڈالیں اور بچے اور عورتیں دہشت گردی کا نشانہ بنتے رہے۔ عرب لیگ نے اقوامِ متحدہ کی قرارداد مسترد کر دی اور اپنے ممبر ملکوں سے فلسطینیوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کہا۔ اُس وقت فوجی اعتبار سے مصر سب سے زیادہ طاقت ور ملک سمجھا جاتا تھا' چنانچہ شاہ فاروق نے مصری فوجیں فلسطینیوں کی مدد کے لیے بھیجیں جو ناکارہ اسلحے اور آرام کوشی کے سبب جلد پسپا ہوگئیں' مگر اخوان سرفروش بڑی بے جگری سے لڑتے رہے۔ اِس پر یہود نواز امریکی حکومت کو شدت سے احساس ہوا کہ اخوان المسلمون کے مرشد عام کو راستے سے ہٹائے بغیر اسرائیلی ریاست قائم نہ ہو سکے گی' چنانچہ 12 فروری 1949ء کو جب امام حسن البنا قاہرہ میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ نوجوانوں کے ایک اہم اجلاس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے' تو اُن پر نامعلوم افراد کی طرف سے قاتلانہ حملہ ہوا۔ حکومت نے ہسپتال میں ڈاکٹروں کو اُنہیں طبی امداد فراہم کرنے سے روک دیا۔ امام کی میت رات کی تاریکی میں اُن کے گھر پہنچائی گئی۔

☆☆☆

امام حسن البنا کا گھر عام سی بستی میں واقع تھا۔ پولیس نے اُس پوری بستی کو گھیرے میں لے لیا اور لوگوں کو اُن کے جنازے میں شریک نہیں ہونے دیا اور شدید خوف و ہراس کی حالت میں صرف اُن کی بیٹیوں نے اپنے والد کی میت قبر میں اُتاری۔ تاریخ کا یہ ایک انتہائی دردناک لمحہ تھا۔ دوسری طرف یہودیوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف مزاحمت کرتے وقت فوج کا ایک نیشنلسٹ گروپ اخوان سے متاثر ہو چکا تھا جس میں نجیب' جمال عبدالناصر اور انوار السادات شامل تھے۔ نجیب اپنے کردار اور پیشہ ورانہ مہارت کے اعتبار سے نوجوان افسروں میں بہت مقبول تھا۔ اُس کی سربراہی میں اِس گروپ نے فوجی بغاوت کرتے ہوئے شاہ فاروق کو اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر اقتدار چھوڑنے کا الٹی میٹم دیا اور یوں اُسے تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ صرف چند ماہ نجیب اقتدار میں رہا اور جمال عبدالناصر عرب قومیت کے بلند بانگ نعرے پر مصر میں سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔ اُسے اخوان المسلمون کی تنظیمی قوت اور جذبۂ سرفروشی کا خوب اندازہ تھا' اِس لیے اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لیے اخوانیوں کے خلاف انتہائی بے دردی سے ریاستی مشینری استعمال کی۔ ہزاروں اخوانی بغاوت کے الزام میں جیلوں میں ٹھونس دیے اور اُن پر کتے چھوڑ دیے گئے جو اُن کی پنڈلیوں کا گوشت بھنبھوڑتے رہے۔ اخوان جن کے لاکھوں فدائین مصر میں موجود تھے' اُنہوں نے اِن لرزہ خیز مظالم کا صبر اور صلوٰۃ کی عظیم قوت سے مقابلہ کیا۔ پاکستان میں سیاسی اور دینی جماعتیں اور اخبارات اخوان المسلمون کے حق میں آواز بلند کرتے اور اخلاقی حمایت فراہم کرتے رہے۔

امام حسن البنا کی شہادت سے ایک مدت بعد سید قطب اخوان کے مرشد عام چنے گئے۔ وہ حسن البنا کی شہادت کے

وقت تعلیم کے شعبے میں ایک بڑے منصب پر فائز تھے اور اُن کی قیادت میں ایک وفد واشنگٹن میں تھا۔ وہاں اُن کی چند امریکی حکام سے ملاقاتیں ہوئیں جو اس بات پر بہت خوش نظر آئے کہ ہمارا بہت بڑا دشمن راستے سے ہٹ گیا ہے۔ وہ حسن البنا کا نام بار بار لے رہے تھے۔ سید قطب تب تک اُن کی شخصیت اور اُن کی تنظیم سے واقف نہیں تھے۔ واپسی پر اُنہوں نے سب سے پہلے اخوان کا لٹریچر تلاش کیا اور اس کے مطالعے سے اُن کی کایا پلٹ گئی۔ سرکاری ملازمت چھوڑ کر وہ قرآن وحدیث کے مطالعے میں شب و روز مصروف ہو گئے اور اسلام کو ایک مکمل نظامِ حیات کی وسعتوں کے ساتھ سمجھنے کی کاوش کرتے رہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس میں عصرِ حاضر کے تمام بڑے مسائل کا حل موجود ہے۔ اُنہوں نے دین کے فکری، معاشرتی، اخلاقی اور اجتماعی عدل کے پہلوؤں پر ایک نئے علم کلام کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ اُسی زمانے میں پاکستان میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اقامتِ دین کے انقلابی تصورات پیش کر رہے تھے اور اُن کی تصنیفات عربی زبان میں منتقل ہونے لگی تھیں۔ سید قطب جو اہلِ یورپ اور اہلِ عرب کے بڑے مزاج آشنا تھے، اُنہوں نے اُن کے محاورے اور اسلوب میں اسلام کے جدید تصورات پیش کیے جو ذہنوں میں اُترتے چلے گئے۔ اُن کی کتابیں مصر کے علاوہ سعودی عرب، شام، کویت، قطر اور پاکستان میں بڑے شوق سے پڑھی جانے لگیں اور ذہنوں میں ایک صحت مند انقلاب کی اُمنگ پیدا کرنے لگیں۔ جمال عبدالناصر کے لیے سید قطب کا وجود ناقابلِ برداشت ہوتا گیا، چنانچہ حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کے الزام پر اُنہیں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ آمر کے زیرِ سایہ عدالت نے اُنہیں موت کی سزا سنائی اور وہ 1966ء میں پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ پورے عالمِ اسلام بالخصوص پاکستان میں دینی حس رکھنے والے طبقوں نے شدید ردِعمل ظاہر کیا۔ پوری اسلامی دنیا میں ایک ہی جیسے جذبات پائے جاتے اور اُن کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔ اُن کی شہادت کے بعد جمال عبدالناصر نے 1967ء کی چھ روزہ عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کو عربوں کے اسٹریٹیجک مقامات پر قبضہ کرنے اور عربوں کی فوجی طاقت تباہ کرنے کا موقع فراہم کیا جو مولانا ظفر احمد انصاری (مرحوم) کے تجزیے کے مطابق اُس کا دیرینہ منصوبہ تھا۔

☆☆☆

جمال عبدالناصر کے بعد انوار السادات کا دور آیا جو اخوان المسلمون کے لیے مزید صبر آزما ثابت ہوا کہ اُس نے اسرائیل کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے اور کیمپ ڈیوڈ میں اُس کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کر لیا تھا۔ اس حادثے پر اخوان کی قیادت نے غیر معمولی تحمل اور تدبر کا مظاہرہ کیا اور زمانۂ آزمائش میں وہ اپنے ارکان کی اخلاقی، فکری اور علمی نشوونما پر خصوصی توجہ دی۔ اب اخوانی بڑے پیمانے پر خدمتِ خلق کے منصوبے تشکیل دے رہے تھے اور عوام کو زندگی کی بنیادی ضرورتیں فراہم کر رہے تھے۔ فلاحی کاموں کی بنیاد پر زیرک اور بالغ نظر قائدین نے پارلیمانی انتخابات میں بھی حصہ لیا اور خاصی کامیابی بھی حاصل کی، مگر آزمائشوں سے دلبرداشتہ ہو کر اخوان المسلمون کے ایک مختصر گروہ نے ایمن الظواہری کی قیادت میں علیحدگی اختیار کر لی اور طاقت کے ذریعے حکومت پر قبضے کا خفیہ کام شروع کر دیا۔ اسی گروہ نے پریڈ گراؤنڈ میں انوار السادات کو قتل کر کے، حسنی مبارک کے طویل آمرانہ اور جابرانہ عہد کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔ بعد ازاں ایمن الظواہری القاعدہ کے آپریشنل کمانڈر بن گئے اور اُن کے زیرِ کمان مختلف ملکوں میں دہشت گردی کا خونیں نیٹ ورک قائم

ہوا۔ اس دوران اخوان المسلمون نے جناب البدیع کو اپنا مرشد عام چُن لیا جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے معاشرے میں اپنی جماعت کا وقار اور اعتماد بلند کیا اور اعتدال کو اپنی سیاست کا شعار بنائے رکھا۔ 2011ء میں حسنی مبارک کی فسطائیت کے خلاف اُٹھنے والی تحریک میں بڑی دانش مندی سے حصہ لیا۔ آمر سے گلوخلاصی کے بعد جب انتخابات کا مرحلہ آیا تو جسٹس پارٹی کے نام سے اخوان المسلمون میدان میں اُتری جبکہ ایک طرف ڈاکٹر ایمن الظواہری خونیں انقلاب کی دعوت دے رہے تھے، دوسری طرف سلفی ایک مضبوط مذہبی طاقت تھے جو شریعت کے بارے میں بڑے سخت گیر واقع ہوئے تھے، تیسری طرف حسنی مبارک کے پروردہ ابھی تک فوج، عدلیہ اور بیوروکریسی میں اہم عہدوں پر فائز تھے اور چوتھی طرف عوام کے اندر لبرل ازم کے نام پر نوجوانوں کی خاصی بڑی تعداد نفسانی لذتوں کی اسیر ہو چکی تھی۔ ان عوامل کے سبب صدر مرسی کو اقتدار تک پہنچنے میں سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ ایک ایسی سرزمین جس نے کبھی حقیقی جمہوریت کی شکل نہیں دیکھی تھی، اُس میں پہلی مرتبہ اخوان المسلمون کا اعلیٰ ترین منصب تک پہنچ جانا قیادت کی دانش اور دور بینی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

صدر مرسی 52 فی صد ووٹ لے کر کامیاب ہوئے، اُنہوں نے اپنی کابینہ میں پچاس فی صد وزراء اپوزیشن سے شامل کیے اور غیر ضروری محاذ آرائی سے مکمل اجتناب کرتے رہے، مگر وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کی حکومت نے شراب کی عام فروخت، سرِ عام بوس و کنار اور نائٹ کلبوں میں دھول دھپے پر پابندیاں لگائیں۔ اُنہوں نے اسرائیل کے ہاتھوں غزہ کا محاصرہ ختم کرانے کے لیے رفاعہ کا راستہ کھول دیا۔ وہ ایران سے بھی تعلقات استوار کرنا چاہتے تھے تاکہ مسلم اُمہ میں عرب اور عجم کی تقسیم بتدریج ختم کی جا سکے۔ اُنہیں ناکام کرنے کے لیے سماج دشمن عناصر فعال ہو گئے اور حکومت اشیائے روزمرہ کی قیمتوں پر مناسب کنٹرول نہ رکھ سکی۔ ذخیرہ اندوزوں نے گندم کی قلت بھی پیدا کر دی اور یوں عوام کے اندر اضطراب پیدا کیا گیا۔ صدر مرسی کا اصل جرم یہ تھا کہ وہ ''عرب بہار'' کو اسلام کی بہار میں تبدیل کر دینا چاہتے تھے جبکہ امریکا اس خوف کا شکار ہونے لگا کہ کہیں کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ منسوخ نہ ہو جائے۔ حسنی مبارک کا تیس سالہ دورِ ذلت برداشت کرنے والے سیکولر صدر مرسی کو اصلاحات کے لیے ایک ڈیڑھ سال سے زائد کی مہلت دینے کے لیے تیار نہ تھے، چنانچہ اُنہوں نے حکومت کی تبدیلی کے لیے التحریر اسکوائر کا رُخ کیا۔

☆☆☆

یہ ہجوم جو عوام کے حقوق کے نام پر جمع ہوا تھا، اُس کی اخلاقی گراوٹ کا یہ ماجرا سامنے آیا کہ احتجاج میں شامل سو خواتین کی آبروریزی کے واقعات رپورٹ ہوئے۔ ایک مصنوعی فضا پیدا کرنے کے بعد صدر مرسی کے ساتھ فوج نے وہی حربہ استعمال کیا جو 1952ء میں شاہ فاروق کے ساتھ کیا تھا۔ جنرل عبدالفتاح نے اڑتالیس گھنٹے کے الٹی میٹم کے بعد حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ یہ صاحب 75 سالہ کمانڈر ان چیف کو فارغ کرنے کے بعد تعینات کیے گئے تھے۔ جناب صدر مرسی کو معزول کرنے پر پورے مصر میں ہنگامے اُبل پڑے ہیں، اُن میں سیکولر طاقتیں حالات پر قابو نہیں پا سکیں گی اور جونہی انتخابات ہوں گے، اُن میں اخوان المسلمون پہلے سے بہتر ہوم ورک اور تیاری کے ساتھ کامیاب ہوں گی۔ مصر میں جمہوریت پر جو شبخون مارا گیا، اُس پر مغرب خاموش ہے جبکہ بعض عرب ملکوں نے اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ پاکستان میں

حکومت کی سطح پر کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا' تاہم دینی جماعتوں اور جرأت مند سیاسی حلقوں نے گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اسلامی دنیا میں بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر یہ اب وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ معتدل سیاسی اسلام ہی فروغ پائے گا اور دینی اور لادینی طاقتوں کے درمیان جو تصادم اس وقت مصر میں برپا ہے' اُس کے اثرات بنگلہ دیش' ترکی اور پاکستان پر بھی مرتب ہوں گے اور اس امر کا قوی امکان ہے کہ پاکستان کی سمت کا ازسرِنو تعین بہت جلد ہو جائے گا۔

پاکستان کی سمت کا واضح تعین قراردادِ مقاصد نے مارچ 1949ء ہی میں کر دیا تھا جس میں یہ غیر مبہم اعلان کیا گیا کہ اقتدار کے جائز حق دار صرف عوام کے چُنے ہوئے نمایندے ہوں گے۔ صدر اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خاں نے فوجی بغاوت کے ذریعے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا در کھول دیا اور وہ بنیاد منہدم کر ڈالی جس پر مغربی اور مشرقی بازوؤں کے منتخب نمایندوں نے ایک ساتھ رہنے کی عمارت اُٹھائی تھی۔ عام انتخابات جن کا انعقاد فروری 1959ء میں ہونا تھا' حالات میں بہت زیادہ بگاڑ کے بعد دسمبر 1970ء میں دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کرائے گئے جب مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان سیاسی طور پر ایک دوسرے سے خاصے کٹ چکے تھے اور ملک میں کوئی دستور نافذ العمل نہیں تھا۔ ون یونٹ کی تحلیل کے بعد مشرقی پاکستان کو مرکزی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوگئی تھی۔ جنرل آغا یحییٰ خاں کے جاری کردہ ایل ایف او کے مطابق دستور ساز اسمبلی کو 120 دنوں میں آئین منظور کرنا تھا' اس لیے سیاست دانوں کی اوّلین کوشش تھی کہ اجلاس شروع ہونے سے پہلے دستور کے بنیادی نکات پر قومی اتفاقِ رائے پیدا کرلیا جائے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کنفیڈریشن کی بات کر رہے تھے جو مغربی پاکستان کے بیشتر سیاسی زعماء اور فوجی قیادت کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی۔ تین مہینے سیاسی مذاکرات میں گزر گئے' مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آیا اور حالات کے بے قابو ہو جانے پر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے فوجی آپریشن کا حکم دیا جس پر مغربی پاکستان کے اکثریتی لیڈر جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کہا: ''اللہ کا شکر کہ پاکستان بچ گیا ہے'' مگر یہ ایک المیہ تھا جس میں انسانی جانیں ضائع ہوئیں' پاکستان کا امیج داغدار ہوا اور بھارت کو مشرقی پاکستان میں دخل اندازی کا موقع ہاتھ آگیا۔

☆☆☆

اندرا گاندھی اس دوقومی نظریے کو دفن کرنے کے لیے مدت سے منصوبہ بندی کر رہی تھی جس کی اساس پر پاکستان قائم ہوا تھا۔ آخر کار اُسے مشرقی پاکستان میں نقب لگانے اور حالات سے غیر مطمئن بنگالی نوجوانوں کو گوریلا تربیت دینے کا راستہ مل گیا۔ وہ مغربی ممالک میں جا کر اشکبار آنکھوں سے پاکستانی فوج کے مظالم کے دل دہلا دینے والے قصے بیان کرتی رہی۔ ہر جگہ یہ کہانی سنائی گئی کہ فوج نے بڑی تعداد میں یونیورسٹی کے پروفیسر' دانش ور اور اسکالر انتہائی بے دردی سے قتل کر ڈالے ہیں۔ وقت کی گرد بیٹھ جانے کے بعد اب خود بنگالی محققین یہ حقائق منظرِ عام پر لا رہے ہیں کہ دانش وروں کے اجتماعی قتل میں پاکستانی فوج کا کوئی ہاتھ تھا نہ عورتوں کی اجتماعی آبروریزی کے افسانے کوئی حقیقت رکھتے ہیں۔ ان کتابوں میں وہ دلدز واقعات بھی بڑے تفصیل سے بیان ہوئے ہیں جب مکتی باہنی انسانی بستیوں پر بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑی تھی اور بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کو جانوروں کی طرح ذبح کر ڈالا تھا۔

بھارت مشرقی پاکستان کی سیاست میں بہت پہلے سے دخیل چلا آرہا تھا اور اُن بنگالی عناصر کی پشت پناہی کر رہا تھا

جو بنگلہ زبان اور بنگلہ کلچر کی بنیاد پر بنگلہ قومیت کا پرچار کر رہے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن علامہ اقبال کے بجائے ٹیگور کو اپنا قومی ہیرو سمجھتے اور ایک منصوبے کے تحت مشرقی پاکستان میں پنجاب کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکاتے آئے تھے۔ اُن کا مشن مذہبی اور جمہوری قوتوں کو مشرقی پاکستان کی سیاست سے اپنی یوتھ فورس کے ذریعے بے دخل کر دینا تھا۔ اس کا پہلا مظاہرہ جنوری 1970ء میں اُس وقت ہوا جب جماعتِ اسلامی پلٹن میدان میں انتخابی جلسۂ عام منعقد کرنے چلی تھی جس کی کوریج کے لیے مغربی پاکستان سے چند صحافی ڈھاکے پہنچے جن میں محمد صلاح الدین (شہید)' مجیب الرحمٰن شامی' نصیر سلیمی اور راقم الحروف بھی شامل تھے۔ جلسہ شروع ہونے سے پہلے ہی عوامی لیگ کے لاٹھی بردار غنڈے اُس پر ٹوٹ پڑے اور جماعت اسلامی کے سینکڑوں کارکن خون میں نہا گئے۔ تب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو جانثاروں کے حصار میں ایک محفوظ مقام پر پہنچایا گیا تھا۔ پہلے عام انتخابات کے آغاز ہی میں یہ پیغام دیا گیا کہ عوامی لیگ کے سوا کسی اور جماعت کو عوام تک پہنچنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

☆☆☆

پورے مشرقی پاکستان میں پولنگ کے دن عوامی لیگ کے ''سیاسی رضا کاروں'' نے مخالف سیاسی جماعتوں کے ووٹروں کو پولنگ اسٹیشنوں کے قریب پھٹکنے ہی نہیں دیا۔ صرف نورالامین اور چٹا کانگ کے راجا اپنی بے پناہ مقبولیت کے باعث انتخابات جیت سکے' باقی تمام نشستیں عوامی لیگ نے غنڈہ گردی کے بل بوتے پر ہتھیا لیں جسے انتخابات میں کھل کھیلنے کی پوری آزادی تھی۔ ان ''فری فار آل'' انتخابات کی بنیاد پر شیخ مجیب الرحمٰن سیاسی اور فوجی قیادت سے اپنی شرائط پر پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ اُس کی اس روش کے نتیجے میں 25 مارچ کا فوجی آپریشن ہوا اور ہزاروں بنگالی فرار ہو کر بھارت چلے گئے جن کے لیے مختلف علاقوں میں تربیتی کیمپ پہلے ہی سے قائم تھے۔ مکتی باہنی اور بھارتی فوج مشرقی پاکستان پر حملہ آور ہوئیں۔ تب ہزاروں کی تعداد میں وطن کی محبت سے سرشار بنگالی اور غیر بنگالی نوجوان سروں پر کفن باندھ کر اپنی فوج کی مدد کے لیے نکلے اور جذبۂ شہادت سے سرشار آخری دم تک محاذ پر ڈٹے رہے۔ بدقسمتی سے ایک دنیا بھارت کی فوجوں کو مشرقی پاکستان میں داخل ہوتے اور اس پر قبضہ کرتے دیکھتی اور سیکیورٹی کونسل قیل و قال میں اُلجھی رہی۔ بیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا جب اقوامِ متحدہ کا ایک آزاد اور خود مختار رکن بھارت کی جارحیت سے دولخت ہوا۔ بھارتی جارحیت بین الاقوامی قانون کی رُو سے ایک ناقابلِ معافی جرم تھی جبکہ اپنے وطن کا دفاع کرنے والے سیاسی قائدین اور نوجوان اپنا قانونی حق استعمال کر رہے تھے۔ بنگلہ دیش کی تشکیل میں بھارتی وزیراعظم کے حقیقی کردار کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب شیخ مجیب الرحمٰن جنوری 1972ء میں پاکستان سے رہا ہو کر لندن پہنچے' تو اُنہوں نے سب سے پہلے بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کو شکریے کا ٹیلی فون کیا۔ ہمارے آئین 1973ء کی رُو سے مشرقی پاکستان، پاکستان کا حصہ تھا اور قومی اسمبلی میں اس کی نشستیں خالی رکھی گئی تھیں۔ پاکستان نے بنگلہ دیش کو اسلامی سربراہ کانفرنس کے موقع پر فروری 1974ء میں اس شرط پر تسلیم کیا تھا کہ جنگی جرائم کے نام پر مقدمات نہیں چلائے جائیں گے۔

چالیس برس گزر جانے کے بعد وطن کا دفاع کرنے والے سرفروشوں اور سیاست دانوں پر وزیراعظم حسینہ واجد جنگی

جرائم کے نام پر مقدمے چلا رہی ہے اور ایک ایسا ٹریبونل اُنہیں موت کی سزائیں سنا رہا ہے جس کی حیثیت عالمی برادری کی نظر میں غیر قانونی اور حد درجہ متنازع ہے۔ حال ہی میں جماعت اسلامی کے بیشتر قائدین کے علاوہ سابق امیر' بین الاقوامی سطح کے لیڈر اور اسکالر کو اُن کی نوے سال کی عمر میں نوے سال کی سزا سنائی گئی ہے جس پر پورے بنگلہ دیش میں ہنگامے زور پکڑتے جا رہے ہیں اور انتخابات جو دسمبر میں ہونے والے ہیں' اُن سے پہلے امن عامہ کا شدید بحران پیدا ہو سکتا ہے۔ پروفیسر غلام اعظم جو پاکستان کے عظیم ہیرو کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں' یقیناً فرشتے اُن کی پیشانی کو چوم رہے ہوں گے جنہوں نے پاکستان سے وفاداری کا عہد نبھایا اور اسلامی شناخت کا پرچم بلند رکھا۔ اس تاریخی پس منظر میں پاکستانی قیادت پر لازم آتا ہے کہ وہ اسلامی کانفرنس تنظیم کا اجلاس بلانے کا اہتمام کرے جس میں بنگلہ دیش کی انتقام پر تلی ہوئی حکومت سے تمام سزاؤں کے خاتمے اور ٹریبونل کو تحلیل کرنے کا متفقہ مطالبہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ عالمی عدالتِ انصاف کا دروازہ کھٹکھٹانے کا آپشن بھی موجود ہے۔ پاکستان کے دانش وروں' قلم کاروں' انسانی حقوق کے علمبرداروں اور دینی حس رکھنے والے نوجوانوں کو اپنے خون سے ایک محضر نامہ تیار کر کے اقوام متحدہ کے علاہ مسلمان سربراہوں اور عالمی تنظیموں تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ ایک پُرعزم رائے عامہ تیار کرنا ہوگی۔ یہ محض ایک یا دو جماعتوں کا قصہ نہیں بلکہ وطن سے محبت کرنے والے عشاق کے قافلۂ سخت جاں کی قانونی حیثیت کے حوالے سے ایک غیر معمولی نوعیت کا معاملہ ہے۔ یوں لگتا ہے کہ دینی اور لادینی قوتوں کے مابین جو معرکہ بنگلہ دیش میں بپا ہے' وہ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔

☆☆☆

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب پر ہمارے ہاں بہت کم تحقیقی کام ہوا ہے' اس لیے ہمارے حکمران وہ غلطیاں بار بار دہراتے رہتے ہیں جن کے بطن سے بنگلہ دیش نے جنم لیا تھا۔ اس حوالے سے ہماری سب سے بڑی ناکامی یہ تھی کہ ہم قومی یک جہتی کی ایک ٹھوس قومی پالیسی تشکیل نہ دے سکے۔ پورے ملک میں یکساں تعلیمی نصاب اور یکساں ذریعہ تعلیم نافذ کرنے میں ہماری اعلیٰ قیادتیں مجرمانہ غفلت سے کام لیتی رہیں جس کے باعث قومی زبان اُردو پر انگریزی غالب آ گئی ہے۔ اس کے علاوہ قومی وسائل کی منصفانہ تقسیم' یکساں ڈویلپمنٹ' وفاق میں صوبوں کی مؤثر نمایندگی' بیوروکریسی میں تقرریوں اور ترقیوں کا قواعد وضوابط اور میرٹ کے مطابق اہتمام' انسانی وسائل کی سائنٹیفک بنیادوں پر تربیت اور اُن کا صحیح استعمال اور عوامی مسائل حل کرنے کے خودکار انتظامات ملک میں اتحاد اور استحکام کے بنیادی لوازمات ہیں۔ ان سے بھی زیادہ اہم امن عامہ کا قیام ہے۔ مشرقی پاکستان کے تجربے نے اس ناگزیر حقیقت پر مہر ثبت کر دی ہے کہ فوجی حکومتیں اور فسطائی نظامِ حکومت معاشرے اور اداروں کی تباہی کے اصل ذمے دار ہیں' مگر ہماری بدقسمتی یہ رہی کہ سانحہ مشرقی پاکستان کے نتیجے میں جناب ذوالفقار علی بھٹو پہلے سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے اور بعد میں صدر اور وزیراعظم بنے۔ اُنہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے بڑے بڑے کام کیے۔ بھارت کے ساتھ شملہ معاہدہ کیا' قوم کو ایک متفقہ دستور دیا' ایٹمی طاقت کے حصول کی خاطر انفراسٹرکچر تعمیر کیا' اسلامی ملکوں میں اتحاد پیدا کرنے کی خاطر لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس کے انتظامات کیے۔ ان عظیم کامیابیوں کے مقابلے میں وہ سیاسی جماعتوں کو ساتھ

لے کر چلنے کے بجائے اُن سے ٹکراتے اور ایمرجنسی کے ذریعے اختلاف کی آواز دباتے اور ایک آمرانہ روش پر چلتے رہے جس نے بڑے بڑے بحران پیدا کیے۔ اُن کے اثرات آج کی نسل تک پہنچتے پہنچتے انتہائی ہیبت ناک شکل اختیار کر چکے ہیں۔

جمہوری ارتقا اور قومی یک جہتی پر بھٹو دورِ حکومت میں دو سخت جاں لیوا حملے ہوئے۔ 1970ء کے انتخابات میں بلوچستان اور صوبہ سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی نے حکومت بنائی جس میں بلوچ' پشتون' سندھی اور پنجابی شامل تھے اور خاں عبدالولی خاں اُس کی قیادت کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب مزاجاً پیپلز پارٹی کے سوا کسی اور جماعت کو اقتدار میں دیکھ نہیں سکتے تھے' چنانچہ سردار عطاء اللہ مینگل کی حکومت برطرف کر ڈالی جس کے ساتھ اظہارِ یک جہتی کرتے ہوئے صوبہ سرحد میں جناب مفتی محمود کی حکومت مستعفی ہوگئی۔ اُن دونوں صوبوں میں پیپلز پارٹی کی حکومتیں قائم کرنے کی خاطر وزیراعظم کو بڑے پاپڑ بیلنے اور غیر جمہوری ہتھکنڈے استعمال کرنا پڑے۔ نیپ کی حکومتوں کے خاتمے کے دو سال بعد سیاسی جماعت بھی غیر قانونی قرار دے دی گئی۔ پشتون اور بلوچ راہنماؤں پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر کے حیدرآباد جیل میں اُن کے لیے ایک ٹریبونل تشکیل دیا گیا۔ اِن اقدامات کے نتیجے میں نیپ کئی دھڑوں میں تقسیم ہوگئی' اور وہ سیاسی جماعت جو سرحد اور بلوچستان کے صوبوں کو متحد رکھ سکتی تھی' اُس کا شیرازہ بکھر گیا۔ آج یہ اُسی سیاسی مہم جوئی کا شاخسانہ ہے کہ بلوچ اور پشتون ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہیں جس کے سبب قومی یک جہتی کی فصیل میں بہت بڑا شگاف پڑ گیا ہے اور آج ہم اس کے خوفناک نتائج بھگت رہے ہیں۔

☆☆☆

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ایک بڑا سبب فوجی آپریشن تھا۔ بھٹو صاحب نے سبق سیکھنے کے بجائے بلوچستان میں فوجی آپریشن کر ڈالا جو چار سال تک جاری رہا۔ مینگل حکومت کی برطرفی کے ردِعمل میں بلوچ نوجوان پہاڑوں پر چلے گئے اور اُن سے لڑنے کے لیے حکومت کو ووڈویژن فوج ڈیپلائے کرنا پڑی۔ بعض غیر ملکی مصنفین نے پیشین گوئی کر ڈالی کہ بلوچستان کی علیحدگی کا عمل اکیسویں صدی سے پہلے مکمل ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آج تک بلوچستان صحیح وسالم ہے' البتہ زخم زخم ہے۔ مسٹر بھٹو نے 1973ء کے آئین میں فوجی بغاوت کے خطرے کا مستقل حل تلاش کرنے کے لیے آرٹیکل 6 شامل کیا' مگر اُن کی ہوسِ اقتدار نے ملک میں ایسے حالات پیدا کیے جو فوجی بغاوت پر منتج ہوئے۔ وہ 1977ء کے انتخابات میں بلامقابلہ منتخب ہونے کے علاوہ دو تہائی اکثریت بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے بڑے پیمانے پر دھاندلی کے سرکاری انتظامات کیے گئے۔ متحدہ اپوزیشن نے انتخابی نتائج قبول کرنے سے انکار کر دیا اور احتجاجی تحریک چار ماہ اس قوت سے چلی کہ حکومتی مشینری مفلوج ہو کے رہ گئی اور جنرل ضیاء الحق کو مارشل لا لگانا پڑا۔ اُنہوں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد حیدرآباد ٹریبونل تحلیل اور فوجی آپریشن ختم کر دیا' مگر جو زخم لگ چکے تھے' وہ آج بھی رس رہے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے پورے دور پر جہادِ افغانستان حاوی رہا اور سندھ میں کچھ وقت کے لیے شورش بپا رہی اور قومی یک جہتی کے سنگین مسائل پیدا ہوئے۔ پاکستان میں پہلی بار کلاشنکوف کلچر کو فروغ ملا جس نے امن وامان کے لیے بہت بڑا چیلنج پیدا کر دیا جس کا آج ہمیں کراچی کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بھی سامنا ہے۔

اسی عہد میں فرقہ واریت کو پنپنے کا بہت موقع ملا۔ جنرل ضیاء الحق اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اسلام کی حقیقی برکات عوام تک نہ پہنچا سکے' البتہ شیعہ سنی مسئلہ بڑی نازک شکل اختیار کر گیا اور سپاہ صحابہؓ سپاہ محمدؐ اور لشکرِ جھنگوی کے نام سے مسلح تنظیمیں وجود میں آئیں جو اب پورے ملک میں پھیل چکی ہیں۔ جنرل مشرف کے زمانے میں تحریک طالبان پاکستان میں ایک عذاب کی صورت نازل ہوئی۔ اب ان تمام عسا کر نے ملک میں دہشت اور بدامنی پھیلا رکھی ہے اور فرقہ واریت کے زہریلے اثرات پھیل رہے ہیں۔ فوج دہشت گردوں اور علیحدگی پسندوں کے آگے چٹان کی طرح کھڑی ہے اور اس کے افسر اور جوان جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں جبکہ چالیس ہزار سے زائد عوام لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ ہماری قوم بڑی سخت جاں اور بڑی باشعور ہے۔ اُس نے مئی 2013ء کے انتخابات میں جس ہوشمندی اور عملی فراست کا مظاہرہ کیا ہے' اُس سے اُمیدوں کے چراغ جل اُٹھے ہیں۔ بلاشبہ ہم اس وقت مہیب خطرات اور عظیم امکانات کے درمیان سفر کر رہے ہیں۔ خطرات ایسے کہ اُن کی گیرائی میں جاتے ہوئے دل بیٹھنے لگتا ہے اور امکانات کا تصور کچھ ایسا کہ خود کو پہچان لینے کو جی چاہتا ہے۔ خود کو پہچان لینے ہی سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے جو زمین و آسمان کے لامحدود خزانوں کا مالک ہے اور اُس کا کن فیکون کا تخلیقی عمل جاری ہے۔

☆☆☆

ہم نے حسن البنا شہید' سید قطب شہید اور پروفیسر غلام اعظم کے عظیم الشان کارناموں اور مصر اور بنگلہ دیش کے واقعات اور پاکستان کے چند حکمرانوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تفصیلی ذکر اس لیے کیا ہے کہ ہم اپنے شاندار ماضی کے رشتوں اور آج کے مہیب خطرات کی جڑوں تک پہنچ سکیں اور قوم کی قابلِ رشک خوبیوں اور توانائیوں کا ہمیں صحیح ادراک حاصل ہو جائے جن کو بروئے کار لا کر امکانات کا ایک نیا جہاں آباد کیا جا سکتا ہے۔ حالیہ انتخابات کے بعد نئی حکومتیں قائم ہوئی ہیں جن پر عوامی مسائل کی یلغار میں ہر لمحہ اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ اُنہیں ترجیحات کے تعین میں غیر معمولی بصیرت اور عملی فراست سے کام لینا ہوگا۔ بڑے بڑے مسائل اب کسی سے ڈھکے چھپے نہیں' مگر یہ فیصلہ کرنا غالباً جوئے شیر لانے کے مترادف ہے کہ آغاز کہاں سے کیا جائے۔ ہماری نظر میں بنیادی اہمیت اپنے گھر کی درستگی اور اپنے عوام کے لیے فوری ریلیف پر دی جائے۔ دہشت گردی' توانائی' اقتصادی زبوں حالی کے مسائل بلاشبہ فوری توجہ کے مستحق ہیں' مگر اصل ضرورت عوام کا اعتماد قائم رکھنے کی ہے۔ ہمیں نئے اور پرانے حکمرانوں کے عوام کے مینڈیٹ کی کیفیت کا بغور جائزہ لیتے رہنا ہوگا کہ وہ حالات کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک جماعت نے انتخابات میں بہت ووٹ لیے' مگر اُس کی مایوس کن کارکردگی سے عوامی مینڈیٹ میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ اس اعتبار سے عوام کے مسائل اوّلین ترجیحات میں شمار ہوتے ہیں۔ بلاشبہ تازہ دم وزراء اداروں کی حالت بہتر بنانے میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں اور ہمارے وزیراعظم بڑی سنجیدگی سے وہ ہولناک خلا پُر کرنے کے لیے سرگرداں ہیں جو پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت نے ہر شعبے میں پیدا کر دیا تھا۔ وہ اس خطے کی تقدیر بدل دینے کے لیے شب و روز سوچ بچار بھی کر رہے اور تیز تیز قدم بھی اُٹھا رہے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی حکومت کے ابتدائی ایام ہی میں چین کے ساتھ ایسے معاہدے کیے ہیں جو توانائی کا مسئلہ حل کرنے میں بھی سودمند ثابت ہوں گے اور ایک زبردست معاشی انقلاب کے راستے بھی ہموار کریں

گے۔ یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ حکومت ملکی معاملات میں گہری دلچسپی لے رہی ہے اور کچھ کر گزرنا چاہتی ہے۔

کچھ کر گزرنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ عوام کی بلبلاہٹ کا سبب کیا ہے۔ فوری سبب تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ بجٹ کے آتے ہی اشیائے روزمرہ کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ اُن کی خریداری غریب لوگوں کے لیے ناممکن اور متوسط طبقے کے لیے مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ وزیرخزانہ کہتے ہیں کہ ہم نے عوام پر کوئی اضافی ٹیکس نہیں لگایا' مگر اُنہیں مہنگائی' بیروزگاری اور بجلی کی لوڈشیڈنگ پر آنکھیں بند نہیں کر لینی چاہئیں۔ اُنہیں اس بنیادی سوال کا جواب آسان لفظوں میں دینا ہوگا کہ اُنہوں نے ڈائریکٹ ٹیکس لگانے کے بجائے اِن ڈائریکٹ ٹیکسوں پر کیوں انحصار کیا ہے۔ اِن ڈائریکٹ ٹیکسوں کا بوجھ تو عام آدمی ہی اُٹھاتا ہے۔ بڑے تاجروں' صنعت کاروں اور اسٹاک ایکسچینج میں ہونے والے کاروبار پر ٹیکس لگانے سے شاید اس لیے گریز کیا جا رہا ہے کہ وہ مسلم لیگ نون کا بنیادی حلقہ ہے۔ اُن کی یہ حکمتِ عملی پوری حکومت کے لیے شدید مسائل پیدا کر سکتی ہے اور اس کے عوامی مینڈیٹ کا تیزی سے کٹاؤ شروع ہو سکتا ہے۔ مصر کے صدر مرسی کے خلاف جو ایک طوفان اُٹھا' اُس کا اشیائے صرف کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ ہی محرک بنا تھا۔ اب اگر صوبائی حکومتیں پرائس کنٹرول نہیں کر پا رہیں' تو اس کی ذمے داری بھی تو منصوبہ سازوں ہی پر عائد ہوتی ہے اور اس کی طرف سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

☆☆☆

صبر و ضبط سے کام لینے کا وعظ بے اثر ہوتا جا رہا ہے۔ لوڈشیڈنگ کے بارے میں مختلف وزرائے کرام کی طرف سے جو بیانات آ رہے ہیں' اُن کا زمینی حقائق منہ چڑا رہے ہیں اور عام لوگوں میں اشتعال پیدا کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں جناب وزیراعظم کو فوری طور پر ایک ایسا اجلاس بلانا چاہیے جس میں قیمتوں کو معمول پر رکھنے اور لوڈشیڈنگ میں کمی لانے کا ایک ٹھوس لائحہ عمل فوری طور پر ترتیب دیا جائے اور اس پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے ایک مؤثر مانیٹرنگ سسٹم فوری طور پر وجود میں آ جائے۔ اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ سرکلر ڈیٹ کے 480 ارب ادا کرنے کے باوجود بجلی کی لوڈشیڈنگ میں کمی کے بجائے اضافہ کیوں ہو گیا ہے۔ ہماری نظر میں یہی مسئلہ نمبر ایک ہے اور اس کے مناسب حل ہی پر حکومتوں کے استحکام کا انحصار ہوگا۔

دوسرا بڑا مسئلہ اپنا گھر درست رکھنے کا ہے جس کے بغیر پاکستان علاقائی کردار ادا کر سکتا ہے نہ عالمی سطح پر اپنا کوئی دیرپا نقش ثبت کر سکتا ہے۔ اپنا گھر درست رکھنے کے ایک سے زیادہ تقاضے ہیں۔ پہلا تقاضا یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قومی معاملات اور انتظامی امور کی باگ ڈور ہے' اُن کی صلاحیت اور نیک نیتی پر عوام کو اعتماد ہو اور فیصلے شفاف طریقے سے کیے جائیں۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ وفاقی حکومت اہم اور کلیدی منصب داروں کے ردوبدل میں کسی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کر رہی۔ بیشتر صوبائی گورنر پرانے چلے آ رہے ہیں۔ پنجاب کے گورنر استعفیٰ دے کر جا بھی چکے ہیں اور اُن کی جگہ جن صاحب کا نام اخبارات میں آ رہا ہے' اُس نے سیاسی اور عوامی حلقوں میں چہ مگوئیوں کی حوصلہ افزائی کی ہے اور نئے نئے سوالات اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اگرچہ چودھری محمد سرور پاکستان کے لیے بیش قیمت سرمایہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ سفارت کاروں میں

تبدیلی کا عمل بھی سست روی کا شکار نظر آتا ہے۔ پی آئی اے کے جو قائم مقام چیئرمین تعینات کیے گئے' اُن کے بارے میں بہت سارے افسانے گردش کر رہے ہیں۔ پولیس کے انتہائی دیانت دار' فرض شناس اور عقابی نگاہ رکھنے والے اعلیٰ افسر جناب ذوالفقار چیمہ جو بگڑے ہوئے اداروں کی درستگی میں انقلابی کردار ادا کر سکتے ہیں' اُنہیں سائیڈ لائن کر دیا گیا ہے۔ اخبارات میں اچھی شہرت کے حامل اعلیٰ افسروں کی فہرستیں شائع ہو رہی ہیں جو نظر انداز کیے جا رہے ہیں۔ اس سے گھر درست کرنے کا تاثر نہیں ملتا۔ سول ایوی ایشن کے مشیر میجر جنرل (ر) شجاعت عظیم کا تقرر بھی قومی حلقوں میں گفتگو کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں جناب وزیراعظم ان معاملات پر خصوصی توجہ دیں گے۔

☆☆☆

گھر درست رکھنے کے لیے ہر سطح پر گڈ گورننس کا اہتمام ضروری ہے جسے پچھلی حکومتوں نے تو شخصی اور گروہی مفادات پر قربان کر دیا تھا' مگر نئی حکومت کو اس بارے میں اچھی مثالیں قائم کرنا ہوں گی۔ اچھی حکمرانی کے لیے اختیارات کی تقسیم' ذمے داری کا واضح تعین اور ہر فیصلے میں شفافیت ناگزیر ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے حکومتی اور سیاسی کلچر میں اختیارات فردِ واحد ہی میں مرتکز رہتے ہیں اور وزیروں اور سول افسروں کو اپنا ذہن استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ہونا یہ چاہیے کہ ایک وزیر اپنی وزارت کا ذمے دار ہو' اُسے فیصلے کی آزادی ہو اور کابینہ اُس کی کارکردگی کا جائزہ لیتی اور گائیڈ لائن فراہم کرتی رہے' مگر عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی وزیر' وزیراعظم یا وزیراعلیٰ کے محبوب نظر ہے' تو اُس کا دائرۂ اختیار بڑھتا چلا جائے گا جبکہ دوسرے وزراء اشارۂ ابرو کا انتظار ہی کرتے رہیں گے۔ اس نوع کی اطلاعات ملتی رہتی ہیں کہ خیبر پختونخواہ کے بیشتر وزراء جناب عمران خاں کی اسلام آباد میں اقامت گاہ کے چکر لگاتے اور اُن سے احکام لیتے ہیں جبکہ وزیراعلیٰ پرویز خٹک ہیں۔ اب یہ خبر بھی آئی ہے کہ اسمبلی کے اسپیکر وزارت کے اختیارات استعمال کر رہے ہیں۔ پنجاب کی صورتِ حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ حضرت وزیراعلیٰ نے سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھا ہے اور اب تو بعض وفاقی وزارتوں کی بھی ذمے داریاں اُٹھائے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں گڈ گورننس کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا اور فقط چہیتوں کی حکومت قائم رہے گی۔ اچھی حکمرانی میں مقامی حکومتیں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہیں' اس لیے صوبوں کو بلدیاتی انتخابات کرانے میں اب لیت ولعل سے کام نہیں لینا چاہیے' تاہم ماضی میں اُنہوں نے پانچ سال انتخابات کے بغیر ہی گزار دیے جن سے عوام کی مشکلات میں بہت اضافہ ہوا۔ اب اسی لیے عدالتِ عظمیٰ ستمبر میں بلدیاتی انتخابات کرا دینا چاہتی ہے جبکہ صوبوں کی طرف سے کچھ مہلت دینے کی استدعا کی جا رہی ہے۔ ہماری گزارش ہے کہ زمینی حقائق کی روشنی میں دو چار مہینے دے دینے چاہئیں۔ یوں مناسب قانون سازی کے لیے وقت مل جائے گا۔ اب سیاسی جماعتوں کی بنیاد پر انتخابات کرانے اور مقامی حکومتوں کو بااختیار بنانے کی سنجیدہ کوشش ہونی چاہیے۔

ہمارا گھر درست ہوگا' تو علاقائی اور عالمی سطح پر ہماری بات غور اور بردباری سے سنی جائے گی۔ ہمارے گھر کو سلامتی کا مسئلہ درپیش ہے اور توانائی بحران کا بھی اور سب سے زیادہ لامحدود کرپشن کا سرطان ہمارے وجود کو اندر سے کھوکھلا کرتا چلا

جا رہا ہے۔ اس نے ہماری معیشت کا خون چوس لیا ہے اور ہمیں عالمی برادری میں بھکاری بنا دیا ہے۔ ہم ان مسائل کے حوالے سے چند تجاویز پیش کرتے ہیں:

1۔ قومی احتساب کا نیا بل فوری طور پر منظور کر کے نیب کے چیئرمین کی تقرری کے لیے اپوزیشن لیڈر کے ساتھ بامعنی مشاورت میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی جائے۔

2۔ بجلی پیدا کرنے اور بجلی تقسیم کرنے والے اداروں میں فوری طور پر نئے بورڈ آف ڈائریکٹرز تشکیل دیے جائیں اور مقامی سطح پر اچھی شہرت اور مسلمہ قابلیت کے افراد سربراہ مقرر کیے جائیں۔ بجلی چوروں کو جن میں سرکاری افسران بھی ملوث ہیں' عبرت ناک سزائیں دی جائیں۔ اس کے علاوہ توانائی کا بحران ختم کرنے کے لیے پاکستان کے انجینئروں اور سائنس دانوں کو کلیدی رول سونپا جائے۔

3۔ چین کو چھوٹے چھوٹے راجباہوں' نہروں اور دریاؤں پر آبشاروں کے ذریعے بجلی پیدا کرنے کا جو عظیم تجربہ حاصل ہے' اُس سے فائدہ اُٹھانے کی سبیل نکالی جائے۔ اس طرح بجلی کی پیداواری لاگت کم ہوگی اور ہم اپنے آبی وسائل کو بہتر طور پر استعمال بھی کر سکیں گے جو ضائع ہو رہے ہیں۔

4۔ ایبٹ آباد کمیشن نے ہمارے سول اور فوجی اداروں میں قومی سلامتی کے حوالے سے جن ہولناک خامیوں کی نشان دہی کی ہے' اُنہیں درست کرنے پر بھرپور توجہ دی جائے۔

5۔ قومی سلامتی پالیسی کی تشکیل میں اِن تجربات سے فائدہ اُٹھایا جائے جو دوسرے ملکوں میں انتہائی کامیابی سے کیے جا چکے ہیں اور اُن کے ہاں قومی سلامتی پوری طرح محفوظ ہو گئی ہے۔

6۔ نئی حکومتوں کو میڈیا میں اُٹھائے جانے والے معاملات' مسائل اور تجاویز پر کامل توجہ دینی چاہیے کہ اُن کے ذریعے وہ اپنی کارکردگی بھی بہتر بنا سکتی ہیں اور غلط تاثرات کو پھیلنے سے بھی بروقت روک سکتی ہیں۔

7۔ غریبوں اور امیروں کے درمیان جو خلیج وسیع ہوتی جا رہی ہے' اُسے پاٹنے کے لیے ہر سطح پر سادگی' کفایت شعاری اور خود انحصاری اپنانا ہوگی اور سرکاری ہسپتالوں' اسکولوں اور کالجوں کا معیار بلند کرنے پر مسلسل توجہ دینا ہوگی۔

8۔ دہشت گردوں کے ساتھ آہنی ہاتھ سے نمٹنا' فوج کی قربانیوں کا اعتراف کرنا اور اُس کی صلاحیتِ کار میں اضافہ کرنا ہوگا۔

9۔ انسانی وسائل کو سائنٹیفک طور پر ترقی دینے کے لیے تعلیم پر بھاری سرمایہ کاری کرنا ہوگی اور سوشل سائنسز کو فروغ دینا ہوگا۔ جدت کے لیے سازگار فضا پیدا کرنے کے لیے ذہین افراد کی حوصلہ افزائی کرنا ہوگی۔ اسی طرح قومی تعلیمی نصاب کمیشن وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے تاکہ قوم کا وجود مستحکم ہوتا جائے۔

10۔ بجلی اور گیس کی فراہمی کے معاہدے مختلف ممالک سے کیے جا رہے ہیں اور گوادر سے کاشغر تک اقتصادی کاریڈار تعمیر کرنے کے انقلابی منصوبوں کی نوید سنائی جا رہی ہے' اُن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک سازگار فضا اور زبردست افرادی قوت اور ہنرمندوں کا ایک پول تیار کرنا ہوگا۔ اس کے لیے امن عامہ کا قیام اور سیاسی جماعتوں کا تعاون ازبس ضروری ہوگا۔

پاکستان

کی طرح دنیا بھر میں کاروبار کو مخصوص خاندانی ہی چلاتے ہیں۔ یہ خاندان صرف چھوٹے یا درمیانی حجم کے کاروبار ہی نہیں چلاتے بلکہ ان خاندانوں نے دنیا کے بڑے بڑے کاروبار بھی کامیابی کے ساتھ چلاتے ہیں۔ ڈیوپونٹ (DuPont) جیسے ایک کاروباری ادارے کا انتظام ایک خاندان کے افراد نے ایک سو ستر برس بخوبی سنبھالے رکھا حتیٰ کہ 1970ء میں پیشہ وارانہ مہارت رکھنے والے منتظمین نے اس کا انصرام تھام لیا۔

پاکستان میں کاروبار کرنے والے خاندان میرے نزدیک مجسم رحمت ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے لوگ برسرروزگار ہوتے ہیں۔ مزید برآں پاکستان کے موجودہ حالات میں کاروبار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور کاروباری خاندان جو ان نامساعد حالات میں کاروبار کر رہے ہیں وہ اپنی حب الوطنی کا ثبوت اپنے عملی اقدامات سے دے رہے ہیں۔ آج کی نشست میں ہم ان چند تجاویز کا ذکر کریں گے جن پر عمل کر کے پاکستان کے کاروباری اداروں کی پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ ہونے کا قوی امکان ہے۔

عاطف طفیل

دل پر پتھر رکھ کے کہنا پڑتا ہے کہ بالعموم ہماری سیٹھ کمپنیوں میں خوف کی حکمرانی ہے۔ سیٹھ صاحب کے قرب و جوار میں ہمہ وقت ڈر کا ہالہ موجود رہتا ہے۔ خوف تخلیقی صلاحیتوں کو یوں کھا جاتا ہے جیسے دیمک لکڑی کو نگل جاتی ہے۔ خوف کے ماحول میں اپنی آزادانہ رائے کا اظہار شجر ممنوعہ قرار پاتا ہے اور جی حضوری سکہ رائج الوقت بن جاتا ہے۔ جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ کاروباری ادارے اُس ڈائیلاگ سے پروان چڑھتے ہیں جو بغیر کسی نفسیاتی عدم تحفظ کے جاری و ساری رہتا ہے۔ خوف سے نفسیاتی عدم تحفظ پیدا ہوتا ہے۔ خوف جو انڈے بچے دیتا ہے وہ خوف کے مانند ہی بدصورت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر خوف سے مفید معلومات کا تبادلہ رک سا جاتا ہے اور ان معلومات کا بے تکلف تبادلہ کسی بھی کاروباری ادارے کی صحت کا ضامن ہوتا ہے۔ سیٹھ صاحب جب متعدد مرتبہ غیر شعوری طور پر یہ فقرہ ادا کرتے ہوئے سنیں گئے ہیں کہ "میں چاہتا ہوں سب مجھے سچ بتائیں، چاہے اس کھرے سچ کے نتیجے میں انھیں اپنی نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔" آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ان "سازگار حالات" میں کوئی کیونکر بولنے کی حماقت کرے گا۔

خوفناک ماحول میں کام کرنے کے ضمنی اثرات یہ بھی ہوتے ہیں کہ ہر ملازم مفاد عاجلہ کو دیکھتا ہے اور اسے ہر لحظہ اپنی نوکری بچانے کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ خوف سے بھرپور ماحول میں کام کرنے والے اپنی غلطیوں کو چھپاتے ہیں اور پھر جب عمداً ان قالین کے نیچے چھپی ہوئی غلطیوں کا کوہ ہمالیہ بنتا ہے تو پوری کمپنی زمین بوس ہو جاتی ہے۔ کمپنی میں کام کرنے والے لوگ صرف اسی صورت میں غلطیاں مانیں گے جب کہ کمپنی کے مالکان برملا اپنی خطاؤں کا اعتراف کریں گے۔" داغ

نہیں تو سیکھنا نہیں" میں بڑی حکمت ہے اور انسان خطا کا پُتلا ہے اور CEOs بھی خطاؤں سے مبرّا نہیں ہیں۔

ہماری سیٹھ کمپنیوں میں لوگوں کو عموماً شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور یہ مفروضہ کہ "لوگ کام چور ہیں" کاروباری دینیات کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔ نفسیات سے پتا چلتا ہے کہ لوگ ان توقعات کے مطابق ڈھل جاتے ہیں جو اُن سے باندھی جاتی ہیں۔ جب ہم کسی محنت کش کو چور سمجھیں گے تو پھر وہ حقیقت میں کام چور بن جائے گا۔ اس کے برعکس اگر ہم یہ تصور رکھیں گے کہ لوگ جانفشانی سے کام کرنا چاہتے ہیں اور تھوڑی سی حوصلہ افزائی سے اُن کا سیر بھر خون سوا سیر ہو جاتا ہے اور شاباش سے بونے بھی جن بن جاتے ہیں تو پھر ہم ان پر اعتماد کریں گے تاکہ ان کی مخفی صلاحتیں بیدار ہوں۔

ہمارے پاکستانی کاروباری اداروں میں اکثر و بیشتر ماضی پرستی چھائی رہتی ہے۔ ہم یہاں یادداشت کے بل بوتے پر اپنے ادارے چلاتے ہیں۔ وہ حکمت عملی جو گزرے ہوئے کل میں کامیابی لے کر آئی تھی اس سے ہم آنے والے کل میں بھی کامیابی کی نوید کشید نا چاہتے ہیں۔ حالانکہ کامیابی مسلسل تفکر کا ثمر ہوتی ہے۔ کاروباری اداروں میں سوچنے سے درج ذیل فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

1۔ ہم اپنی جبلتوں کے غلام نہیں بنتے ہیں۔ 2۔ ہم ردِعمل کا شکار نہیں ہوتے ہیں۔ 3۔ ہم پامال راستوں کی آبیاری سے اجتناب کرتے ہیں۔ 4۔ ہم حکم کی تعمیل اندھے پن سے نہیں کرتے ہیں۔ 5۔ ہم وقتی جذبات کی رو میں بہنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

سیٹھ کمپنیوں میں خوشامد کی وبا بھی عام ہے کیونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ترقی کارکردگی کی بنیاد پر کم اور چاپلوسی کی بدولت زیادہ جلد ملتی ہے۔ ہر انسان اپنی تعریف سننا پسند کرتا ہے اور اختلاف رائے کو ناپسند کرتا ہے۔ برادران یوسف نے ترقی کا یہ بھید پا لیا ہے۔ اس لیے وہ سیٹھ صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور ترقی کی سیڑھیاں چڑھتے جاتے ہیں۔ جھکنے والے رفعتیں پا لیتے ہیں اور خودی کو بلند کرنے والے کسمپرسی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ویسے بھی "سب اچھا ہے" کی صدا کانوں میں رس گھول دیتی ہے جب کہ خرابیوں کی نشاندہی کرنے والے خوامخواہ دشمن پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ ہماری سیٹھ کمپنیاں مزید ترقی کر سکتی ہے کہ اگر ان کے سیٹھ صاحبان فیصلے کرتے وقت کمپنی کی اجتماعی دانش کو بروئے کار لے کر آئیں۔ فیصلے اگر صرف بغل میں بیٹھے ہوئے گھاگ مشیروں کے مشوروں کے مطابق ہوں گے تو مشیروں کا تو یقیناً بھلا ہو گا، لیکن ادارے کے لیے دوررس نتائج بہتر نہیں نکلیں گے۔

منیجمنٹ کی پوزیشنز پر ریکروٹمنٹ کرنے کے لیے یہ پیش نظر رہے کہ ان امیدواروں کو نظر انداز کر دیا جائے جو سب کو خوش رکھنا چاہتے ہیں یا پھر جنھیں کسی کی خوشی ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے۔ جو منیجر دو سال کے عرصے میں اپنا جانشین تیار نہیں کرتا وہ کرسی کا دیوانہ ہے اور کرسی کے دیوانے اداروں کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ ادارے لوگوں سے بنتے ہیں اور جب لوگوں کو مشین کے پرزوں کے مانند ناکردہ گناہوں کے سبب فارغ کر دیا جائے تو پھر کمپنیاں نہیں بنتیں بلکہ دروازے بن جاتی ہیں جہاں سے آنا جانا لگا رہتا ہے۔

کمپنیوں کو باغ بنانے کے لیے باغبانوں جیسے منیجرز کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنے خون جگر سے کمپنی کی کیاریوں کو سنوارتے ہیں۔ وہ منیجرز جو جادو کی چھڑی گھما کر آن واحد میں سب کچھ ٹھیک کر دینے کے دعوے کرتے ہیں وہ صرف اپنی جیب گرم کرنے آتے ہیں اور اپنی جیب گرم کر کے کسی اور کمپنی کا رخ کر لیتے ہیں جہاں پر وہ اپنی نام نہاد معجزانہ شخصیت کے کرشمے دکھا سکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں معجزے دکھانے والے منیجرز سے محفوظ رکھے۔ آمین

اسلامی زندگی کی کہکشاں

ہے دعا یاد مگر حرف دعا یاد نہیں

دُعا پر اعتماد زندگی آسان کرتا ہے مگر یہ جاننا بہر حال ضروری ہے کہ دُعا کے لیے لفظ ضروری ہیں یا حاضری اور عاجزی

ایک ایسی کیفیت کا بیان جس کی سب کو تلاش رہتی ہے

جلال الدین رومیؒ کے مزار کی عمارت کے **مولانا** صدر دروازے پر ایک فارسی رباعی تحریر ہے جس کا اردو ترجمہ کچھ یوں ہے:

رخسانہ بشیر

باز آ، باز آ، ہر آنچہ ہستی باز آ
گرچہ کافر و گبر و بُت پرستی، باز آ
ایں درگہِ ماہ درگہ کو میدی نیست
صد بار اگر کو بہ شکستی باز آ

(واپس آ جا، واپس آ جا، تُو جو کوئی بھی ہے واپس آ جا..... اگر تُو کافر اور مشرک اور بت پرست بھی ہے تو واپس آ جا..... ہماری یہ درگاہ نا اُمیدی کی درگاہ نہیں..... اگر تُو سو بار بھی توبہ توڑ چکا ہے پھر بھی واپس آ جا)

دعا کے لیے لفظ ضروری نہیں۔ حاضری اور عاجزی ضروری ہے۔ گناہوں پر شرمساری ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ (حشر کے دن) فرمائے گا۔ "اس شخص کو جس نے ایک دن بھی میرا ذکر کیا ہو یا میرا خوف رکھا ہو دوزخ کی آگ سے نکال دو۔" (الترمذی)

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے ایک بار پوچھا ''اے اللہ پاک! تجھے میرا کون سا عمل بہت پسند ہے؟''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جب بچپن میں تیری ماں تجھے مارا کرتی تھی لیکن تُو پھر بھی اس کی آغوش میں پناہ لیا کرتا تھا۔ بھاگ کر اس کی طرف جاتا تھا۔''

قارئین کرام! کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اللہ تعالیٰ تو ایک ماں سے ستر گنا زیادہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ جب اس کی طرف بھاگتے ہیں تو وہ بڑھ کر ہمیں تھام لیتا ہے۔ ہم ایک قدم اس کی طرف چلتے ہیں تو وہ دس قدم ہماری طرف آتا ہے۔ ہم چل کر اس کی طرف جاتے ہیں اور وہ بھاگ کر ہماری طرف آتا ہے۔

اللہ اس قدر مہربان، اس قدر رحیم و کریم ہے کہ بن مانگے سب کچھ عطا کرنے والا۔ اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کے سامنے کوئی وضاحت نہیں کرنی پڑتی۔ وہ تو دلوں کے بھید سے واقف ہے۔ سب عیاں ہے اس پر، مظلوم کی آسمانوں کی طرف اٹھی ایک نظر، دکھی دل کی تڑپ، ٹوٹے دل کی پکار، تڑپتے سجدوں، سب سے نہ صرف وہ اللہ واقف ہے بلکہ چارہ ساز بھی وہی ہے۔ جب دھیان اس کی طرف لگ جاتا ہے، نیکی کی توفیق ملنے لگتی ہے، اچھے کام خود بخود ہمارے ہاتھوں سے سرانجام پانے لگتے ہیں۔ گناہوں پر ندامت ہونے لگتی ہے۔ اس کی مہربانی ہو تو اس کا احساس اس کا خیال، ہر عمل، ہر سوچ کی انگلی تھام لیتا ہے۔ اس سے باتیں کرنے کی، مشورے لینے کی عادت پڑنے لگتی ہے۔

اللہ مہربان ہو تو اللہ کے بندوں کے ساتھ مہربان ہونے کو جی چاہتا ہے اور اللہ نامہربان ہو جائے تو دعا کی توفیق چھن جاتی ہے۔

ہم نے کچھ لوگوں کو کہتے سنا: ''کیا کریں دعا مانگنے کو دل ہی نہیں چاہتا، نماز پڑھ کر بغیر دعا کیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔''

آپ کو معلوم ہے یہ مایوسی کی انتہائی کیفیت ہے۔ بزرگ کہتے ہیں یہ سختی اور عذاب کی ایک شکل ہے کہ آپ سے دعا کی توفیق چھن جائے۔ کیونکہ دعا اللہ سے آپ کی وابستگی اور آپ کے ربط کو بڑھاتی ہے۔

حدیث مبارکہ ہے: ''جو اللہ سے نہیں مانگتا، اللہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔''

دعا قربِ الٰہی کی ایک شکل ہے، اللہ پاک اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے بار بار اس سے مانگیں، اس سے سوال کریں اور وہ انھیں دیتا ہی چلا جائے، عطا کرتا ہی چلا جائے، نوازتا ہی چلا جائے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے!

''تمھارا پروردگار حیا والا اور بخشش والا ہے اور اپنے بندے سے، جب وہ ہاتھ اٹھاتا ہے، (تو) حیا کرتا ہے کہ اسے خالی ہاتھ پھیرے۔''

(ابوداؤد، الترمذی)

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کی رحمت، اللہ کے غضب سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کی رحمت لامحدود ہے، بندے کو جیسے جیسے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ ویسے ویسے اس میں عاجزی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اپنے گناہگار ہونے کا احساس بہت شدت سے ہونے لگتا ہے پھر اللہ کے غضب سے بہت ڈر لگتا

ہے۔ لیکن اس کی کریمی اور رحمت پر نظر جاتی ہے تو دل کو سہارا سا ہوتا ہے۔

جے ویکھاں میں ملاں وتے کج نئیں میرے پلے
جے ویکھاں تیرے وَتے، تے پلے پلے پلے!

حضرت عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے ''اگر مجھے کہا جائے کہ سارے لوگ جنت میں جائیں گے سوائے ایک شخص کے تو مجھے خوف ہوگا کہ وہ ایک شخص کہیں میں ہی نہ ہوں اور اگر مجھے بتایا جائے کہ ایک شخص کے سوا کوئی جنت میں نہیں جائے گا تو مجھے امید ہے کہ وہ ایک شخص عمرؓ ہی ہوگا۔''

عدل کریں تاں تھر تھر کمبن اُچیاں شاناں والے ھُو
فضل کرے تاں بخشے جاون میں جیہے منہ کالے

دعا..... چپکے چپکے عاجزی، ندامت، محبت اور حضوری کا احساس لیے اللہ کو پکارتے رہنے کا نام ہے۔

دعا..... اللہ سے رابطہ کا ایک ذریعہ ہے۔

دعا..... رشتوں کی اذیت سے بچاتی ہے..... جب آپ اُن لوگوں کے لیے دعا کرتے ہیں جن کے باعث آپ رنج میں ہوں، تکلیف اور اذیت میں ہوں تو اذیت کم ہوتی ہے..... واقعہ طائف یاد کیجیے آقائے دو جہاں ﷺ کے جو تے اہل طائف کے سلوک کے باعث خون سے بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن آپ ﷺ ان کے لیے دعا فرماتے ہیں۔

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے

بزرگ کہتے ہیں کہ واقعہ معراج اسی واقعہ طائف کا انعام ہے

دعا..... تکلیف، اذیت، کرب اور رنج کی شدت کو ختم نہ بھی کرے تو کمزور کر دیتی ہے۔ ناممکنات کو ممکنات بنا دیتی ہے، کیونکہ دعا مومن کا بہت بڑا سہارا ہے۔ اللہ ہمیں دعاؤں کی افادیت سے مایوس ہونے سے بچائے۔

حضرت رابعہ بصریؒ اکثر دعا کیا کرتی تھیں:

''یااللہ پاک! دنیا میں جو میرا حصہ ہے وہ اپنے دشمنوں کو عطا کر، آخرت میں میرا جو حصہ ہے وہ اپنے دوستوں کو عطا کر، میرے لیے تو بس آپ ہی کافی ہیں۔''

دعا..... راضی بہ رضا رہنا سکھاتی ہے..... اللہ سے، محبت کرنا سکھاتی ہے، اللہ سے تعلق کو مضبوط کرتی ہے، اور جب آتش عشق سینے میں بھڑک اٹھے تو پھر اچھا عمل نہ تو حصول جنت کے لیے ہوتا ہے اور نہ ہی نار جہنم کے خوف سے۔ پھر مقصود ہوتی ہے تو صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی۔

حضرت جنید بغدادیؒ دعا فرمایا کرتے تھے:

''یا اللہ! مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ تو مجھے جنت میں بھیجتا ہے یا دوزخ کی آگ میں پھینکتا ہے، مجھے تو بس تیری محبت اور تیرا عشق درکار ہے۔ جب تیرے عشق کی آگ میرے اندر بھڑک رہی ہو گی تو پھر جہنم کی آگ مجھے محسوس ہی نہ ہو گی۔''

(حوالہ موالی اللھمم)

دعا..... اللہ کی مرضی پہچاننے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔

حضرت علی فرمایا کرتے: ''جب میری کوئی خواہش یا دعا پوری ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں کہ میری مرضی پوری ہوئی، لیکن جب میری دعا قبول نہیں ہوتی تو میں اور بھی زیادہ خوش ہوتا ہوں کہ اللہ کی مرضی پوری ہوئی۔''

دعا..... لوگوں میں آپس کی محبت اور خیر خواہی کو فروغ دیتی ہے۔ دلوں کو قریب کرتی ہے، غمگساری سکھاتی ہے۔

''کوئی دعا اتنی جلد قبول نہیں ہوتی، جتنی غیر حاضر شخص کی، غیر حاضر شخص کے واسطے۔'' (ابو داؤد، الترمذی)

دعا..... اللہ کا قرب عطا کرتی ہے۔ حدیث مبارکہ ہے: ''بندہ سب سے زیادہ سجدے کی حالت میں اللہ کے قریب ہوتا ہے۔ اس لیے جب تم سجدے میں رہو تو کثرت سے دعا کیا کرو۔''

دعا کی قبولیت کا بہترین وقت کونسا ہے؟ اس بارے میں جب صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''رات کا آخری حصہ اور فرض نمازوں کے بعد۔''

انسان کی بہت عجیب عادت ہے۔ وہ تکلیف میں ہوتا ہے تو اللہ کے حضور روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، مسائل کے حل کے لیے درخواست گزار ہوتا ہے۔ جب اللہ پاک اس پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے تو وہ اللہ کو بھولنے لگتا ہے۔

دعا..... عبادت کا مغز ہے۔ اگر کوئی آدمی نماز پڑھے اور دعا نہ مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو سخت ناپسند کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ چونکہ تُو نے دعا نہیں مانگی۔ اس لیے اپنی نماز بھی لے جا، میں تیری نماز کا محتاج نہیں۔

دعا..... جلد بازی سے اجتناب کا تقاضا کرتی ہے۔ آقائے دو جہاں ﷺ نے فرمایا: ''دعا کے معاملے میں جلد بازی نہ کیا کرو، یعنی یہ سوچ کر کہ اتنے دنوں سے دعا کر رہا ہوں اور میری دعا قبول نہیں ہوتی، دعا کرنا نہ چھوڑ دو۔''

دعا کی قبولیت کا طریقہ کیا ہے، اس بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر کوئی بندہ مومن دعا کرتا ہے تو اللہ اس کی دعا رد نہیں فرماتا یا تو اس کی طلب کی ہوئی چیز اسے دے دیتا ہے اور اگر وہ چیز اس کے حق میں بہتر نہ ہو تو اس کے بدلے میں اس دعا کو اس کی آخرت کے لیے ذخیرہ کر دیتا ہے۔''

مسافر، مظلوم، غائب آدمی کی دعا غائب کے

لیے اور والدین کی دعا اولاد کے حق میں مقبول ہوتی ہے۔ اسی لیے حدیث پاک ہے کہ ''کبھی اپنے یا اپنی اولاد یا اپنے مال و متاع کے لیے بددعا نہ کیا کرو، کیونکہ ممکن ہے کہ جس ساعت میں تم دعا کر رہے ہو وہی قبولیت کی ساعت ہو۔''

دعا یہ کرنی چاہیے کہ اے اللہ! جو ہمارے لیے بہتر ہے وہ ہمیں بن مانگے دے دے اور جو ہمارے لیے بہتر نہیں ہے وہ مانگنے کی توفیق ہی نہ دے۔ اور دعا یہ ہونی چاہیے کہ اے اللہ! ہم تجھ سے وہ تمام بھلائیاں طلب کرتے ہیں جو تیرے پیارے رسول ﷺ نے طلب کیں اور ہر اس شے سے پناہ مانگتے ہیں جس سے تیرے پیارے حبیب محمد ﷺ نے پناہ طلب کی۔''

اے اللہ پاک! ہمیں اس بڑھیا کے انجام سے بچا جس نے ساری زندگی سوت کاتا اور آخر کار خود ہی اسے الجھا دیا۔ اے اللہ پاک! ہمیں اپنے انعام یافتہ لوگوں میں شامل کر لے۔

دعا..... یقین اور کامل بھروسہ مانگتی ہے اور شکر گزاری کا تقاضا بھی کرتی ہے۔

حدیث مبارکہ ہے: ''جب تم میں سے کوئی دعا کرے تو یہ نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے اور اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر..... بلکہ قطعی اور یقینی درخواست کرنی چاہیے کیونکہ اللہ پر کوئی روک ڈالنے والا نہیں۔''

حضرت زکریاؑ کی یہ دعا بہت خوبصورت اور شکر گزاری کا پہلو لیے ہوئے ہے ''اور اپنے رب سے مانگ کر تو میں کبھی محروم رہا ہی نہیں۔''

طارق عزیز نے کہا تھا:

اج دی رات میں کلاواں، کوئی نئیں میرے کول
اج دی رات تے میرے رب، نیڑے ہو کے بول

سو جب ہم دنیا کی محبت کو دل سے نکال کر، سچے دل سے، پورے اخلاص کے ساتھ، محبت کے ساتھ، عاجزی کے ساتھ، شرمساری کے ساتھ اسے پکارتے ہیں، آواز دیتے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ بس وہ سمیع و بصیر ہے تو وہ اتنے نزدیک سے بولتا ہے، دل پہ ہاتھ رکھتا ہے کہ اپنی اونچی آواز کی شدت پر شرمندگی ہونے لگتی ہے کہ وہ تو بن کہے سب جانتا ہے، سمجھتا ہے، سب سے بڑھ کر اپنا ہے۔

ہجوم غم سے جس دم آدمی گھبرا سا جاتا ہے۔ تو ایسے میں اسے آواز پر قابو نہیں رہتا وہ اتنے زور سے فریاد کرتا، چیختا اور بلبلاتا ہے کہ جیسے وہ زمین پر اور خدا ہو آسمانوں پر مگر ایسا بھی ہوتا ہے

کہ اس کی چیخ کی آواز کے رکنے سے پہلے ہی خدا کچھ اس قدر نزدیک سے اور اس قدر رحمت بھری مُسکان سے اس کو تھپکتا۔ اور اس کی بات سنتا ہے۔ کہ فریادی کو اپنی چیخ کی شدت اور صدا کی بے چینی پر ندامت ہونے لگتی ہے۔

حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں: ''دعا پر اعتماد ہی نیکی ہے لیکن جب ہم تنہائی اور خاموشی میں دعا مانگ رہے ہوتے ہیں تو ہم اس یقین کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارا اللہ تنہائی میں ہمارے پاس ہے اور وہ خاموشی کی زبان بھی سمجھتا ہے۔ دعا میں خلوص، آنکھوں کو پُرنم کر دیتا ہے اور یہی آنسو دعا کی منظوری کی دلیل ہیں۔''

شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کی ایک فارسی

رباعی میں پنہاں دعائیہ انداز بڑا دلپذیر ہے:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ ﷺ پنہاں بگیر

ترجمہ: اے اللہ! تو دو عالم سے مستغنی ہے اور میں فقیر ہوں۔ روز محشر میرے عذر، بہانے اور تغیرات قبول کر لینا اور اگر حساب لینا ناگزیر ہی ٹھہرے تو پاک نگاہ مصطفیٰ ﷺ سے چھپا کر میرا حساب لینا۔''

ہر انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب، فرقے، زبان، رنگ و نسل اور خطے سے تعلق رکھتا ہو وہ کسی نہ کسی انداز میں خدا کو پکارتا ہے، دعا کرتا ہے۔

آج کا انسان مسائل اور مصائب کا اس قدر شکار ہو چکا ہے کہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات نے اس کا ذہن منطقی کر کے رکھ دیا ہے۔ مادیت پرستی کی ہوا نے دعا کے سارے خیمے اکھاڑ دیئے ہیں۔

مایوسی..... ہاتھوں کو دعا کے لیے اٹھنے نہیں دیتی..... اور جب انسان دعا کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اللہ کے ساتھ اس کا تعلق کمزور پڑنے لگتا ہے۔ پھر وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان رہنے لگتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے مسائل کا کوئی حل موجود نہیں، ایسا انسان ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اللہ پر یقین اور توکل جیسے الفاظ اس کے لیے اجنبی ہو جاتے ہیں، مایوسیوں کے اندھیرے اس کی زندگی کی ساری خوشیوں کو نگل لیتے ہیں۔ مایوس انسان بھولنے لگتا ہے کہ اللہ نے خود فرمایا ہے: ''اور کہتا ہے تمھارا رب کہ مجھ سے دعا کرو، میں تمھاری دعاؤں کو قبول کروں گا۔'' (المومن، آیت 60)

کون سی انگلی

شعبیؒ نے ایک دن یہ روایت بیان کی کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''سحری کھایا کرو اگرچہ اس کی مقدار اتنی ہو کہ آدمی اپنی انگلی مٹی پر رکھ دے اور پھر اسے اپنے منہ میں ڈال دے''۔ حاضرین میں سے ایک نے پوچھا ''کون سی انگلی؟'' شعبیؒ نے اپنے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر کہا ''یہ''

انتخاب: (محمد اسید، لاہور)

اللہ کو یاد کرنے والا، اللہ کو پکارنے والا اور اللہ سے دعا کے انداز میں گفتگو کرنے والا شخص کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جب اللہ نے خود فرما دیا کہ مجھ سے مانگو، میں تمھیں عطا کروں گا۔ تمھاری دعا قبول کروں گا تو ہمیں یقین رکھنا ہوگا کہ اللہ بڑھ کر تو اپنی بات میں سچا کوئی نہیں۔

سو آیئے ہم بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں کہ ہم وہ ہیں کہ جنھیں ہے دعا یاد مگر حرفِ دعا یاد نہیں

یا اللہ! اپنا خوف ہمارے (دلوں) میں اتنا ڈال دے کہ وہ ہم میں اور ہمارے گناہوں میں حائل ہو جائے اور اپنی فرمانبرداری اتنی دے کہ وہ ہمیں جنت میں پہنچا دے اور اتنا یقین عطا کر کہ ہماری دنیاوی مصیبتیں اس سے آسان ہو جائیں۔

اے اللہ! ہمارے کانوں، آنکھوں اور قوت سے اس وقت تک ہمیں بہرہ مند رکھ جب تک ہم جیتے ہیں اور ہم میں سے ہمارے وارث بنا اور ہمارے انتقام اس شخص سے لے جو ہم پر ظلم کرے۔ اس شخص کے مقابلے میں جو ہم پر زیادتی کرے، ہماری مدد کر اور ہمارے دین میں رخنہ نہ پڑنے دے۔ دنیا کو نہ ہمارا بڑا مقصود، نہ ہمارے علم کی انتہا بنا دے اور ہمارے اوپر ایسے شخص کو مسلط نہ کر جو ہم پر رحم نہ کرے۔ (آمین)

سچا واقعہ

ننھا داعی

ہالینڈ کی ایک بڑھیا کی کہانی
اپنی زندگی کے آخری لمحے وہ ایک دستک سن بیٹھی تھی

عبدالمالک مجاہد

ہر جمعہ کو نماز عصر کے بعد باپ بیٹے کا معمول تھا کہ وہ لوگوں کو دین کی دعوت دینے کے لیے اپنے گھر سے نکلتے، بازار کے وسط میں سڑک کنارے کھڑے ہو جاتے' آتے جاتے لوگوں میں اسلامی لٹریچر تقسیم کرتے۔ باپ مقامی مسجد میں خطیب ہیں ان کا گیارہ سالہ بیٹا گذشتہ کئی سالوں سے موسم کی شدت کی پرواہ کیے بغیر اپنے والد کے ساتھ جاتا تھا۔

ایمسٹرڈم ہالینڈ کا دارالحکومت ہے۔ یورپ کا یہ چھوٹا سا ملک بے حد خوبصورت ہے۔ یہاں بے حد و حساب پھول پیدا ہوتے ہیں۔ بارشیں کثرت سے ہوتی ہیں، اس لیے یہاں ہر طرف ہریالی نظر آتی ہے۔ دودھ کی پیداوار اور اس کی پروڈکٹ کے اعتبار سے یہ ملک بڑا مشہور ہے۔ کتنی ہی مشہور زمانہ کمپنیاں یہاں سے خشک دودھ دنیا بھر میں سپلائی کرتی ہیں۔ اس روز موسم بڑا ہی خراب تھا۔ صبح سے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ یخ بستہ سردی کے ساتھ ساتھ وقفے وقفے سے بارش بھی ہو رہی تھی۔ جمعہ کا دن تھا اور معمول کے مطابق باپ بیٹے کو لٹریچر تقسیم کرنا تھا۔ والد تھوڑی ہی دیر پہلے مسجد سے گھر پہنچے تھے۔ انہیں قدرے تھکاوٹ بھی تھی۔ بیٹے نے خوب گرم کپڑے پہنے اور اپنے والد صاحب سے کہنے لگا: اباجان چلیے! لٹریچر تقسیم کرنے کا وقت ہو چکا ہے۔

مگر بیٹے! آج تو موسم بڑا خراب ہے۔ سردی کے ساتھ ساتھ بارش بھی ہو رہی ہے۔

میں تو تیار ہو گیا ہوں۔ بارش ہو رہی ہے تو پھر کیا ہے؟ یہاں تو بارش کا ہونا معمول کی بات ہے، بیٹے نے جواب دیا۔

بیٹے! موسم کا تیور آج ہم سے یہ کہہ رہا ہے کہ ہم آج گھر پر ہی رہیں، والد نے جواب دیا۔

اباجان! آپ تو خوب جانتے ہیں کہ کتنے ہی لوگ جہنم کی طرف جا رہے ہیں۔ ہمیں ان کو بچانا ہے۔ انہیں جنت کا راستہ دکھانا ہے۔ آپ کو تو خوب معلوم ہے کہ جنت کا راستہ نامی کتاب پڑھ کر کتنے ہی لوگ راہِ

راست پر آگئے ہیں۔

والد: بیٹے! آج میرا اس موسم میں باہر جانے کا قطعاً ارادہ نہیں ہے۔ کسی اور دن پروگرام بنالیں گے۔

بیٹا: ابا جان! کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ آج میں اکیلا ہی ان کتابوں کو تقسیم کر آؤں۔ بیٹے نے اجازت طلب نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ والد تھوڑی دیر تردد کا شکار ہوئے اور پھر کہنے لگے: میرے خیال میں تمہارے اکیلے جانے میں کوئی حرج نہیں۔ اللہ کا نام لے کر تم بے شک آج اکیلے ہی چلے جاؤ اور لوگوں میں کتابیں تقسیم کر آؤ۔

والد نے بیٹے کو Road to Paradise ''جنت کا راستہ'' نامی کچھ کتابیں پکڑائیں اور اسے فی امان اللہ کہہ کر الوداع کہہ دیا۔

قارئین کرام! اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ ہمارے اس ننھے داعی کی عمر صرف گیارہ سال ہے اسے بچپن ہی سے اسلام سے شدید محبت ہے اور وہ نہایت شوق سے دین کے کاموں میں پیش پیش رہتا ہے۔ ننھا داعی گھر سے نکلتا ہے، اس کا رخ بازار کی طرف ہے جہاں وہ کافی عرصہ سے لٹریچر تقسیم کرتا چلا آرہا ہے۔ اب وہ بازار میں اپنی مخصوص جگہ پر کھڑا ہے وہ اپنی مسکراہٹ سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کو سلام کرتا ہے۔ انہیں روکتا ہے۔ ان سے بات چیت کرتا ہے مسکراتے ہوئے ان سے کہتا ہے: دیکھیے سر! میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کا رب آپ سے شدید محبت کرتا ہے۔ وہ انہیں کتاب پیش کرتا ہے، ان سے کہتا ہے: جناب! یہ فری ہے۔ یہ آپ کے لیے ہے۔ ان میں کچھ لوگ اس ننھے لڑکے سے کتاب لے لیتے ہیں کچھ شانے اچکا کر آگے نکل جاتے ہیں۔ کچھ کتابیں تقسیم کرنے کے بعد اب اس کا رخ قریبی محلے کی طرف ہے وہ بعض گھروں کے دروازوں پر دستک دیتا ہے اگر کوئی باہر نکلتا ہے تو مسکراتے ہوئے اسے کتاب کا تحفہ پیش کرتا ہے۔ کوئی قبول کرلیتا ہے کوئی انکار کرتا ہے مگر وہ ان چیزوں سے بے پروا اپنے مشن میں لگا ہوا ہے۔

کتابیں تقسیم کرتے ہوئے کم وبیش دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اب اس کے ہاتھوں میں آخری کتاب رہ گئی ہے۔ وہ اس سوچ میں تھا کہ یہ آخری کتاب کسے دی جائے۔ اس نے گلی میں آنے جانے والے کئی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور انہیں کتاب دینے کی پیش کش کی، مگر انہوں نے تھینک یو کہہ کر انکار کیا اور آگے چل دیے۔ گلی میں ایک جگہ جہاں بہت سارے گھر ایک ہی ڈیزائن کے بنے ہوئے ہیں وہ ان میں سے ایک گھر کا انتخاب کرتا ہے اور اس کے دروازے پر جا کر گھنٹی بجاتا ہے، کسی نے جواب نہ دیا۔ اس نے بار بار گھنٹی بجائی، مگر اندر مکمل خاموشی تھی۔ نجانے اسے کیا ہوا۔ یہ اس کے طریق کار کے خلاف تھا کہ وہ کسی کے دروازے کو اس طرح بجائے مگر آج اس نے دروازے کو زور زور سے بجانا شروع کر دیا زور سے کہا: کوئی اندر ہے تو دروازہ کھولو۔ اندر بدستور مکمل خاموشی تھی۔ وہ مایوس ہونے لگا، اس نے کچھ سوچا اور آخری بار اپنی انگلی گھنٹی پر رکھ دی۔ گھنٹی بجتی رہی، بجتی رہی..... اور آخر کار اسے اندر سے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ اس کے دل کی حرکت تیز ہونے لگی۔ چند لمحوں بعد آہستگی سے دروازہ کھلتا ہے۔

ایک بوڑھی خاتون چہرے پر شدید رنج وغم کے آثار لیے سامنے کھڑی تھی، کہنے لگی: ہاں میرے بیٹے! بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کرسکتی ہوں؟

ننھے داعی نے مسکراتے ہوئے کہا: نہایت ہی معزز خاتون! اگر میں نے آپ کو بے وقت تنگ کیا ہے تو اس کے لیے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کا رب آپ سے حقیقی اور سچی محبت کرتا ہے۔ آپ کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے۔ میں کچھ کتابیں تقسیم کر رہا تھا۔ میرے پاس یہ آخری کتاب بچی ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ کتاب میں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ اس کتاب میں کیا ہے؟ یہ آپ کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا، مگر اتنی بات میں کہے دیتا ہوں یہ کتاب آپ کو آپ کے حقیقی رب کے بارے میں بہت کچھ بتائے گی۔ اسے پڑھ کر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے پیدا کرنے والے نے ہمیں کن مقاصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور ہم اپنے رب اپنے خالق اور مالک کو کیسے راضی کر سکتے ہیں۔ بوڑھی عورت نے کتاب وصول کی اور بچے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: جیتے رہو بیٹا، جیتے رہو۔

ننھے داعی کا آج کے لیے مشن مکمل ہو چکا تھا، اس کو جتنی کتابیں تقسیم کرنا تھیں وہ کر چکا تھا۔ اس کا رخ اب اپنے گھر کی طرف تھا۔ یوں بھی شام کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ وہ ہنستا مسکراتا اپنے گھر واپس آگیا۔

ہفتہ کے ایام جلد ہی گزر گئے۔ آج ایک بار پھر جمعہ کا دن ہے۔ باپ بیٹا حسب معمول جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں ہیں۔ ننھے داعی کے والد نے جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا۔ نماز پڑھانے کے بعد حسب معمول حاضرین سے کہا کہ آپ میں سے کوئی سوال کرنا چاہتا ہو یا کوئی بات کہنا چاہتا ہو تو اسے برسر عام ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ وہ اٹھ کر بیان کرسکتا ہے۔

حاضرین میں تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا جاتی ہے۔ لگتا ہے کہ آج کسی کے پاس کوئی خاص سوال نہیں۔ اچانک پچھلی صفوں پر بیٹھی ہوئی خواتین میں سے ایک بوڑھی خاتون کھڑی ہوتی ہے۔ وہ قدرے بلند آواز میں کہنا شروع کرتی ہے:

خواتین وحضرات! آپ لوگوں میں سے مجھے کوئی بھی نہیں پہچانتا نہ ہی آج سے پہلے میں کبھی اس مسجد میں آئی ہوں۔ میں تو گزشتہ جمعہ تک مسلمان بھی نہ تھی۔ بلکہ میں نے اسلام قبول کرنے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

چند ماہ گذرے میرے خاوند کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد میں اس دنیا میں بالکل تنہا تھی۔ گزشتہ جمعہ کے روز موسم غیر معمولی ٹھنڈا تھا۔ وقفے وقفے سے ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ میں اس دنیا اور تنہائی سے تنگ آچکی تھی۔ دنیا میں میرا کوئی بھی نہ تھا۔ میں کتنے دنوں سے سوچ رہی تھی کہ میں خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کیوں نہ کرلوں۔ جب میرا خاوند نہیں رہا تو میں اس دنیا میں رہ کر کیا کروں گی۔ بالآخر گزشتہ جمعہ کو میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ میں بازار گئی وہاں سے ایک نہایت مضبوط رسی خریدی۔ سیڑھی پر چڑھ کر چھت کے ایک گارڈر سے رسی کو باندھا۔ پھر میں نے رسی کے ایک سرے سے پھندا بنایا، اگلا مرحلہ یہ تھا کہ کرسی کو اپنے قریب کر کے مجھے اس پر پاؤں رکھنا تھا اور گلے میں پھندا ڈال کر کرسی کو ٹھوکر مار دینی تھی۔ اس طرح پھندہ میرے گلے میں اٹک جاتا اور میری زندگی کا خاتمہ ہو جاتا۔ جوں ہی میں نے گلے میں رسی ڈالی، نیچے سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ پہلے تو میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی، مگر گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ میں نے سوچا: میرا ملنے والا کون ہوسکتا ہے؟ مدتیں گزر گئی ہیں مجھے کوئی ملنے

کے لیے کبھی نہیں آیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں گھنٹی کو نظر انداز کردوں اور خودکشی کرلوں۔ ادھر گھنٹی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کوئی غیر مرئی طاقت مجھ سے کہہ رہی تھی کہ دیکھو دروازے پر کون ہے؟ لیکن ایک سوال بار بار میرے ذہن میں آرہا تھا: اس دنیا میں تو میرا کوئی بھی نہیں پھر یہ گھنٹی دینے والا کون ہوسکتا ہے؟

اسی دوران کسی نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا: چلو کوئی بات نہیں، میں خودکشی کے پروگرام کو تھوڑی دیر کے لیے مؤخر کر دیتی ہوں چنانچہ میں نے رسی کو گردن سے اتارا، کرسی کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ نچلی منزل کی طرف چل دی۔

میں نے دروازہ کھولا تو ایک بہت پیارے اور خوبصورت بچے کو دیکھا جو مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، مجھے دیکھ کر اسے یوں لگ رہا تھا کہ اسے کوئی بڑی نعمت مل گئی ہو۔ میں نے آج تک اس عمر کے بچے کے چہرے پر اتنی خوبصورت مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ میں بتا نہیں سکتی کہ وہ بچہ مجھے کتنا پیارا لگا۔ اس کے منہ سے نکلنے والے کلمات نہایت پیارے اور دل کش تھے۔ جس انداز سے اس نے میرے ساتھ گفتگو کی وہ ناقابل فراموش تھی۔ اس نے مجھ سے کہا: اے معزز اور محترم خاتون! میں آپ کے پاس اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کو بتادوں کہ اللہ تعالیٰ آپ سے حقیقی محبت کرتے ہیں اور آپ کا ہر لحاظ سے خیال رکھتے ہیں۔

اس نے ''جنت میں جانے کا راستہ'' نامی کتاب میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا: اسے اطمینان سے ضرور پڑھیے۔

وہ خوبصورت اور روشن چہرے والا بچہ جدھر سے آیا تھا ادھر ہی واپس چلا گیا، مگر میرے دل میں شدید ہلچل پیدا کر گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور نچلی منزل پر ہی بیٹھ کر اس کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھنے لگی۔ میں کتاب پڑھتی چلی گئی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ کتاب میرے لیے اور صرف میرے لیے لکھی گئی ہے۔ میں نے جیسے ہی کتاب ختم کی میرے ذہن میں انقلاب آچکا تھا۔ مجھے روشنی مل گئی تھی۔ میں اوپر والی منزل میں گئی۔ چھت سے رسی کھولی اور کرسی کو پیچھے ہٹا دیا۔ اب مجھے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہ رہی تھی۔

معزز حاضرین! اس نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: میں نہایت سعادت مند اور خوش بخت ہوں کہ میں نے اپنے حقیقی رب کو پہچان لیا ہے۔ میں نے فطرت کو پالیا ہے۔ میں اب الحمدللہ! مسلمان ہو چکی ہوں۔ اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے ہدایت سے نوازا۔ کتاب کے آخری صفحہ پر اس مرکز کا ایڈریس دیا ہوا تھا میں یہاں اس لیے آئی ہوں کہ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرسکوں، خصوصاً اس ننھے سے داعی کا جو میرے پاس نہایت ہی مناسب وقت پر آیا۔ بس یہ چند لمحوں کی بات تھی، اگر وہ نہ آتا تو میں جہنم کا ایندھن بننے ہی والی تھی۔

لوگ حیران و ششدر ہو کر بڑھیا کی بات سن رہے تھے، جب اس کی بات ختم ہوئی تو مسجد میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں شاید ہی کوئی آنکھ ہو جس میں آنسو نہ جھلک رہے ہوں۔ مسجد میں اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ امام مسجد منبر سے نیچے اترے، سامنے والی صف میں ان کا ننھا داعی بیٹا بیٹھا ہوا تھا۔

انہوں نے روتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں میں لیا اور سینے سے لگا لیا۔ وہ کہہ رہے تھے: بیٹے! مجھے تم پر فخر ہے۔ تم صحیح معنوں میں ننھے داعی اور مجاہد ہو۔ مسجد میں شاید ہی کوئی شخص ہو جس کی یہ تمنا نہ ہو کہ کاش اس کا بیٹا بھی اس قسم کا داعی ہوتا!!!

■■■

ان کے کانوں نے وفاداری کا حق ادا کردیا

نقوش صحابہ

اپنی ہی طرز کا آدمی

حضرت عمیر بن سعدؓ

ان کیلئے حضرت عمر کیوں آرزو کیا کرتے تھے کہ کاش انہیں عمیرؓ جیسے افراد مل جائیں

خالد محمود خالد، ترجمہ: ارشاد الرحمن

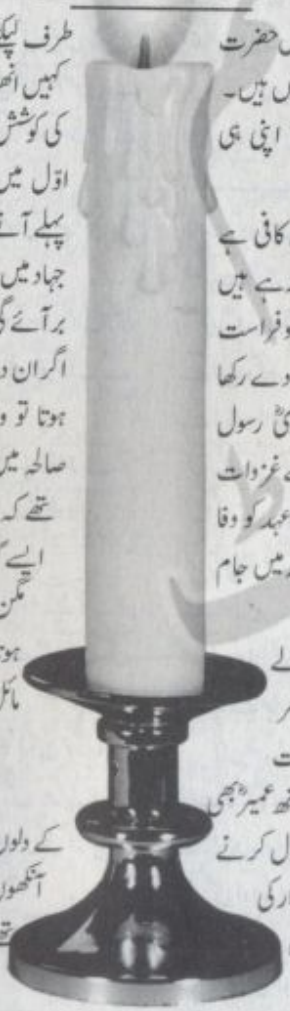

حضرت عمیر بن سعدؓ خوبیوں میں حضرت سعید بن عامرؓ کے جڑواں ہیں۔ مسلمانوں نے انھیں ''اپنی ہی طرز کا آدمی'' کا لقب دے رکھا تھا۔

قارئین کرام! آپ کے لیے تو یہی کافی ہے کہ آپ ایک ایسے شخص کا تذکرہ پڑھ رہے ہیں جس کو صحابہ نے اپنے فضل و فہم اور نور و فراست کے باوجود ''اپنی طرز کا آدمی'' کا لقب دے رکھا تھا۔ ان کے والد حضرت سعد القادریؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوۂ بدر اور بعد کے غزوات میں شریک رہے اور اس دوران اپنے عہد کو وفا کرتے رہے یہاں تک کہ جنگ قادسیہ میں جام شہادت سے شادکام ہوئے۔

حضرت سعدؓ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہوگئے۔ باپ کے ساتھ عمیرؓ بھی مسلمان ہوگئے۔ حضرت عمیرؓ اسلام قبول کرنے کے بعد بارگاہِ رب میں ایک عبادت گزار کی حیثیت سے مشغولِ عمل ہوگئے۔ وہ روشنیوں سے بھاگتے اور چھاؤں کی طرف لپکتے۔ بعید ہے کہ نماز یا جہاد کے علاوہ کہیں انھوں نے پہلی صفوں میں داخل ہونے کی کوشش کی ہو۔ نماز میں وہ اس لیے صف اوّل میں جاتے کہ وہاں جگہ حاصل کر کے پہلے آنے والوں جیسا ثواب حاصل کریں اور جہاد میں اس لیے پہل کرتے کہ شہادت کی تمنا بر آئے گی۔

اگر ان دونوں مواقع کے علاوہ کوئی تیسرا موقع ہوتا تو وہ اپنے ٹھکانے پر بیٹھے اپنے اعمالِ صالحہ میں مشغول رہتے۔ وہ ایسے فرمانبردار تھے کہ اپنے گناہوں پر رویا کرتے تھے اور ایسے گوشہ نشین تھے کہ اپنی توبہ کی فکر میں ہی مگن رہتے تھے۔ ان کا سفر اللہ کی طرف ہوتا تھا اور وہ ہر مقام پر اللہ کی طرف مائل رہتے تھے۔

☆☆☆

انھوں نے اپنے احباب و رفقاء کے دلوں میں اس قدر گھر کرلیا تھا کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دلوں کا سرور بن گئے تھے۔ یہ ان کے ایمان کی قوت، دل کی صفائی، مزاج کی نرمی، صفات کی خوشبو

اور شخصیت کی چمک تھی کہ جو بھی ان کے پاس بیٹھتا یا انھیں دیکھتا تو فرحت وانبساط سے جھوم اٹھتا۔

آپؓ دین پر کسی انسان کو کوئی اہمیت دیتے تھے نہ کسی چیز کو اس سے اہم سمجھتے تھے۔ ''حضرت جُلّاس بن سُوید بن صامت'' ان کے قریبی عزیز تھے، غزوۂ تبوک کے موقع پر سفر کی تیاریاں ہو رہی تھیں، لیکن حضرت جُلّاس ان میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ حضرت عمیرؓ نے ان سے دوسرے لوگوں کی تیاریوں کا ذکر کر کے انھیں بھی تیاری کرنے کے لیے کہا تو انھوں نے ایک ایسا کلمہ کہہ دیا جو ایک مسلمان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دینے والا تھا۔ انھوں نے کہا:

''اگر یہ آدمی سچا ہے تو پھر ہم گدھوں سے بھی بدتر ہیں!''

''اس آدمی'' سے جُلّاس کی مراد رسول اللہ ﷺ تھے۔ اور جُلّاس ان لوگوں میں سے تھے جو خوف کے مارے اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

حضرت عمیرؓ بن سعدؓ نے ان کے یہ الفاظ سنے تو آپؓ کے پُرسکون دل میں غضب وحیرت کا طوفان برپا ہو گیا۔

غضب..... اس لیے کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے وہ رسول ﷺ کے بارے میں اس سطحی لہجے میں بات کرے!

حیرت..... اس لیے کہ آپؓ کا ذہن فوراً اس ذمہ داری اور جواب دہی کی طرف منتقل ہو گیا جو یہ الفاظ سننے کے بعد آپؓ کے اوپر عائد ہو رہی تھی کہ کیا وہ ان الفاظ کو رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دیں؟

اور پہنچائیں تو کس طرح؟ مجلس کی باتیں تو راز اور امانت ہوتی ہیں!

تو پھر انھیں کیا کرنا چاہیے؟

یہی کہ جو کچھ سنا تھا اس پر خاموش ہو جائیں اور اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیں!

لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

اگر وہ ایسا کرتے تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیے گئے اس عہد وفا کا کیا بنتا جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان کو گمراہی سے نکال کر ہدایت سے سرفراز کیا اور اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف مائل کیا!

ان کی یہ حیرانی زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ ان کے اس دل نے ان کی رہنمائی کی جو مشکلات میں ہمیشہ اپنے مالک کے لیے راہیں نکالا کرتا تھا۔ حضرت عمیرؓ فوراً ایک طاقت ور مرد اور متقی مومن کی حیثیت سے پلٹے اور حضرت جُلّاس بن سوید کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے:

''اے جُلّاس! اللہ کی قسم! تم مجھے لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب اور عزیز ہو! تمھارے میرے اوپر سب سے زیادہ احسانات ہیں، میرے لیے یہ بڑا ناگوار ہے کہ تجھے کوئی تکلیف پہنچے! لیکن تو ایسی بات کر گیا ہے کہ اگر میں اس کو پھیلاتا ہوں تو تجھے تکلیف ہوگی اور اگر چھپاتا ہوں تو میرا دین مجھے ہلاکت کی نوید سناتا ہے۔ اور میرے نزدیک دین کا حق سب سے فائق ہے کہ اس کو ادا کیا جائے۔ لہٰذا میں یہ بات رسول اللہ ﷺ کو پہنچانے جا رہا ہوں!''

اس طرح حضرت عمیرؓ نے سب سے پہلے مجلس کی امانت کا حق ادا کیا اور اپنے عظیم نفس کو چغل خور سامع کے ناپسندیدہ کردار سے اوپر اٹھا لیا۔ اس کے بعد دین کا حق بھی ادا کر دیا کہ مشکوک نفاق سے پردہ اٹھا دیا اور حضرت جُلّاس کو اپنی غلطی پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنے اور اس پر رجوع کرنے کا موقع فراہم

کر دیا۔ اب اگر حضرت عمیرؓ اس بات کی خبر رسول اللہ ﷺ کو دے دیتے تو ان کے ضمیر کو یہ اطمینان تھا کہ وہ کسی چغل خوری کا ارتکاب نہیں کر رہے اور نہ مجلس کے کسی راز کو افشا کر رہے ہیں۔ لیکن جُلّاس اپنے گناہ پر اڑے رہے اور اپنے کیے پر افسوس ومعذرت کا ایک لفظ تک نہ کہا۔ لہٰذا حضرت عمیرؓ یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے: ''قبل اس کے کہ وحی نازل ہو اور مجھے بھی تمھارے گناہ میں شریک کر دے، میں رسول اللہ ﷺ تک یہ خبر پہنچا کر رہوں گا۔''

رسول اللہ ﷺ نے حضرت جُلّاس کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ جُلّاس سے پوچھا گیا تو انھوں نے انکار کر دیا کہ انھوں نے یہ بات کہی ہے بلکہ قسم کھا گئے، حالانکہ وہ جھوٹ بول رہے تھے۔

اس پر قرآن کی آیت نازل ہوگئی اور حق و باطل کے درمیان فرق کر کے رکھ دیا گیا:

''یہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے یہ بات نہیں کہی حالانکہ وہ کفر کی بات کہہ چکے ہیں اور اسلام لانے کے بعد پھر وہ کافر بن گئے اور ایسی بات چاہی جس کو نہ کر سکے اور یہ لوگ اس لیے بگڑے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اپنی مہربانی سے ان کو مال دار بنا دیا۔ اگر یہ لوگ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہوگا اور اگر نہ مانیں تو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور زمین پر اُن کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہوگا۔''

حضرت جُلّاس نے جب دیکھا کہ جو آیت کریمہ ان کا مواخذہ کر رہی ہے وہ یہ خوشخبری بھی دے رہی ہے کہ اگر وہ توبہ کر لیں اور اپنی غلطی پر رجوع کر لیں تو اللہ کی رحمت کے وہ مستحق بن سکتے ہیں۔ لہٰذا حضرت جُلّاسؓ مجبور ہو گئے کہ اپنی کہی ہوئی بات کا اعتراف کریں اور اپنی غلطی پر معذرت کریں۔

حضرت عمیرؓ کا یہ اقدام حضرت جُلّاسؓ کے لیے خیر وبرکت کا باعث بن گیا اور وہ تائب ہو گئے انھوں نے اپنے اسلام میں موجود کمی کو بھی دور کر لیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمیرؓ کا کان پکڑا اور انھیں شاباش دی کہ:

''اے بچے! تیرے کانوں نے وفاداری کا حق ادا کیا اور تیرے رب نے تیری بات کی تصدیق فرمائی۔''

حضرات! آپ جانتے ہیں امیر المومنین حضرت عمرؓ بن خطاب علاقوں شہروں کے امرا و والیان کو منتخب کرتے تھے تو گویا وہ ان کی قدر وقیمت کا انتخاب کرتے تھے۔ آپؓ زہد وورع سے متصف اور راست باز وامانت دار لوگوں میں سے ذمہ دار مقرر کرتے تھے..... ایسے لوگ جو عہدوں اور منصبوں سے دور بھاگتے تھے، ان کو قبول نہ کرتے تھے مگر اس وقت جب امیر المومنین ان کے نہ چاہنے کے باوجود ان پر ذمہ داری ڈال دیتے تو انھیں چار وناچار یہ ذمہ داری اٹھانا پڑتی!

حضرت عمرؓ اپنی دور اندیش بصیرت اور وسیع وعمیق باخبری کے باوجود طویل غور وخوض اور تفکر وتامل سے کام لیتے اور امرا و معاونین حکومت کے انتخاب میں گہری چھان بین کرتے تھے۔ وہ اپنے یہ مشہور الفاظ کسی بھی موقع پر دہرانا نہ بھولتے تھے کہ:

''میں ایسا آدمی منتخب کرنا چاہتا ہوں کہ جب وہ اپنی قوم کے درمیان ہو اور ان کا امیر نہ ہو لیکن لگتا امیر ہو... اور جب وہ ان کے درمیان ہو اور ان کا امیر بھی ہو لیکن امیر دکھائی نہ دے بلکہ ان میں سے ایک عام آدمی دکھائی دے۔''

میں ایسا گورنر چاہتا ہوں جو اپنے آپ کو لباس میں، نہ کھانے میں اور نہ رہائش میں لوگوں سے ممتاز سمجھے۔

وہ ان کے درمیان نماز قائم کرائے، ان کے حق انھیں دلائے، عدل کے ساتھ ان کے درمیان فیصلے کرے اور ان کی ضرورتیں پوری کرنے سے اپنا دروازہ بند نہ کرے۔''

اس سخت اور کڑے معیار کی روشنی میں ایک روز حضرت عمرؓ نے حضرت عمیرؓ کو حمص کا گورنر مقرر کر دیا۔ حضرت عمیرؓ نے کوشش کی کہ وہ اس ذمہ داری سے خلاصی پالیں اور جان چھڑالیں مگر امیر المومنین عمرؓ فاروق نے اسے ان پر عائد اور فرض کر دیا۔

جناب عمیرؓ نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا اور اپنی ذمہ داری پر چلے گئے۔ حمص میں منصب امارت کی انجام دہی میں انھیں ایک سال گزر گیا مگر مدینہ میں دارالحکومت کو ان سے کوئی ٹیکس موصول نہ ہوا بلکہ امیر المومنین کو کوئی خط بھی موصول نہ ہوا۔

حضرت عمرؓ نے کاتب کو بلایا اور فرمایا: ''عمیرؓ کو خط لکھو کہ وہ ہمارے پاس آئے۔''

قارئین کرام! اجازت چاہوں گا کہ عمرؓ و عمیرؓ کے درمیان ہونے والی اس ملاقات کا تفصیلی تذکرہ کروں! سنیے:

''ایک روز مدینے کی شاہراہوں نے گرد و غبار سے اٹے ہوئے ایک شخص کا مشاہدہ کیا، سفر کی ماندگی نے اسے ڈھانپ رکھا تھا۔ طویل سفر سے پہنچنے والی تھکاوٹ اور تکلیف کے باعث اس کے قدم بمشکل زمین سے اٹھ رہے تھے۔ اس کے دائیں کندھے پر ایک تھیلا اور ایک پیالہ تھا اور بائیں کندھے پر ایک چھوٹا سا مشکیزہ جس میں پانی تھا۔ یہ ہلکا سازاد سفر اس کے اوپر کیا بوجھ ڈال سکتا تھا۔ لیکن صعوبتِ سفر کے باعث یہ شخص بوجھل قدموں کے ساتھ بارگاہِ خلافت میں پہنچا۔

امیر المومنین! السلام علیکم!

خلیفۃ المسلمین عمر فاروقؓ سلام کا جواب دیتے ہیں۔ مسافر کی پراگندہ حالت اور تھکاوٹ کو دیکھ کر تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ پھر پوچھتے ہیں: عمیرؓ! یہ تمھاری کیا حالت بنی ہوئی ہے؟

حضرت عمیرؓ کہتے ہیں: میری حالت یہی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں! کیا آپ مجھے صحت مند جسم اور تازہ دم نہیں دیکھ رہے کہ میں اپنی دنیا کو دونوں سینگوں سے پکڑ کر کھینچے چلا آرہا ہوں؟

حضرت عمر فاروقؓ پوچھتے ہیں: تمھارے پاس کیا ہے؟

حضرت عمیرؓ جواب دیتے ہیں: میرے پاس میرا تھیلا ہے اس کے اندر میں اپنا سامانِ دنیا رکھتا ہوں اور لاٹھی ہے جس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اگر دشمن آڑے آجائے تو اس سے بھی اسی کے ذریعے نپٹ لیتا ہوں۔ اللہ کی قسم! دنیا میرے اس سامان کے سامنے ہیچ ہے۔''

جناب عمر فاروقؓ پوچھتے ہیں: کیا تم پیدل آئے ہو؟

حضرت عمیرؓ: ہاں پیدل آیا ہوں۔

حضرت عمرؓ: کیا تمھیں کوئی نہیں ملا جو سواری دیتا اور تم اس کے اوپر سوار ہو کر آجاتے؟

حضرت عمیرؓ: لوگوں نے اس کا اہتمام نہ کیا اور میں نے ان سے سوال نہ کیا!

حضرت عمرؓ: ہم نے تمھارے ذمے جو کچھ لگایا تھا اس سلسلے میں تم نے کیا کام کیا ہے؟

حضرت عمیرؓ: میں اس علاقے میں گیا جہاں آپ نے مجھے ذمہ دار بنا کر بھیجا تھا۔ میں نے وہاں کے نیک

لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کو ان کے فے اور مال کے ٹیکس کا ذمہ دار بنا دیا۔ وہ یہ چیزیں جمع کر کے آئے تو میں نے اس مال و دولت کو اس کی جگہ رکھ دیا۔ اگر اس میں سے کوئی چیز بچ گئی تو میں آپ کے پاس لے آؤں گا!

حضرت عمرؓ: تو پھر تم ہمارے پاس کوئی چیز نہیں لائے؟

حضرت عمیرؓ: نہیں!

حضرت عمرؓ خوشی سے جھوم اٹھے اور پکار کر کہا: ''عمیرؓ کی ذمہ داری کی آئندہ عرصہ کے لیے تجدید کر دو۔''

حضرت عمیرؓ نے بڑی شانِ بے نیازی میں کہا: یہ تو دن ہیں جو گزر گئے۔ میں نے یہ کام آپ کے لیے کیا ہے نہ آپ کے بعد کسی اور کے لیے!''

قارئین کرام! یہ تصویر کوئی مصنوعی منظر نہیں جس کو ہم نے اپنے الفاظ سے رنگین بنا دیا ہو اور نہ کوئی ایسا مکالمہ ہے جس کو ہم نے از خود گھڑ لیا ہو۔ بلکہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جو ایک روز اسلام کے دارالحکومت سرزمین مدینہ میں مشاہدہ کیا گیا جب اسلام تاریخ کے صفحات پر عظیم اور دائمی نقوش رقم کر رہا تھا۔

اللہ اکبر..... یہ عظیم الشان اور فقید المثال انسان کس طرز کے لوگ تھے!

حضرت عمرؓ تمنا کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: ''کاش مجھے عمیرؓ جیسے افراد مل جائیں اور میں مسلمانوں کے امور حکومت میں ان سے مدد لوں۔''

☆☆☆

یہ ہیں حضرت عمیرؓ..... جن کے ساتھیوں نے انھیں ''اپنی ہی طرز کا آدمی'' کا لقب دے رکھا تھا جو سچ اور حق ہی تھا۔ حضرت عمیرؓ ان انسانی کمزوریوں سے مبرا تھے جن کے پیدا ہونے کا سبب ہمارا مادی وجود اور پُر خار زندگی ہوتی ہے۔ جس روز سلطنتِ اسلام کے دارالحکومت سے احکامات جاری ہوئے کہ عمیرؓ گورنری و حکمرانی کا تجربہ کریں تو اس عظیم درویش کی کسی چیز میں اضافہ ہوا تو وہ ان کا زہد و ورع تھا جو مزید چمک اور نکھر گیا۔

جب وہ حمص کے امیر تھے تو انھوں نے ایک مسلمان حکمران کی ذمہ داریوں کا خاکہ اپنے ان الفاظ میں بیان کیا جو وہ اکثر مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے برسرِ منبر کہا کرتے تھے۔

ذرا ملاحظہ فرمائیے:

''خبردار..... اسلام کی حفاظتی دیوار ناقابل شکست ہے اور اس کا دروازہ بڑا مضبوط ہے۔ عدل اسلام کی دیوار اور حق اس کا دروازہ ہے۔ جب دیوار ڈھے جائے گی اور دروازہ ٹوٹ جائے گا تو اسلام مفتوح ہو جائے گا۔ اور اسلام اس وقت تک ناقابل فتح رہے گا جب تک حکمران مضبوط رہے گا۔ اور حکمران کی مضبوطی تلوار چلا کر لوگوں کو قتل کرنے اور کوڑے لگا کر اُن کو سزا دینے سے قائم نہیں ہوتی یہ کام لوگوں کے حق ادا کرنے اور عدل کے ساتھ مواخذہ کرنے سے ہوگا!!''

دنیا کے بہترین معلم، تقویٰ شعاروں کے امام، انسانیت کو زندگی کی سختیوں سے نکال کر اللہ کی رحمت کی طرف لانے والے رہنما و مرشد حضرت محمد صلوٰۃ اللہ علیہ و سلامہ کے اوپر اللہ کی تحیات اور برکات ہوں۔

سلام ہو اس عظیم انسان کے آلِ اَطہار پر!

سلام ہو اس کے اصحابِ اَبرار پر! جس کی تربیت و تعلیم نے ایسے کردار پیدا کیے جو رہتی دنیا تک انسانیت کی رہنمائی کرتے رہیں گے اور اسے حق و صداقت کا درس دیتے رہیں گے!

انٹرویو

تحریر و ملاقات: اختر عباس

پاکستان میری پہلی اور غیر مشروط محبّت ہے

☆ وہ اللہ کا بندہ ساری رات انتظار کرتا رہا کہ یہ شہید ہو تو صبح اس کی ڈیڈ باڈی لے کر اسلام آباد جاؤں

☆ لاپتا لوگوں کا دکھ مجھے اپنی ماں سے ملا ہے

☆ صحافی کی کسی سیاست دان سے دوستی نہیں ہو سکتی
یہ بے نظیر نے مجھے سکھایا

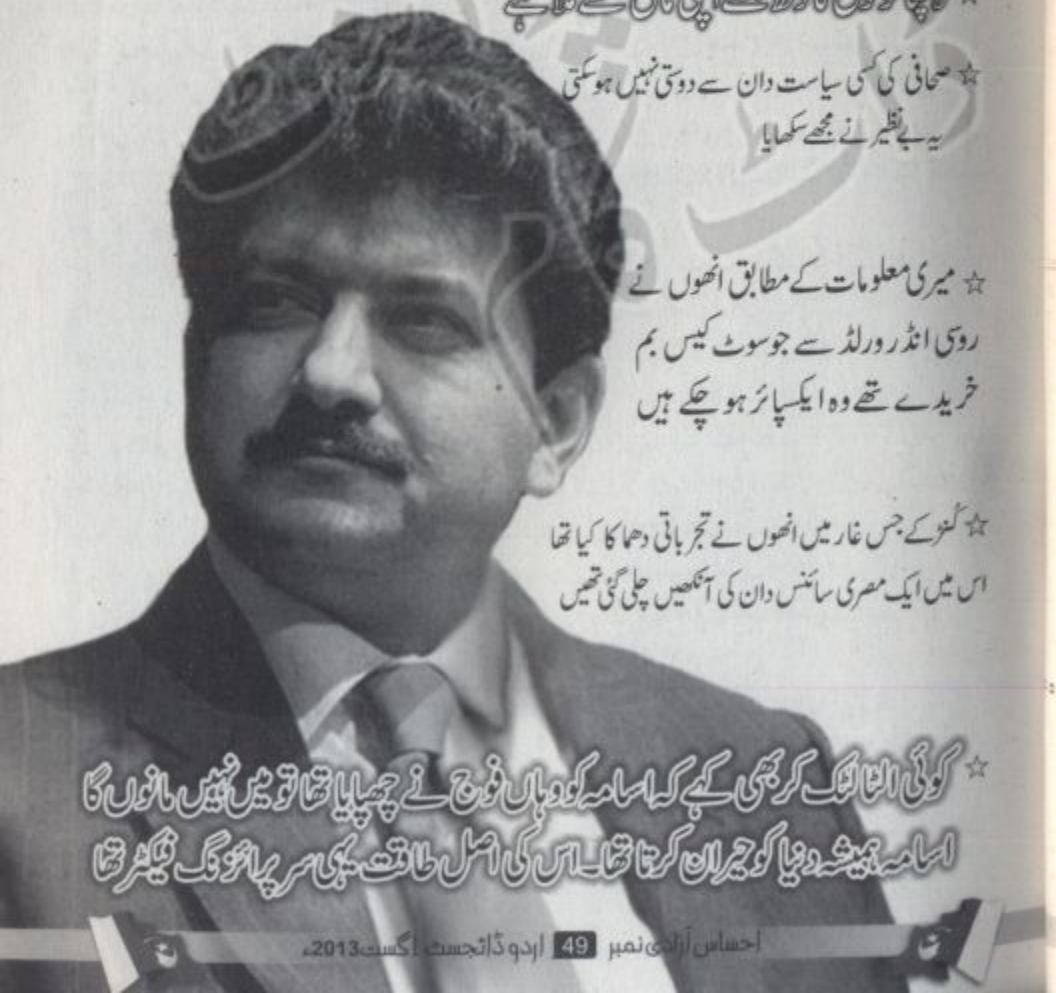

☆ میری معلومات کے مطابق انھوں نے روسی انڈر ورلڈ سے جو سوٹ کیس بم خریدے تھے وہ ایکسپائر ہو چکے ہیں

☆ گنو کے جس غار میں انھوں نے تجرباتی دھماکا کیا تھا اس میں ایک مصری سائنس دان کی آنکھیں چلی گئی تھیں

☆ کوئی الٹا لٹک کر بھی کہے کہ اسامہ کو وہاں فوج نے چھپایا تھا تو میں نہیں مانوں گا
اسامہ ہمیشہ دنیا کو حیران کرتا تھا۔ اس کی اصل طاقت یہی سرپرائزنگ فیکٹر تھا

مقناطیس

ہمیشہ لوہ چون کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہی اس کی قوت اور پہچان ہے۔ حامد میر کو بھی برسوں سے صحافتی حلقوں اور حالات حاضرہ پہ ٹیلی ویژن پروگرام کرنے والوں میں کچھ ایسی ہی حیثیت حاصل ہے۔ مقبولیت اور شہرت کی اس معراج پہ پہنچنے کے پیچھے مسلسل محنت، مواقع، احباب اور اداروں کے کردار کو کم کیے بغیر بھی یہ ایک بڑا سچ ہے کہ اپنے آس پاس ہونے والی گفتگو، ذرا دور ہونے والے واقعات اور کافی دور ہونے والے حادثات کے سگنلز اس تیزی سے اس تک پہنچتے ہیں کہ جیسے عوامی جذبات ہوں۔ اداروں کے بگڑتے تعلقات ہوں، دل دکھانے والے حادثات ہوں، لرزا دینے والے واقعات ہوں سبھی اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ حامد میر ہر جگہ پوری بے خوفی سے یوں کھڑا ہوتا ہے جیسے اسے واقعی ڈر نہیں لگتا۔ بلیک واٹر کی سرگرمیوں پر سب خاموش تھے مگر اس کے پروگرام نے ہلچل مچادی اور امریکی سفیر این میری پیٹرسن کو جیو کو ایک ناراضی بھرا خط لکھنے پر مجبور کردیا تھا۔

شعبہ صحافت گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی جیسے تعلیمی اداروں سے فیض پانے والے حامد میر کے والد ایک استاد ہی نہیں، صحافتی دنیا کے جانے مانے قلم کار بھی تھے۔ ایک عرصے تک دائیں بازو کے لکھنے والوں میں ممتاز تھے۔ پھر روزنامہ نوائے وقت سے علیحدگی اور روزنامہ جنگ سے وابستگی کے بعد بائیں بازو والوں نے انھیں اپنا لیا۔ حامد میر کی صحافتی زندگی میں یہ تقسیم رونما نہیں ہوئی۔ ایک عاقل صحافی کو جن پریشانیوں، مشکلوں اور اذیتوں کے دریا عبور کرنے پڑتے ہیں، حامد میر ان سب سے گزرا ہے۔ اس کا کالم ''قلم کمان'' اس کے لیے عزت اور محبت کماتا رہا اور اس کی دی ہوئی خبریں مشکلیں کھڑی کرتی رہیں۔ 1996ء میں مرتضیٰ بھوتو قتل ہوا تو اس روز اس کا کالم چھپا ''اب کلفٹن کا ایس ایچ او حق نواز سیال بھی نہیں بچے گا'' اور اسی روز وہ قتل کردیا گیا۔ بے نظیر روتی جاتی تھی اور اس سے تفصیل پوچھتی جاتی تھی۔ 2001ء میں اسامہ بن لادن کے انٹرویو کے بعد ISI نے اسے جعلی قرار دینے کے لیے خوب انکوائری کی، اسامہ کے تینوں انٹرویوز کی تردید نہ ہوسکی۔

23 جولائی 1966ء کو لاہور میں پیدا ہونے والے حامد میر 1987ء سے 1994ء تک روزنامہ جنگ لاہور کے رپورٹر اور سب ایڈیٹر رہے۔ دوران ملازمت اپنی تعلیم مکمل کی۔ ایٹمی آب دوزوں کی خریداری کے سکینڈل کی خبر دینے پر انھیں 1994ء میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے شوہر کے حکم پر روزنامہ جنگ لاہور سے نکال دیا گیا۔ روزنامہ پاکستان سے وزیر اعلیٰ پنجاب منظور وٹو کی ناراضی پر لاہور بدر ہونا پڑا۔ 1996ء میں محض 30 سال کی عمر میں وہ پاکستان کے دارالحکومت سے نکلنے والے روزنامہ پاکستان کے ایڈیٹر بن چکے تھے۔ کامیابی کے اس سفر میں یہاں سے پھر وزیر اعظم نواز شریف کی ناراضی نے ایک نئے اخبار کے اجراء کا راستہ دکھایا۔ یوں دسمبر 1997ء میں وہ روزنامہ اوصاف کے بانی ایڈیٹر ٹھہرے۔ 2002ء میں جیو ٹی وی سے وابستہ ہوئے اور کیپٹل ٹاک کے میزبان بنے، جس نے ان کے لیے عزت، شہرت اور بدنامی کے کئی راستے کھول دیے۔ 1996ء سے 98ء تین سال اے پی این ایس نے انھیں بہترین اُردو کالم نگار کے ایوارڈ سے نوازا۔ انھیں بھارت اور بنگلہ دیش کے علاوہ سارک ممالک کا صحافتی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ ان کے کالم بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان کے کئی اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ دنیا کی متعدد اہم شخصیات سے انٹرویوز نے حامد میر کی شخصیت کو نکھار اور سوچ کو وسعت عطا کی ہے۔

اسلام آباد کے سیکٹر ای الیون میں واقع حامد میر کے خوب صورت اور دلکش گھر سے ایک تھکا دینے والا انٹرویو مکمل کر کے نکلے تو میں نے ڈان نیوز کے سہیل، جنھیں راہنمائی کے لیے بطور خاص بلایا تھا، کی طرف دیکھا 'مزہ آگیا'۔ میں کار کی نشست پر نیم دراز ہو کر سوچ رہا تھا۔ حامد اپنے اینکر ہونے سے انکاری، اول و آخر صحافی ہونے پر اصرار کرتا ہے اور اچھا جرنلسٹ بننے کی آرزو کرتا ہے۔ اپنے وطن سے ڈھیروں پیار کرتا ہے۔ ایک ایسا صحافی جس کی دوستیاں سیاسی اور فوجی ایلیٹ سے بڑی گہری ہیں مگر اب اس کے دوست بھی جانتے ہیں کہ صحافی کی دوستیاں ہمیشہ امتحانوں سے گزرتی ہیں۔ آیئے دیکھیے حامد میر کیسے امتحانوں سے گزرا ہے؟

س: 2012ء کا سال اچھا رہا کہ اس میں بہترین اینکر پرسن کا اعلان بھی ہوا اور آپ کو ہلال امتیاز بھی ملا۔ جبکہ اس سے پہلے مستقل کوئی نہ کوئی Controversy چلتی رہی۔ اس لحاظ سے یہ سال پُرسکون نہیں رہا؟

ج: نہیں یہ سال اتنا بھی پُرسکون نہیں تھا دو مرتبہ میری گاڑی میں بم رکھا گیا، ایک مرتبہ دنیا کو پتا چل گیا، دوسری مرتبہ نہیں چلا۔ بم کو باقاعدہ لیپ ٹاپ کے ایک بیگ میں سی کر لگایا گیا تھا۔ وہ بہت عجیب قسم کا تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے والے گھر کے گارڈ نے دیکھا، ڈرائیور گاڑی بیک کر رہا تھا تو اُسے لٹکا ہوا نظر آیا۔

طاہر عالم اس واقعہ کے تفتیشی افسر تھے۔ انھوں نے کافی تفتیش کے بعد ایک دن مجھ سے کہا کہ آپ اپنا ڈرائیور مجھے دے دیں۔ میں نے پوچھا خیریت ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ آپ کے ڈرائیور کے پاس بہت ساری موبائل سمز ہیں، اُن میں سے ایک پر ضرورت سے زیادہ کالز ہوئی ہیں۔ وہ بھی بم والے واقعہ سے دو دن پہلے۔ انھیں اس بات کی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ بندہ اسلام آباد سے باہر جا کر کیوں کالز کرتا رہا ہے۔ میں نے بتایا کہ وہ تو چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ آپ کو کیا بتائیں، جہاں سے وہ کالز کرتا رہا ہے وہ بہت ہی حساس علاقہ (Highly Secured Zone) ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ وہ کون سا علاقہ ہے۔ اس کے بعد اچانک اسے آئی جی نے تفتیش سے علیحدہ کردیا۔ اس پر مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ پھر ایک دن رحمان ملک

یہ دکھ مجھے اپنی ماں سے ملا ہے

میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا میری والدہ مجھے بتایا کرتی تھیں کہ انھوں نے اکتوبر 1947ء میں ہجرت کی تھی۔ وہ جموں سے سیالکوٹ آئے تھے۔ مسلمانوں کو بسوں میں بھر کر سیالکوٹ کی طرف بھیجا گیا۔ راستے میں کٹھوا کے جنگل میں ان بسوں کو روکا گیا اور وہاں پر ڈوگراں فوج اور سکھوں نے روک کر قتل عام شروع کردیا۔ میری جو نانی تھیں، بقول میری والدہ کے، ایک ان کا بھائی گود میں تھا اور ایک چھ سال کا تھا۔ وہ انگلی پکڑ کر چلتا تھا۔ والدہ بتاتی تھیں کہ وہ مردوں اور بچوں کو زیادہ مارتے تھے۔ تو میری والدہ اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کو لے کر Dead Bodies کے نیچے گھس گئیں۔ اور ان سے کہا بولنا نہیں بس لاشوں کے نیچے چھپ جاؤ۔ یہ نانی نے انھیں سمجھایا اور خود وہ اتر کر جنگل کی طرف بھاگ گئیں۔ میری والدہ کہتی ہیں جب وہ جنگل کی طرف بھاگ رہی تھیں تو میں نے بس کی کھڑکی سے دیکھا کہ ان کے پیچھے بندے بھاگ رہے تھے۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ نعشوں سے بھری ہوئی بس کو ڈرائیور جب سیالکوٹ لایا تو بلوچ رجمنٹ نے اس کو Take over کیا، نعشیں نکالیں۔ میری امی اور ان کی دونوں بہنیں جو نعشوں کے نیچے زندہ تھیں انھیں مہاجر کیمپ میں لے گئے۔ میرے جو نانا تھے غلام محمد صاحب، وہ چودھری غلام عباس کی اغوا شدہ بیٹی کو بازیاب کروانے کے لیے لوگوں کا ایک جتھا لے کر نکلے ہوئے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو ان کو پتا چلا کہ ان کا اپنا خاندان تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ پھر وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کیمپ میں پہنچے تو ان کو اپنی تین بچیاں مل گئیں لیکن بیوی نہ مل سکی۔ دیگر مسلمانوں نے مل کر سوچا کہ غلام محمد کی اہلیہ کو کسی طرح واپس لایا جائے۔ پہلے تو پیغامات وغیرہ وہاں بھیجے۔ کوئی شنوائی نہیں ہوئی، پھر انھوں نے یہ کیا کہ سیالکوٹ، نارووال اور ڈسکہ سے جو قافلے انڈیا جاتے تھے انھوں نے ان کی عورتوں کو روکنا شروع کردیا۔

”میری گاڑی میں جو بم لگایا گیا، اُس میں جو ڈیوائس استعمال ہوئی اتنی جدید ڈیوائس آج تک طالبان نے کسی جگہ بھی استعمال نہیں کی“

سے پوچھا کہ بھائی صاف صاف بتائیں کیا مسئلہ ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ جنھوں نے ذمہ داری قبول کی ہے اصل مجرم وہ نہیں ہیں۔ انھوں نے فرمائشی طور پر ذمہ داری قبول کی ہے، آپ بس چھوڑ دیں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اس میں سے اب کچھ نکلے گا تو نہیں لیکن مجھے پتا تو ہو۔ انھوں نے پھر ایک بریفنگ رکھی۔ اس میں آئی جی صاحب نے بریف کیا۔ میں اپنی تسلی کے لیے رانا جواد جو بیورو چیف ہیں انھیں اور ایک دو اور لوگوں کو ساتھ لے گیا۔ اس بریفنگ میں انھوں نے بتایا کہ جو احسان اللہ احسان ہے وہ تو ایک ڈمی سی چیز ہے اور اس کے نمبروں سے ساری کالز 920 سے ہوتی ہیں، اسلام آباد سے اور وہیں سے اس کو کالز جاتی ہیں۔ اور جو Situation انھوں نے بتائی وہ بہت بھیانک تھی۔ وہ یہ کہ ہمارے کسی ریاستی ادارے کا کام ہے۔ جو ڈیوائسز (Devices) انھوں نے استعمال کی تھیں، اتنی جدید ڈیوائس آج تک طالبان نے کسی بھی جگہ استعمال نہیں کی ہیں۔ اس بم کا جو ٹریگر (Trigger)

ان عورتوں کو سیالکوٹ میں ایک بڑی سی حویلی میں لاکر بند کردیتے تھے۔ ان کا خیال رکھتے اور ان میں سے کسی ایک ہندو عورت کو نکالتے بارڈر پر لے جا کر ان سے کہتے تھے اس کا فلاں نام ہے باپ کا فلاں نام ہے۔ یہ لے لو اور دس مسلمان عورتیں دے دو۔ وہاں وہ بارٹر کرتے تھے۔ ایک ہندو عورت دی اور دس مسلمان عورتیں لیں۔ اب جب یہ کام شروع ہوا تو میرے نانا بتایا کرتے تھے کہ میرے پاس گمشدہ مسلمان عورتوں کی اتنی لمبی لسٹ آگئی۔ میں نے دس کی بجائے 30 عورتیں لینا شروع کردیں۔ 150 ہندو عورتوں کے بدلے میں چار ہزار سے زائد مسلمان عورتیں واپس لیں۔ ان کا خیال تھا اس میں میری بیوی بھی آجائے گی لیکن وہ نہیں آئی۔ میری والدہ ہمیشہ دکھ کا اظہار کرتی تھیں۔ جب بھی پاکستان کے بارے میں بری خبر ملتی وہ شدت سے رونے لگتیں۔ میں ان سے پوچھتا کہ آپ کیوں رو رہی ہیں، تو کہتیں بیٹا میں اپنی ماں کو رو رہی ہوں۔ میں بہت چھوٹا تھا جب 1971ء کا سانحہ ہوا۔ تو میری والدہ بہت روئی تھیں۔ انھوں نے کئی دن تک گھر میں کھانا نہیں بنایا تھا۔ مجھے یاد ہے میرے والد صاحب کا ایک بنگالی اسٹوڈنٹ ہوتا تھا۔ شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی میں وہ پڑھتا تھا۔ ان دنوں اتنی نفرت تھی کہ میرے والد نے اسے لاکر اپنے گھر میں چھپا دیا۔ حالانکہ اس کا تعلق بھی اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ تھا۔ میری والدہ اس کا خیال رکھتیں، اسے کھانا کھلاتیں۔ جب وہ جا رہا تھا تو بہت رویا اور کہا کہ ماں جی آپ کی فوج نے ہمارا بھائی نہیں قتل کیا۔ آپ نے ہمارے لیے روٹی پکایا۔ ہمیں ادھر کھانا کھلایا ہم آپ کا بہت شکر گزار ہے۔ ہم اپنی ماں کو جا کر کہے گا کہ وہ آپ کو دعا دے۔ اس پر مجھے یاد ہے کہ میری والدہ نے کہا تھا کہ تم اپنی ماں سے کہنا وہ دعا کرے کہ مجھے میری ماں مل جائے۔ 1947ء سے لے کر 1971ء تک میری ماں کو اپنی ماں کا انتظار تھا۔ جب میں 2001ء میں پہلی مرتبہ انڈیا گیا پرویز مشرف کے ساتھ آگرہ مذاکرات کے لیے تو میں نے وہاں جا کر بڑی کوشش کی کہ 1947ء کی لاپتا عورتوں کے بارے میں کچھ معلومات مل جائیں۔ آپ دیکھتے ہوں گے میں لاپتا لوگوں کے بارے میں بہت Concerned ہوں۔ تو یہ دکھ دراصل مجھے اپنی ماں سے ملا۔

جب بمباری شروع ہوئی تو ہم سب گاڑیوں سے نکل کر زمین پر لیٹ گئے میں نے کہا۔ ”عزیز! اپنے سر کی فکر نہ کرنا بس کیمرہ بچا کر رکھنا۔“

تھا اسے انھوں نے موبائل فون کے ساتھ جوڑ رکھا تھا، وہ ریموٹ ڈرون کا تھا جو طالبان کے پاس ہو ہی نہیں سکتا۔ اب چونکہ میں ٹیکنالوجی کے بارے میں اتنا جانتا نہیں تھا تو میں نے کہا کہ یہ کون سا ڈرون ہے، ہمارے پاس تو ڈرون ہے ہی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہمارے پاس ڈرون نہیں ہے؟ میں بضد تھا کہ ثبوت پیش کریں۔ ایک دن میرے پاس SSP نے ایک بندہ بھیجا اور مجھے فاطمہ جناح پارک میں لے گئے۔ وہاں کچھ نوجوان آفیسر بڑے بڑے ڈرونز کو ریموٹ سے اُڑا رہے تھے، اِدھر اُدھر گھما رہے تھے۔ میں دور کھڑا دیکھتا رہا۔ ہمارے پاس ڈرون تو ہیں لیکن اتنے جدید نہیں ہیں۔

س: پورے ملک میں ایجنسیوں کے بارے میں

اپنے سر کی فکر نہ کرنا کیمرہ بچا کر رکھنا

میرے ادارے نے مجھے یہ کہا کہ آپ کو افغانستان کا تجربہ ہے آپ اب بغداد جا کر دکھائیں تو جناب ہم چلے گئے۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ جب میں اُردن پہنچا تو اُردن میں جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں مجھے بی بی سی کی Lyse Doucet مل گئی۔ وہ بھی وہاں منصوبہ بنا رہی تھی کہ بغداد کیسے جایا جائے؟ تو میں نے اسے بتایا کہ میں نے بھی بغداد جانا ہے اب اس کا خیال تھا کہ میرے ادھر Millitants کے ساتھ بڑے تعلقات ہیں، جبکہ میں اس کے متعلق یہی بات سوچ رہا تھا۔ بی بی سی کا قافلہ بہت بڑا تھا، اس قافلے میں ہماری بھی ایک گاڑی شامل ہوگئی۔ ہمارے پاس کوئی پرمٹ نہیں تھا۔ بی بی سی کے قافلے میں ہم بھی گھس گئے۔ اب Lyse مجھے پوچھتی ہے کہ کدھر سے کدھر جانا ہے؟ میں نے نقشے وغیرہ تو دیکھے ہوئے تھے اور تگے لگا رہا تھا کہ ادھر چلے جائیں اُدھر چلے جائیں۔ وہ مجھے بار بار پوچھتی:

Are you in contact with the sources.

میں کہتا! Yes, you don't worry.

ایک جگہ پر بمباری شروع ہوگئی۔ سب گاڑیوں سے نکل کر زمین پر لیٹ گئے۔ میرے ساتھ کیمرہ مین تھا عزیز، مجھے ابھی تک یاد ہے۔ میں نے کہا تھا۔ عزیز! اپنے سر کی فکر نہ کرنا بس کیمرے کو بچا کر رکھنا۔ کسی طریقے سے ہم بغداد پہنچ گئے، فلسطین ہوٹل میں جا کر ہم نے ڈیرے جمائے۔ ویڈیو لنک کے ساتھ یہاں سے فوٹیج بھیجی۔ اس وقت جیو نیا نیا آیا تھا۔ یہ پاکستانی ناظرین کے لیے پہلا تجربہ تھا کہ پاکستانی صحافی عراق میں جا کر لائیو رپورٹنگ کر رہا ہے اور فلسطین ہوٹل کی چھت پر کھڑے ہو کر BBC کی Lyse Doucet اور CNN کی Christiane Amanpiur کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔ اب وہ Christiane تھوڑی دیر بعد CNN پر آئی تھی، Lyse، بی بی سی پر آئی تھی۔ وہ دونوں میرے ساتھ جیو پر بھی نظر آئیں۔ ایک دم سے بہت زیادہ Boost ملا۔

اتنا کھل کر نہ کوئی بولا نہ اتنا بولڈ کسی نے لکھا۔ جتنا آپ نے لکھا ہے۔ کیا وجہ ہے اس بے خوفی کی؟

ج: دراصل یہ ایجنسیوں کے بارے میں نہیں ہوتا بلکہ یہ ان سے منسلک کچھ ایسے معاملات ہیں۔ جیسے گمشدہ افراد (Missing Persons) کا مسئلہ ہے، بلوچستان کا معاملہ ہے، پھر ہمارے کچھ صحافی ہیں ان کے ساتھ جو بھی ہوتا ہے اس میں بھی وہی ملوث ہوتے ہیں۔

س: الیکشن ٹرانسمشن کے دوران بھی آپ نے بار بار کہا، جب اختر مینگل کا رزلٹ روکا گیا تھا اس پر کوئی اور بندہ کیوں نہیں بولتا؟

ج: ویسے زیادہ بہتر ہے کہ یہ آپ ان سے پوچھیں جو نہیں بولتے۔

س: آپ کو بار بار دھمکیاں بھی ملتی رہیں ایک مرتبہ میجر جنرل شوکت سلطان نے آپ کو غدار (ٹریٹر) بھی کہا تھا؟

ج: اختر عباس! آپ ذرا خود سوچیں کہ اس نے مجھے غدار (ٹریٹر) کیوں کہا تھا؟ 2005ء میں جب

لبنان میں حضرت یونسؑ کی دعا نے بچالیا

لبنان میں میں نے سارے تین ہفتے گزارے تھے۔ اس میں میں نے سیکھا بھی لیکن بہت مشکل حالات تھے۔ مجھے یاد ہے ایک فوٹو گرافر تھی بڑی دلیر عورت تھی وہاں کی لوکل تھی لیلیٰ اس کا نام تھا۔ میرا اور لیلیٰ کا مقابلہ ہوتا تھا، میرے ساتھ کیمرہ مین تھا شبیر۔ جب حزب اللہ کے ہیڈ کوارٹر پر بمباری ہوتی تھی تو ہم قریب سے قریب تر جا کر شوٹ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم جیٹ طیاروں کی بمباری شوٹ کرتے تھے ایک دن یہ ہوا کہ اسرائیل کا ہیلی کاپٹر آگیا۔ شہر سے تھوڑا باہر تھے۔ لیلیٰ ان کے بالکل قریب چلی گئی اور میں اس کو ذرا فاصلے سے دیکھ رہا تھا۔ تقریباً 8,9 سو گز کے فاصلے پر میں تھا۔ انھوں نے اس پر میزائیل فائر کردیا۔ اس کا کچھ بھی نہیں بچا۔ ابھی تک اس کی شکل اور اس دن کا منظر رات کو نیند میں مجھے ہڑبڑا دیتا ہے۔ اس واقعہ کے چند گھنٹوں بعد حزب اللہ نے ہمیں پکڑ لیا، انھوں نے اس لیے پکڑا کہ جب بمباری ہوتی ہے تو لوگ مورچوں میں چھپ جاتے ہیں اور تم لوگ باہر آجاتے ہو۔ ہم نے کہا ہمیں اسے شوٹ کرنا ہوتا ہے۔ کہنے لگے تم لوگ یا تو بے وقوف ہو یا پھر جاسوس ہو۔ ہم تمھاری انکوائری کریں گے۔ وہ ہمیں ایک بلڈنگ میں لے گئے۔ پانچ چھ منزلہ عمارت کے تہہ خانے میں ہمیں لے جا کر بند کردیا۔ اب اس جیل میں ایک صاحب آگئے انھوں نے ہماری تفتیش کرنا شروع کی۔ پوچھا کدھر سے آئے ہو؟ ہم نے بتایا پاکستان سے تو کہنے لگا ابا کستانی!

Now,I can understand why are you So crazy.

یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ بمباری شروع ہوگئی، جب بم گرتا تھا تو پوری بلڈنگ ہل جاتی تھی۔ میں نے حضرت یونسؑ والی دعا پڑھنی شروع کردی۔ اور شبیر غش کھا کر گر پڑا کہ اب تو گئے۔ اس نے چیخ و پکار شروع کردی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلے گئے تو وہ بندہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا تم کیا پڑھ رہے تھے میں نے کہا میں یہ دعا پڑھ رہا تھا۔ حضرت یونس علیہ اسلام نے مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کے لیے پڑھی تھی۔ کہتا یہ تمھیں کس نے سکھائی ہے؟ میں نے کہا مجھے نہیں یاد کس نے سکھائی ہے لیکن یہ میں نے افغانستان میں بھی پڑھی تھی، عراق میں بھی پڑھی تھی اور اب میں نے ادھر لبنان میں مشکل وقت دیکھ کر پڑھی ہے۔ اس نے کہا اچھا اب جاؤ تم، اسے یقین ہوگیا کہ یہ آدمی پاگل ہے۔ یوں اس دعا نے مجھے یہاں بھی بچالیا۔

”صبح کے وقت افغانی مجھے زندہ دیکھ کر بہت مایوس ہوا اور میرے پیسے واپس کردیے“

زلزلہ آیا تھا تو اس میں ساری امداد آرمی کے ذریعے تقسیم ہو رہی تھی، ہوا یہ کہ سمیحہ راحیل قاضی نے مجھے کہا کہ مظفر آباد کے قریب ایک علاقہ ہے پٹیکا، یہاں پر بچیوں کا اسکول ہے اور اسکول گرا ہوا ہے، ان بچیوں کے گھروں تک ابھی تک امداد نہیں پہنچی، آپ ذرا ادھر جائیں۔ اس پر قاضی حسین احمد نے بھی فون کردیا۔ میں نے اسی وقت کیمرہ مین ساتھ لیا اور وہاں چلا گیا۔ جب وہاں پہنچا تو مجھے کئی علاقے اور بھی ملے جہاں کوئی بندہ ہی نہیں پہنچا تھا۔ لوگ ویسے ہی بے یار و مددگار بیٹھے تھے۔ جب ہم نے پٹیکا کے علاقے کے سارے مسائل پیش کیے۔ تو پرویز مشرف ناراض ہوگئے اور انھوں نے مجھے بلا کر بہت جلی کٹی سنائیں۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی۔ اس واقعہ کی وجہ سے جماعت الدعوۃ کے ساتھ ڈاکٹر عامر عزیز صاحب میرے پاس آگئے اور بتایا کہ وادی نیلم کے قریب ایک گاؤں ہے گجو خواجہ وہاں پر اکتوبر سے دسمبر کے دوران یعنی پچھلے تین ماہ سے کوئی امدادی کارروائی نہیں کی گئی۔ میں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں کیونکہ یہ گاؤں کافی بلندی پر ہے جبکہ پٹیکا نیچے ہے وہاں میں گیا ہوں اور وہاں امداد پہنچی ہے۔ کہنے لگے ہاں پٹیکا میں آپ کے جانے سے پہنچی ہے لیکن اوپر نہیں گئی اور جب آپ گجو خواجہ پہنچیں گے تو وہاں سے آپ کو بہت سارے گاؤں مزید نظر آ گے۔ وہ سارے گاؤں مفلوک الحال ہیں اور امداد کے منتظر ہیں پھر جب ہم وہاں ٹچر پر بیٹھ کر پہنچے تو بالکل وہی صورتِ حال تھی۔ گاؤں کے سارے لوگوں سے بات چیت کی۔ اور جب وہ پروگرام چل رہا تھا تو اس دوران پرویز مشرف نے

ڈیڈ باڈی پہنچانے کے پیسے

ایک دن وہ مجھے بگرام کی طرف لے گئے۔ ادھر بہت بری حالت تھی۔ شدید قسم کی جنگ چل رہی تھی۔ اس رات کو مجھے لگ رہا تھا اب تو معاملہ ختم۔ میں نے اپنی اہلیہ کو خط تحریر کیا کہ میں بہت معذرت خواہ ہوں کہ میں آپ کو بتائے بغیر افغانستان آگیا۔ انھیں میں نے بتایا تھا کہ پشاور تک جا رہا ہوں۔ ایک بدر شاہ کا طالبان تھا اس کے ساتھ میں نے معاملہ طے کیا کہ اگر میں مارا جاؤں تو میری میت اسلام آباد لے جانا۔ اس نے کہا بالکل لے جاؤں گا لیکن کتنے پیسے دو گے؟ میرے پاس پیسے کم تھے اور وہ زیادہ پیسے مانگ رہا تھا، میں نے کہا باقی پیسے تم گھر والوں سے لے لینا۔ خط بھی میں نے لکھ کر اس کو دے دیا۔ وہ اللہ کا بندہ ساری رات انتظار کرتا رہا کہ یہ شہید ہو اور صبح میں اس کی میت لے کر اسلام آباد جاؤں۔ صبح ہوئی، ہم نے فجر کی نماز پڑھی۔ اس رات بہت بمباری ہوئی تھی وہاں، لیکن ہم بچ گئے۔ صبح جب ہم اس چھوٹے سے مکان سے باہر آئے جہاں ہم رات کو ٹھہرے تھے تو وہ بندہ مجھے دیکھ کر بہت مایوس ہوا۔ اسی مایوسی کی حالت میں میرے پاس آیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور کہنے لگا۔ ”یہ آپ کے دس ہزار روپے ہیں۔ کیونکہ آپ زندہ ہیں اور اب مجھے اپنا بھی نہیں پتا۔ میں نے طے کیا تھا کہ اگر تم شہید ہو جاتے تو آج واپس اسلام آباد نکل جاتا لیکن اب چونکہ تم زندہ ہو اس لیے اب میں نے سوچا ہے کہ میں بھی کہیں آگے جاؤں۔“ اس نے مجھے پیسے واپس کردیے۔

”یہاں پر آپ کو ڈالر کے بدلے میں پاکستانی نوٹ ملتا ہے اور اس پر قائداعظم کی تصویر بنی ہوتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ آزادی کی کیا اہمیت ہے“

ٹیلی فون پر بکواس شروع کردی اور پھر یہ ہوا کہ ایک کور کمانڈر کا فون آگیا کہ آپ کا یہ پروگرام مشرف صاحب دیکھ رہے ہیں، آپ ذرا تیار رہیں ہوسکتا ہے صبح وہ آپ کو بلالیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو آپ دکھا رہے ہیں یہ سب ڈراما ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ تین ماہ بعد بھی وہاں امداد نہ پہنچی ہو۔ میں نے کہا کہ یہ ڈراما نہیں ہے آپ چاہیں تو اس کی انکوائری کرسکتے ہیں۔ اگلے دن صبح صبح مجھے پی ٹی وی کے متین حیدر کا فون آیا (وہ لڑکا اب Dawn میں کام کرتا ہے) کہ DGISPR نے فوری طور پر اسے بلایا ہے۔ ہم لوگ ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر گجو خواجہ جارہے ہیں اور سکرپٹ سارا انھوں نے مجھے دے دیا ہے۔ وہاں میں نے آپ کی سرکاری طور پر دھجیاں اُڑا دینی ہیں۔ آپ ناراض نہ ہونا کیونکہ میری مجبوری ہے۔ اسی لیے میں جانے سے پہلے آپ کو بتا رہا ہوں۔ میں نے کہا تم فون پر نہ کرو یہ بات، کوئی مسئلہ نہیں، جاؤ تم اور اپنا کام کرو۔

اب جناب یہ ہوا کہ پی ٹی وی پر وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل احسن سلیم حیات اور جنرل شوکت سلطان، اس گاؤں میں پھر رہے ہیں۔ ٹی وی میں نظر آرہا ہے کہ اس گاؤں میں امداد بانٹ رہے ہیں تو میں نے کہا ایک گاؤں میں وائس چیف آف آرمی سٹاف خود جاکر امداد بانٹ رہا ہے اور وہ بھی میرے

میرے گھر کے آگے اسرائیل کا ٹینک تو نہیں کھڑا

جب میں بیروت سے واپس پاکستان میں آیا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ میں جنت میں آگیا ہوں۔ وہاں پر آپس میں مسلمان لڑ رہے ہیں لیکن جس طرح اسرائیل ان کو مار رہا ہے اس طریقے سے تو پاکستان میں آپ کو مار نہیں پڑ رہی۔ دوسری بڑی بات یہ ہے کہ پاکستان میں آپ امریکا کو بھی گالی دے سکتے ہیں، اپنی حکومت کو بھی برا کہہ سکتے ہیں۔ وہاں پر آپ یہ کام نہیں کرسکتے۔

اس مرتبہ پاکستان واپس آکر مجھے آزادی کی قدر و اہمیت پتا چلی کہ آزادی کیا چیز ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جب آپ غزہ میں بینک آف فلسطین میں جاکر ڈالر دیتے ہیں تو آپ کو اسرائیلی کرنسی ملتی ہے۔ وہ کرنسی جب آپ وصول کرکے اپنے بٹوے میں ڈالتے ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ غلامی کیا چیز ہے۔ یہاں پر آپ کو ڈالر کے بدلے میں پاکستانی نوٹ ملتا ہے اور اس پر قائداعظم کی تصویر بنی ہوتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ آزادی کی کیا اہمیت ہے۔ پاکستان کے بارے میں لوگ بہت باتیں کرتے ہیں کہ یہاں حالات بڑے خراب ہیں۔ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بھی بہت باتیں کرتے ہیں۔ لیکن کم از کم پاکستان فلسطین سے تو سو درجے بہتر ہے۔ پاکستان لبنان سے ہزار درجے بہتر ہے۔ پاکستان عراق سے کئی لاکھ گنا درجے بہتر ہے۔ ہمارے صرف حالات خراب ہیں اور ان کو ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے مجھے پچھلے دو تین برسوں میں بہت مواقع ملے، بڑی بڑی آفرز بھی ہوئیں لیکن میں نے ملک نہیں چھوڑا۔ جو بھی ہے جیسا بھی ہے ٹھیک ہے۔ اسرائیل کا ٹینک تو میرے گھر کے باہر نہیں کھڑا، خوف ہے لیکن آزادی کا احساس ابھی بھی برقرار ہے۔ یہ احساس ابھی ختم نہیں ہوا۔

”انکل مشرف کو میرا پیغام دیں کہ یہاں بہت سردی ہے اور میرے پاس جیکٹ بھی نہیں ہے پہننے کے لیے!“

بریک (Break) کرنے پر تو یہ ایک بہت اچھی بات ہوگئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد دیکھتے ہی دیکھتے اس رپورٹر نے پوچھا کہ جی جنرل شوکت سلطان صاحب! تو جنرل صاحب نے کہا کہ یہ دیکھیں ادھر ہم امداد بانٹ رہے ہیں اور حامد میر جھوٹ بولتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم یہاں نہیں پہنچے، دیکھیں ہم تو یہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ اور پھر شام کو واپس آکر احمد قریشی صاحب ایک پروگرام کرتے تھے نیوز نائٹ تو اس پروگرام میں انھوں نے مجھے Traitor قرار دے دیا۔ لیکن اسی رات ایک دوسرے جنرل صاحب نے مجھے کہا جس جذبے (Spirit) کے ساتھ مجھے بھیجا گیا تھا تو مجھے بھی یہی لگا کہ آپ نے دو نمبر پروگرام کیا تھا لیکن وہاں پہنچ کر ہم نے وہ بچہ بھی ڈھونڈا جو کہہ رہا تھا کہ انکل مشرف کو میرا پیغام دیں کہ یہاں بہت سردی ہے اور میرے

لاہور سے مجھے منظور وٹو نے نکلوایا

خیر یہ بہت متنازع (Controversial) مسئلہ تھا۔ آصف زرداری نے پھر فون کرکے کہا کہ میں اس میں ملوث نہیں ہوں۔ وزیراعظم ہاؤس سے واپس آنے کے دو دن کے بعد مجھے روزنامہ جنگ کے دفتر سے فون آیا۔ نوکری نہ صرف بحال ہوئی بلکہ پروموٹ بھی کردیا گیا۔ جب انھوں نے (Reinstate) بحال کرکے پروموٹ کیا تو میں نے سوچا یہ جینا بھی کوئی جینا ہے، میں نے استعفیٰ دے دیا اور میں روزنامہ پاکستان میں چلا گیا اور وہاں میں نے کالم لکھنا شروع کردیا۔ اس وقت میں اٹھائیس سال کا تھا۔ پھر چند ہفتوں کے دوران وزیراعلیٰ پنجاب منظور وٹو مجھ سے ناراض ہوگئے۔ میں نے کالم لکھ دیا تھا ”جو میں نے دیکھا“ ”قلم کمان“ اس آرٹیکل میں میں نے لکھا کہ منظور وٹو سیاسی انتقام لینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے کہنے پر لاہور میں رینگل چوک میں جاوید ہاشمی کو دس بارہ پولیس والوں نے اکیلے گھیر کر زمین پر لٹا کر مارا تھا۔ میں نے جب انھیں بچانے کی کوشش کی تو مجھے بھی مارا۔ میں نے لکھ دیا کہ یہ ہوا ہے جاوید ہاشمی کے ساتھ، تو وٹو نے اکبر علی بھٹی جو روزنامہ پاکستان کے چیف ایڈیٹر تھے کو فون کیا اور کہا کہ اس کو نوکری سے نکالو۔ بھٹی صاحب نے مجھے بلالیا اور کہا کہ میں بہت بری طرح سے پھنس گیا ہوں۔ وٹو صاحب کہتے ہیں کہ تمھیں نوکری سے نکال دوں۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ میں نے کہا سر اگر نکالنا ہے تو نکال دیں، پریشانی کیا ہے؟ کہنے لگے یار میں تمھیں نکال تو نہیں سکتا، لوگ تمھارا کالم بہت پسند کرتے ہیں اور اگر تم نے کسی اور اخبار میں جاکر لکھ دیا کہ میں نے تمھیں وٹو کے کہنے پر نکالا ہے تو میری کیا عزت رہ جائے گی؟ میں نے کہا سر آپ مجھے اسلام آباد ٹرانسفر کردیں، یوں وٹو صاحب کی بات بھی رہ جائے گی، اس طرح وٹو صاحب نے مجھے اسلام آباد ٹرانسفر کروادیا۔ اسلام آباد میں میرے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ایک رات ایک دوست کی طرف اور اگلی رات کسی دوسرے کی طرف۔ خیر کرتے کرتے ایک سال گزر گیا۔

”طالبان اور القاعدہ کے مجاہدین تہجد پڑھتے اور شہادت کی دعا مانگتے اور مجھے کہتے تم بھی ہماری شہادت کی دعا مانگو“

پاس ایک جیکٹ بھی نہیں ہے پہننے کے لیے۔ ہم نے اسے ڈھونڈا اور پوچھا کہ تمھیں یہ فقرہ کس نے سکھایا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے تو کسی نے نہیں سکھایا تھا۔ وہ ایک آدمی تھا اس کے پاس مائیک تھا۔ جب زلزلہ نہیں آیا تھا تب جیوٹی وی ہمارے گھر پر آتا تھا۔ میں نے وہ مائیک دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ تو ٹی وی والا ہے۔ میں اس بندے کو تو نہیں پہچانتا میں نے تو صرف انکل مشرف کو پیغام دیا تھا اور دیکھو لو میرے پاس ابھی بھی جیکٹ نہیں ہے۔ احسن سلیم حیات کہتے ہیں میں نے پھر اپنی جیکٹ اس بچے کو دے دی اور پھر میں نے اللہ سے معافی مانگی۔ اب ہوتا کیا ہے کہ جب فوج کا ترجمان، آپ کو پی ٹی وی پر غدار (Traitor) کہہ دے تو پھر یہ ہوتا ہے کہ جتنے بھی دشمن ہوتے ہیں، ان کو شہ ملتی ہے۔ پھر وہ آپ کے خلاف محاذ کھول لیتے ہیں۔ تو اس وقت سے یہ کام شروع ہوا۔

س: جب 2007ء میں آپ پر دفتر میں حملہ ہوا تھا، تب جسٹس افتخار چوہدری کی بحالی کا مسئلہ چل رہا تھا۔ اس حملہ کے بعد شام کو پرویز مشرف نے آپ سے معذرت کیوں کی تھی؟

ج: جنرل احسن سلیم حیات تو بڑا شریف آدمی تھا۔ اس نے تو آف دی ریکارڈ معذرت کی تھی لیکن مشرف نے تو قوم کے سامنے معذرت کی تھی۔ جس وقت وہ معافی مانگ رہا تھا جنرل گلزار کیانی سادہ کپڑوں میں اسی شام میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا اعتبار نہ کرنا اس نے اگر معافی مانگی ہے تو اب یہ تمھیں چھوڑے گا نہیں۔ یہ اس کا پرانا طریقہ کار ہے۔ یہ کمانڈو ہے، یہ

س: کابل میں تو تب بڑی بمباری ہو رہی تھی اور آپ شیخ کا انٹرویو کرنے نکل کھڑے ہوئے؟

ج: مولوی یونس خالص کے لوگوں نے مجھے بڑے گول مول طریقے سے کہا کہ اگر تم چاہو تو بڑے شیخ سے بھی تمھاری ملاقات ہو سکتی ہے۔ میں نے کہا ہاں، کیوں نہیں! تو کہنے لگے اس کے لیے آپ کو کابل سے بھی آگے جانا پڑے گا۔ انھوں نے ایک ایمبولینس میں مجھے اسٹریچر پر لٹایا اور ایمبولینس آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جلال آباد سے کابل پہنچ گئی۔ وہاں پر مختلف ٹھکانے تبدیل ہو رہے تھے۔ روزانہ رات کو بمباری ہوتی تھی۔ روزانہ رات کو میرے سامنے موت کا رقص ہوتا تھا۔ اور روزانہ رات کو میں دیکھتا تھا کہ طالبان اور القاعدہ کے مجاہدین تہجد پڑھتے اور شہادت کی دعا مانگتے اور مجھے کہتے تم بھی ہماری شہادت کی دعا مانگو۔ میں حیران کن نظروں سے اُن کو دیکھتا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ وہ مجھے پوچھتے تم نے ہماری شہادت کی دعا مانگی ہے اور میں نہیں مانگتا تھا، مجھے یہ عجیب سا لگتا تھا کہ دعا مانگوں کہ یا اللہ میرے سامنے جو بندہ بیٹھا ہے وہ شہید ہو جائے۔ میں دنیا دار آدمی ہوں اور بطور صحافی مجھے یہ سب بہت عجیب لگتا تھا..... وہ کہتے تھے کہ ہم بہت گناہ گار ہیں اسی لیے ابھی تک زندہ ہیں اور میں اُن سے کہتا تھا کہ اُسامہ بن لادن سے میری ملاقات کروا کر شہید ہونا تم۔

میں نے کہا۔ ”بی بی پھر میں اس کتاب میں وہ سارا قصہ لکھوں گا کہ آپ کی اس سے شادی کس طرح ہوئی۔“

ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے، دھوکا دیتا ہے۔ اس نے تم سے معافی مانگی ہے اب اس سے بچ کے رہنا۔

س: آپ نے زرداری صاحب کی ناراضی بھی سہی پہلے زمانے میں مگر دوستی بھی رہی۔ ان سے تو بچ کر نہیں رہے؟

ج: نہیں، دونوں زمانوں میں ہی سہی ہے۔ پہلے میں نسبتاً کم۔ پہلے 1994ء میں تو انھوں نے مجھے نوکری سے نکلوایا تھا، اس کے بعد 1996ء میں ان کی گورنمنٹ ختم ہوئی۔ وہ پکڑے گئے، جیل میں چلے گئے تو بے نظیر بھٹو صاحبہ میرے سامنے رویا کرتی تھی کہ میرے ساتھ یہ زیادتی ہوگئی۔ وہ مجھے کہتی تھیں کہ تم اس پر کتاب لکھو۔ میں نے کہا میں کیوں لکھوں کتاب! میں تو نہیں لکھوں گا۔ وہ کہتی تھی کہ میں تمھیں بتاؤں گی کہ کتاب میں کیا لکھنا ہے۔ میں نے کہا بی بی پھر میں اس کتاب میں وہ سارا قصہ لکھوں گا کہ آپ کی اس سے شادی کس طرح ہوئی۔ دراصل وہ بات کچھ اس طرح ہے کہ میرے والد مرحوم کا بھی کچھ کردار تھا۔ یوں کہ PPP کے جو سینیئر بابے تھے جیسے راؤ رشید، اشرف عباسی یہ سب چاہتے تھے کہ بے نظیر بھٹو شادی کر لے، خود تو ان میں کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ پہلے انھوں نے ارشاد حقانی صاحب کو کہا کہ وہ بات کریں۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ اب اس میں مسئلہ یہ تھا کہ فیصل صالح حیات صاحب امیدوار تھے شادی کے لیے۔ تو فیصل صالح حیات بھی آئے میرے والد صاحب کے پاس اور کہا کہ وہ بھٹو صاحب سے بات کریں۔ ان کا معاملہ یہ تھا کہ انھوں نے 1978ء سے 1980ء تک دو سال M-Phill کے سلسلے میں لندن میں گزارے ہوئے تھے۔ ایم فل کا صرف بہانہ تھا وہ ضیاء الحق کی ناراضی کی وجہ سے چلے گئے تھے۔ دو سال کے لیے اور پھر وہاں تعلیم شروع کر دی۔ وہیں پہ بے نظیر بھٹو سے ان کی جان پہچان ہوگئی تو بے نظیر بھٹو کو وہ بہت پسند کرتے تھے۔ وہ ان

اب میں رشیا نہیں جا سکتا

چیچنیا میں مجھے روسی فوج نے گرفتار کر کے بند کر دیا تھا۔ وہاں میرے ساتھ بہت زیادتی کی تھی انھوں نے۔ میں وہاں صرف دو دن رہا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے گروزنی (Grozny) بدر کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے میرا روس میں داخلہ بند کر دیا۔ ہوا یہ کہ چیچنیا سے واپس آ کر میں نے جو پروگرام چلایا تھا۔ اس پروگرام میں میں نے روسی صدر پیوٹن کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے کس طرح گروزنی شہر پورے کا پورا تباہ کیا۔ انھوں نے وہاں پر قتل عام کیا اور سیکڑوں ہزاروں کو نہیں لاکھوں مسلمانوں کو ذبح کیا۔ ندی نالے ان کی نعشوں سے بھر دیے۔ وہاں پر آپ کو مسلمانوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں ڈھیروں میں ملیں گی۔ اس ظلم کو ابھی تک کسی نے بے نقاب نہیں کیا کیونکہ مغربی میڈیا کی وہاں تک رسائی (Access) ہی نہیں ہے۔

میرے والد نے کہا۔ ”آپ شادی کریں تو کسی روایتی قسم کے سندھی فیوڈل سے جس کی بڑی بڑی مونچھیں ہوں اور وہ اپنی بیوی کو انا کا مسئلہ بنالے۔“

سے کہتے کہ تم کیا جینز پہن کر پھرتی رہتی ہو، سر پر دوپٹا لیا کرو۔ تمھارے والد صاحب نے تمھیں کیوں کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ وہ کافی ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے والد صاحب سے کہا کہ بے نظیر کو شادی پر راضی کریں۔ بے نظیر کہتیں کہ میری عمر بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ اس وقت وہ تیس برس سے زیادہ کی تھیں۔ پھر دوسری بات یہ تھی کہ وہ کہتی تھیں کہ میری عمر کا کوئی بندہ کنوارا ہے ہی نہیں۔ باتیں تو ٹھیک تھیں۔ لیکن میرے والد صاحب نے پھر اس سے کہا کہ دیکھیں آپ شادی ضرور کریں لیکن کسی شہری بابو سے شادی نہیں کرنی۔ پوچھنے لگیں کہ اس کا کیا مطلب ہے تو انھوں نے کہا کہ فیصل صالح جیسے آدمی سے شادی نہیں کرنی۔ پوچھا وہ کیوں! تو میرے والد نے کہا کہ اس لیے کہ ان کو آپ کی Establishment بڑے اچھے طریقے سے بلیک میل کرسکتی ہے۔ **آپ شادی کریں تو کسی روایتی قسم کے سندھی فیوڈل سے جس کی بڑی بڑی مونچھیں ہوں اور وہ اپنی بیوی کو انا کا مسئلہ بنالے** اور اگر جنرل ضیاء الحق اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کرے تو وہ کھڑا ہوجائے۔ اگر تم نے بہت پڑھے لکھے، سمجھدار آدمی سے شادی کی تو ماری جاؤ گی۔ کیونکہ بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے پڑھے لکھے لوگ اندر سے بہت کمزور ہوتے ہیں۔ آپ کو ایسا آدمی چاہیے جس کی جاگیردارانہ سوچ ہو۔ لڑنے مرنے والا ہو۔ بیشک جاہل ہو۔ آپ کو صرف شادی کی ضرورت

آپ اپنا بھی تو محاسبہ کرو

جو فوج نے کیا اس کو آپ Justify نہیں کرسکتے۔ چلیں مان لیا فوج نے صحیح نہیں کیا تو جن لوگوں نے فوج کا ساتھ دیا تھا، البدر اور الشمس والوں نے، پھر آپ نے جو ان کے ساتھ کیا ہے، انھوں نے پاکستان کے نام پہ اپنی جانیں قربان کیں اور یحییٰ خان کے دور میں آپ ان کو نہیں لے کر آئے۔ پھر جنرل ضیاء الحق آیا، آپ ان کو لے کر نہیں آئے۔ پھر پرویز مشرف ادھر آگیا، نو سال حکمران رہا۔ آپ ان کو لے کر ادھر نہیں آئے، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بحیثیت ایک ادارے کے آپ جھوٹے ہیں۔ آپ لوگوں کو اسلام اور پاکستان کے نام پر استعمال کرتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ نے البدر اور الشمس پاکستان کے نام پر بنائی اور پھر انھیں چھوڑ دیا۔ آپ نے حزب اسلامی بنائی، آپ نے احمد شاہ مسعود کی تنظیم بنائی۔ آپ نے طالبان بنائی اور Ditch کیا۔ لوگ کب تک خاموش رہیں گے، آپ اپنا بھی تو محاسبہ کریں۔ ٹھیک ہے 1971ء میں روس اور انڈیا نے سازش کی اور آپ کو ہتھیار پھینکنے پڑے۔ جن لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا آخری وقت تک آپ کی طرف سے لڑتے رہے۔ آپ انھیں کیسے بھول گئے؟ میں جب ڈھاکہ جاتا ہوں تو وہ مجھے بلاتے ہیں، کھانا کھلاتے ہیں۔ بنگلہ دیشی حکومت ناراض ہوتی ہے کہ آپ ان کے پاس کیوں جاتے ہو؟ میں کہتا ہوں اب ان بیچاروں کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ پاکستان تو جا نہیں سکتے اب انھوں نے تمھارے ساتھ رہنا ہے ان کو اپنے ساتھ ملالو۔

ہے پڑھے لکھے شوہر کی نہیں۔ بے نظیر بھٹو نے اس پیمانے کے مطابق آصف زرداری کو کلئیر کر دیا اور یہ پسند بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کی خالہ کی تھی۔ لیکن بی بی اس شادی پر راضی نہیں تھیں۔ آصف زرداری کو بے نظیر بھٹو سے ملوانے کے لیے لندن لے گئے۔ جب ملاقات ہوئی تو بی بی کو زیادہ پسند نہیں آیا۔ بی بی نے کہا کہ ٹھیک ہے گریس فل آدمی ہے لیکن اس کا قد چھوٹا ہے۔ اس دوران بی بی کو ہائیڈ پارک میں واک کرتے ہوئے شہد کی مکھی نے کاٹ لیا تو آصف زرداری نے بڑی خدمت کی ڈاکٹر وغیرہ لے کر آئے۔ بی بی کہتی کہ اس پر میں کافی متاثر ہوگئی۔ اس موقع پر بی بی کے جو سیکرٹری تھے بشیر ریاض صاحب انھوں نے ایک فقرہ بول دیا کہ ”شہد کی ایک مکھی نے پاکستان کی قسمت بدل دی۔“ اس طرح ان کی شادی ہوئی۔ جب بی بی مجھے کہتی کہ کتاب لکھو تو میں کہتا تھا کہ پھر میں یہ ساری باتیں لکھوں گا۔

س: آپ زرداری صاحب سے جیل میں ملنے جاتے تھے بڑا یارانہ تھا تب تو؟

ج: آصف زرداری صاحب کے ساتھ یہ ہوا کہ جب وہ جیل میں تھے تو میں کبھی کبھی ملنے چلا جایا کرتا تھا۔ پھر جب ان کی حکومت آگئی۔ 2008ء میں اور وہ صدر بن گئے تو اسی دوران NA-55 پنڈی والی

یہ حامد میر کی ذمہ داری نہیں

بات یہ ہے ہم ایک کمرشل سوسائٹی میں زندہ ہیں اور ہمارے ٹی وی چینلز Corporate Cutters کا حصہ ہیں۔ اس میں آپ دیکھیں کہ میں چینلز کا مالک تو نہیں ہوں۔ جب سے میں نے پروگرام شروع کیا ہے میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ نوجوانوں کو آگے لے کر آیا جائے۔

ان کے ساتھ یہ ٹرینڈ میں نے ہی شروع کیا کہ طلبہ وطالبات کو ان کے ہی یونیورسٹی ہال میں اکٹھا کر کے ان کے ساتھ پروگرام کیا جائے اور ایک نہیں کئی پروگرام ان کے ساتھ کیے۔ ان کے مسائل ڈسکس (Discuss) کیے۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگوائے۔ میرے پروگرام دیکھ کر بیرون ممالک میں کام کرنے والے نوجوان جب واپس آتے ہیں تو رابطہ کرتے ہیں کہ دو مہینے ہوگئے، چھ مہینے ہوگئے وہاں ہم یہ کرتے تھے یہاں یہ کرتے ہیں۔ آپ کو ہم رپورٹ کر رہے ہیں کہ آپ نے Motivate کیا تو ہم یہاں پر آئے ہیں۔ لیکن یہاں پر ہمارا کوئی والی وارث نہیں۔ نوکری نہیں مل رہی تو واپس چلے جاتے ہیں۔ جس طرح میں میڈیا کی آزادی اور طاقت کو Over Estimate نہیں کرتا اس طرح مجھے بھی لوگوں کو جھوٹی امید نہیں دینی چاہیے، ورغلانا نہیں چاہیے کہ کوئی آدمی میرا پروگرام دیکھ کر امریکا چھوڑ کر پاکستان آجائے اور یہاں آکر اس کے بچے تعلیم بھی نہ حاصل کرسکیں۔ اس طرح میرے ساتھ کئی مرتبہ ہوچکا ہے۔ 2005ء سے لے کر 2013ء کم از کم 9 کیس ایسے ہیں۔ جو چھوڑ کر آگئے اُن میں سے کچھ سیٹ بھی ہوجاتے ہیں مثلاً کینیڈا سے میاں بیوی ڈاکٹر تھے، آئے اور آکر میاں چنوں کے دیہاتی علاقے میں کلینک کھول لیا۔ اپنی طرف سے انھوں نے قربانی دی کہ مقامی لوگوں کی مدد کرسکیں۔ وہاں پہلے تو وہ مطمئن نہیں تھے مگر اب وہ خوش ہیں۔ پاکستان کی یوتھ کے سارے مسائل حل کرنا حامد میر کی ذمہ داری نہیں۔ مسائل حل کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ حامد میر کی ذمہ داری مسائل کی نشاندہی ہے۔

”مجھے آف ائیر کرانے میں 100% آصف زرداری صاحب کا ہاتھ تھا“

سیٹ خالی ہوئی۔ آپ کو یاد ہوگا یہاں سے جاوید ہاشمی صاحب جیتے تھے تو نواز شریف نے یہ سیٹ آفر کی تھی زرداری صاحب کو کہ ادھر سے الیکشن لڑ کر وزیر اعظم بن جائیں۔ تو آصف زرداری صاحب کے دل میں تو کچھ اور ہی تھا۔ ان کا ارادہ تو صدر بننے کا تھا۔ انھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ آپ کے دوست نے مجھے یہ آفر دی ہے۔ میرا ایک مشورہ ہے کہ آپ میرے اور ان کے مشترکہ اُمیدوار (Candidate) کے طور پر اس سیٹ پر الیکشن لڑیں۔ میں نے کہا کہ میں یہ کام نہیں کرسکتا اوّل تو میرے پاس پیسے ہی نہیں ہیں دوسرا مجھے شوق بھی نہیں پھر میرا مزاج بھی ایسا نہیں، میں تو کبھی آپ سے لڑتا جھگڑتا ہوں کبھی خوش ہوجاتا ہوں، میں الیکشن نہیں لڑسکتا۔ اس معذرت کے کچھ عرصہ بعد جب وہ صدر بن چکے تھے تو انھوں نے کہا کہ آپ پی ٹی وی سنبھال لیں۔ میں نے اس پر بھی انکار کیا۔ پھر ایک وقت آیا اور انھوں نے کہا کہ آپ سینیٹر بن جائیں۔ میں نے کہا نہیں جی میں نے سینیٹر بھی نہیں بننا۔ اب مجھے شک یہ پڑتا ہے کہ وہ مجھے منظر سے ہٹانا چاہ رہے تھے اور ان کو یہ ٹاسک ان لوگوں نے دیا تھا جن کی مرضی سے یہ صدر بنے تھے۔ اسی لیے میں ان کی آفرز رَد کرتا رہا۔ پھر جون 2008ء میں جب جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کے لیے ملتان سے اسلام آباد تک لانگ مارچ ہوا تھا تو اس لانگ مارچ کے دوران، میں ایک دم سے آف ائیر ہوگیا۔ اور کہا گیا کہ آف ائیر ہوجائیں ورنہ جیو بند ہوجائے گا۔ اور جیو کو انھوں نے دبئی سے آن ائیر کردیا اور یہاں ہمارا دفتر بند کردیا۔ اس میں 100% آصف زرداری صاحب کا ہاتھ تھا مجھے آف ائیر کرنے میں۔ نومبر 2007ء میں مشرف صاحب نے بھی یہی کیا تھا میرے ساتھ۔ لیکن کوئی بات نہیں یہ چلتا رہتا ہے۔

س: القاعدہ کے بارے میں کہا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے کسی زمانے میں خود بھی ایٹم بم بنانے کی کوشش کی تھی؟

کٹی پہاڑی کے بزرگ کہاں گئے

دو تین سال پہلے کی بات ہے کراچی کا علاقہ ہے کٹی پہاڑی، وہاں پٹھانوں اور مہاجروں کی آپس میں بہت مارا ماری ہورہی تھی۔ ایک دوسرے کے گھروں کو آگ لگا رہے تھے، فسادات کررہے تھے۔ ایم کیو ایم بھی پریشان، اے این پی بھی پریشان۔ میں نے اپنے کیمرہ مین کو لیا، دفتر سے گارڈ کو بھی ساتھ لے لیا اور کٹی پہاڑی میں گھس گیا۔ کوئی میڈیا والا وہاں نہیں جاتا۔ پہلے میں مہاجروں کے علاقے میں گیا، پھر میں پٹھانوں کے علاقوں میں گیا۔ وہاں یہ تھا کہ سڑک کے اس طرف مہاجروں کے تباہ شدہ مکان تھے اور دوسری طرف پٹھانوں کے تھے۔ میں نے باری باری دونوں کی بات سنی۔ بزرگوں کو بلوایا، ان کو گلے ملوایا۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگوائے۔ وہ پروگرام چل گیا تو اچانک کیا ہوا کہ وہ تمام بزرگ جن کی میں نے صلح کروائی تھی انھیں ایک ایک کرکے مار دیا گیا۔ مجھے نہیں پتا کہ کس نے مارا لیکن کیا مجھے یہ پیغام دیا گیا کہ آئندہ وطن دوستی کی ایسی حرکت مت کرنا؟

”طالبان نے روسی انڈر ورلڈ سے جو Made in USSR سوٹ کیس بم خریدے تھے، وہ ایکسپائر ہوچکے ہیں“

ج: میں نے ان سے بار بار یہ اس لیے پوچھا تھا کہ مجھے پتا چلا تھا کہ کُنڑ میں انھوں نے 2000ء میں ایک تجربہ بھی کیا تھا۔ انھوں نے اپنا ایک بم بنایا تھا۔ اس کے تجربے کے لیے بم کو ایک غار میں ڈال کر Explode کیا۔ اس میں ایک مصری سائنس دان کی آنکھیں چلی گئی تھیں۔ اس وجہ سے القاعدہ والے محتاط ہوگئے اور دوبارہ اس کا تجربہ نہیں کیا، ورنہ یہ لوگ نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ یہ طالبان کو نیوکلیئر پاور بنانا چاہ رہے تھے۔ لیکن اب میری معلومات کے مطابق انھوں نے روسی انڈر ورلڈ سے Made in USSR سوٹ کیس بم خریدے تھے، ان کو اب Maintain کرنا مشکل ہے، وہ ایکسپائر ہوچکے ہیں۔ میں یہ بات بہت سے ایکسپرٹس سے رائے لینے کے بعد کہہ رہا ہوں۔ لیکن ابھی بھی ان کے پاس جو یورینیم ہے، وہ انھوں نے یورپ میں اسمگل کرکے چھپادی ہے۔

س: اُسامہ کا فرار ایک بڑی کہانی تھی۔ شاید آپ ہی نے سب سے پہلے کہا تھا اسامہ بن لادن تورا بورا سے شمالی اتحاد کے کسی کمانڈو کی مدد سے فرار ہوا؟

ج: ہاں! یہ ایک بہت بڑی کہانی تھی کہ سُپر پاور نے تورا بورا کے پہاڑوں میں اُسامہ بن لادن کو گھیرا ڈالا ہوا تھا اور وہ وہاں سے بھاگ گیا تو میں نے پورا اس کو ٹریک کیا۔ کیونکہ میں اس علاقے میں پہلے بھی گیا تھا۔ دوبارہ جب میں گیا تو جلال آباد سے چھپری یار گاؤں، پھر اوپر تورا بورا کے پہاڑوں تک لاتعداد لوگوں کے میں نے انٹرویو کیے۔ روایتی طور پر یہ علاقہ گل بدین حکمت یار کے حامیوں کا ہے۔ پھر عرب مجاہدین نے یہاں آکر ٹھکانے بنائے تو انھوں نے یہاں بہت فلاحی کام بھی کیے۔ ان کی عورتیں یہاں کی بچیوں کو قرآن کریم پڑھایا کرتی تھیں، ان کے مرد بچوں کو قرآن کریم پڑھاتے۔ جو ان میں ڈاکٹر تھے وہ چھوٹے چھوٹے کلینک بنا کر بیٹھ گئے۔ پھر لوگوں کو پانی کے چشمے نکال کر دیے۔ پہاڑوں میں مکئی، گندم کیسے اُگانی ہے، یہ سب سکھایا، ان کی لوگ بہت عزت کرتے تھے۔ میں نے وہاں جاکر مکمل چھان بین کی کہ اُسامہ بن لادن بھاگا کیسے؟ یہاں سے پتا چلا کہ اُس نے شمالی اتحاد (Northern Alliance) کا جو کمانڈر تھا حضرت علی، اس پر امریکیوں نے Trust کیا اور آگے بھیجا جب کہ اپنے لوگوں کو پیچھے رکھا۔ حضرت علی نے نا کہ لگوادیا اور جب

اوریا مقبول جان اور وارث میر کا مرغا

س: اوریا مقبول جان نے اپنے ایک کالم میں لکھا کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کے ہوسٹل میں تھے اور انھوں نے آپ کے گھر سے ایک مرغا چرا کر کھایا۔ مگر تب آپ کی تحقیقی رپورٹنگ کام نہ آئی؟

ج: وہ بات ان کی صحیح ہے کہ میری ڈیوٹی لگی تھی کہ میں مُرغا ڈھونڈوں، میں نے مرغا ڈھونڈ لیا تھا اور اس کے پر بھی ڈھونڈ لیے تھے۔ اس کے پر اوریا مقبول جان کے کمرے کے پاس بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے جاکر اپنے والد صاحب (وارث میر) کو بتادیا تھا۔ ان کو پتا بھی چل گیا لیکن انھوں نے نظر انداز کردیا۔ میری رپورٹنگ تب بھی ٹھیک تھی۔

ڈاکٹر ایمن الظواہری نے مجھ سے کہا۔ ”جب آپ 1997ء میں ہمارے پاس آئے تھے تو بہت سادہ تھے، جب 1998ء میں آئے تو چالاک تھے مگر اب تم عیار ہو چکے ہو۔“

القاعدہ والے نیچے سے بھاگ کر اوپر آئے تو ان کے پاس کافی سارے ڈالرز تھے۔ پہلے بھی غاروں میں اُن کے پاس کافی پیسے موجود تھے۔ انھوں نے حضرت علی کو کافی بڑی مقدار میں پیسے دے کر اس سے راستہ لیا۔ وہ پھر وہاں سے شمالی وزیرستان پہنچے۔

س: ایبٹ آباد میں کب پہنچے؟

ج: ایبٹ آباد میں یہ پہنچے ہیں 2006ء کے آخر میں۔

س: آپ کو یقین ہے کہ جو کچھ آپ کو بتایا گیا ویسا ہی ہوا ہوگا؟

ج: اب تک ساری انفارمیشن تو سامنے نہیں آئی۔ لیکن ایبٹ آباد کمیشن نے اس پر بہت تحقیق کی ہے۔ اس میں بھی کافی ساری چیزیں ملیں گی جب وہ سامنے آئے گی۔ لیکن ایک بات میں بتاؤں کہ ایبٹ آباد میں جا کر اُسامہ کا چھپنا عین اس کی فطرت کے مطابق تھا۔ اسلام آباد میں بھی 1980ء میں F7/4 میں چرچ کے ساتھ اس نے گھر کرایہ پر لیا ہوا تھا تاکہ کسی کو شک نہ پڑے۔ وہ اپنے آپ کو genius نہیں Planner کہتا تھا۔

آپ اس کی شخصیت کو 9/11ء یا ایبٹ آباد کے Perspective میں Analyze نہ کریں۔ آپ اس کو جاجی سے شروع کریں۔ جاجی کی جو لڑائی تھی اور ساری دنیا برف باری کے موسم میں افغانستان کے پہاڑوں سے نیچے اُتر آتی ہے اور روایتی طور پر اس موسم میں لڑائی بند ہو جاتی ہے، روسی فوج اپنے بنکروں میں چلی جاتی تھی، افغان مجاہدین اپنے بنکروں میں چلے جاتے تھے، اُسامہ بن لادن نے اس برف کے موسم میں محاذ کھول لیا جو کہ پاگل پن تھا۔ بالکل غیر معمولی کام تھا۔ وہ ہمیشہ دنیا کو حیران کرتا تھا۔ اس کی اصل طاقت اس کا یہی Surprising factor ہوتا تھا۔

تم بہت عیار ہو

جب اُسامہ بن لادن کا انٹرویو ختم ہو گیا اور ہم قہوہ پی رہے تھے تو ڈاکٹر ایمن الظواہری نے یہ کہا کہ ہمارے پاس کچھ اہم ہتھیار ہیں۔ میں نے پوچھا کس طرح ممکن ہے، آپ کے پاس کس طرح آسکتے ہیں؟ تو اس نے کہا 1998ء میں قندھار میں بھی تم نے یہی بحث ہمارے ساتھ کی تھی۔ پھر وہ بولے 1997ء میں تو رابورا میں جب تم ہمارے پاس آئے تھے تو بہت سادہ سے آدمی تھے۔ پھر جب 1998ء میں قندھار میں ہمارے پاس آئے تو بہت چالاک ہو چکے تھے۔ اب تم Crook (عیار) ہو چکے ہو کیونکہ تمہاری یادداشت بہت تیز ہے، تم نے جو سوال 1998ء میں کیے تھے وہی اب ہمارے سامنے دُہرا رہے ہو اور جب تم واپس جاؤ گے تو تم اس کا تجزیہ کرو گے کہ جب میں نے 1998ء میں پوچھا تو انھوں نے یہ کہا اور جب 2001ء میں پوچھا تو یہ کہا۔ اور پھر ڈاکٹر الظواہری نے کہا ?Am I right میں نے کہا۔ Yes: You are Right

غذائی خبرنامہ

کچی یا پکی...
کون سی سبزیاں بہتر؟

ڈاکٹر شائستہ خان

صحت کے لیے کون سی سبزیاں زیادہ مفید ہیں

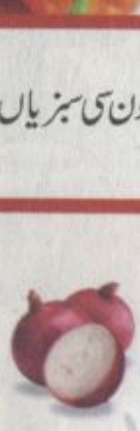

سبزیاں انسان کو بھرپور غذائیت فراہم کرتی ہیں۔ بہت سی سبزیاں کچی یا پکا کر کھائی جاتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ سبزیاں کچی کھانا بہتر ہے یا پکا کر انھیں تناول کیا جائے۔ اس سوال کا جواب آسان نہیں۔

وجہ یہ ہے کہ بعض سبزیاں پکانے سے ان کے کچھ معدن یا وٹامن ضائع ہو جاتے ہیں۔ جبکہ کچھ سبزیاں پکانے سے الٹا اثر ہوتا ہے۔ یعنی ان کے معدن یا وٹامن پکانے سے بڑھ جاتے ہیں۔ ذیل میں ایسی ہی کچھ عام سبزیوں کا تذکرہ پیش ہے جنھیں کچی یا پکا کر کھانا بہتر ہے۔

پیاز:

اسے کچی کھانا بہتر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پیاز پکائی جائے تو اس کا ایک اہم غذائی مادہ الیسن (Allicin) ضائع ہو جاتا ہے۔ یہ مادہ انسان میں شکم سیری کا احساس پیدا کرتا اور بھوک مارتا ہے۔

ٹماٹر:

اسے پکانا بہتر ہے۔ دراصل ٹماٹر پکا کر کھانے سے اس میں شامل غذائی مادہ، لائکوپین (Lycopene) کی زیادہ مقدار ہمارے جسم میں جذب ہوتی ہے۔ یہ مادہ ہمیں سرطان (کینسر) اور دیگر بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

ساگ:

اس دل پسند سبزی کو بھی پکا کر کھانا مفید ہے۔ یوں انسانی جسم کو زیادہ کیلشیم، فولاد اور میگنیشم جیسے اہم معدن ملتے ہیں۔

چقندر:

یہ کچا کھانا چاہیے۔ چقندر پکایا جائے، تو اس کا 30 فیصد فولیٹ وٹامن ضائع ہو جاتا ہے۔ یہ وٹامن ہمارے دماغ کو تقویت دیتا ہے۔

کھمبیاں (مشروم):

اسے پکا کر کھائیے۔ دراصل کھمبیوں کو کسی بھی طریقے سے پکائیے، اس میں پوٹاشیم کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ یہ معدن ہمارے بدن کے عضلات مضبوط بناتا ہے۔

کرم کلہ (بند گوبھی):

اسے کچا کھانا مفید ہے۔ کرم کلہ پکایا جائے، تو اس میں شامل ایک خامرہ (انزائم)، مائروسیناسی (Myrosinase) ختم ہو جاتا ہے۔ یہ خامرہ ہمارے نہایت اہم عضو جگر پر حملہ آور ہونے والے زہریلے مادے اور جراثیم کو مارتا ہے۔

سرخ مرچ:

سرخ مرچیں کھا کر ظاہر ہے، بڑی مرچیں لگتی ہیں، مگر انھیں کچا کھانا مفید ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں 375 سینٹی گریڈ درجہ حرارت سے زیادہ پکایا جائے تو ان میں شامل وٹامن سی ضائع ہو جاتا ہے۔

غذائیں جنھیں استعمال نہ کیجیے:

انسان عموماً ذائقے کے باعث کوئی غذا پسند نہیں کرتا۔ لیکن ہم اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ بعض غذائیں مختلف وجوہ کی بنا پر مضر صحت ہیں۔ ذیل میں ایسی ہی غذاؤں کا تعارف ہے۔ ان کی بابت پڑھیے اور آیندہ انھیں سوچ سمجھ کر استعمال کیجیے۔

ڈائٹ سوڈا:

ڈائٹ سوڈا سمیت تمام بوتلیں، گولیاں، ٹافیاں، چیونگم اور دیگر بہت سی بازاری میٹھی اشیا مصنوعی مٹھاس (Artificial sweeteners) رکھتی ہیں۔ مصنوعی مٹھاس کی مختلف اقسام ہیں مثلاً سراکیوز، اسپارٹیم، نیوٹیم وغیرہ۔ یہ سبھی اقسام دراصل کیمیائی مادے ہیں۔ کئی تجربات اور تحقیقات سے انکشاف ہوا ہے کہ یہ کیمیکل انسانی صحت کے لیے خطرناک ہیں۔

ڈبا بند غذائیں:

کئی ادارے مختلف غذائیں ٹن کے ڈبوں میں فروخت کرتے ہیں۔ انھیں مختلف کیمیائی مراحل سے گزارا جاتا ہے تاکہ وہ طویل عرصہ خراب نہ ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان ڈبوں کے استر کی رال (Resin linings) میں ایک مصنوعی ایسٹروجن کیمیائی مادہ، بیسفینول-اے (Bisphenol-A) شامل ہوتا ہے جو انسان کو مختلف امراض میں مبتلا کرتا ہے۔ ان میں تولیدی بیماریوں سے لے کر امراض قلب، ذیابیطس اور موٹاپا قابل ذکر ہیں۔ یہ مادہ خصوصاً

مردوں میں نامردی پیدا کرتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ گلاس کی بوتلوں یا گتے کے ڈبوں میں بند غذائیں تو پھر ٹھیک ہیں، ٹن کے ڈبے میں بند غذا سے پرہیز کریں تو بہتر ہے۔

گندم کا آٹا:

شاید آپ نہ جانتے ہوں، ایک سو سال پہلے کی گندم موجودہ دور کی گندم سے بہت مختلف تھی۔ وجہ یہ ہے کہ 1950ء کے بعد ماہرین نے گندم کے بیجوں میں کئی جینیاتی تبدیلیاں کر ڈالیں تاکہ زیادہ سے زیادہ گندم اگائی جاسکے۔ ان تبدیلیوں نے فصل تو بڑھا دی لیکن گندم میں موجود غذائیت کا قدرتی توازن ختم کر ڈالا۔

یہی وجہ ہے کہ اب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گندم کا آٹا کئی بیماریاں جنم دینے کا سبب بن چکا۔ ان میں نظام ہضم کے امراض مثلاً شکمی عارضہ (Celiac) اور سوزش آنت، تیزابی جذر (Acid Reflux)، موٹاپا، دمہ اور جلد کی بیماریاں شامل ہیں۔ لہٰذا اگر خدانخواستہ آپ ان میں سے کسی بیماری میں مبتلا ہیں تو چند ہفتے گندم کے آٹے سے پرہیز کیجیے۔ اگر فاقہ محسوس کریں تو سمجھ جائیے کہ جینیاتی طور پر تبدیل شدہ آٹا ہی بیماری کا باعث تھا۔

مکئی:

پچھلے دس پندرہ برسوں کے دوران امریکا سمیت کئی ممالک میں یہ اعجوبہ دیکھنے کو ملا کہ شہد کی مکھیاں کم ہو گئیں۔ محقق تشویش میں مبتلا ہو کر یہ جاننے کی کوشش کرنے لگے کہ وجوہ کیا ہیں۔ دوران تحقیق انکشاف ہوا کہ مکئی کی فصل

بھی مکھیاں ختم کر رہی ہے۔

دراصل گندم کی طرح مکئی کے بیجوں میں بھی وسیع پیمانے پہ جینیاتی تبدیلیاں لائی جا چکیں۔ مدعا یہ ہے کہ پودے میں کیڑے مارنے والی صلاحیتیں پیدا ہو جائیں۔ بعض اقسام کے بیجوں میں ایسی جینیاتی تبدیلیاں لائی گئیں کہ وہ کیڑے مار ادویہ کے بھاری اسپرے میں بھی پھل پھول سکیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ کیڑے مار ادویہ کے کیمیائی مادے عموماً مکئی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہی مادے پھر مکھیوں ہی کو نہیں مارتے بلکہ انسان بھی آلودہ مکئی کھا کر بیمار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا مکئی وہی بہتر ہے جو کیڑے مار ادویہ سے پاک کھیت میں کاشت کی جائے۔

چاکلیٹ کون سی بہتر؟

ماضی میں چاکلیٹ کو غیر صحت بخش غذا سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے خصوصاً بچوں کو اس مفید شے سے دور رکھا جاتا۔ لیکن پچھلے چند سال میں جدید سائنسی تحقیق نے انکشاف کیا کہ کوکا بیج (جن سے چاکلیٹ بنتی ہے) ضد تکسیدی مادے (Antioxidants) اور معدنیات مثلاً میگنیشیم کثیر مقدار میں رکھتے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی پتا چلا کہ چاکلیٹ میں موجود دو مرکب تھیوبرومائن اور فینی تھیلمائن ہمارے جسم میں کیمیائی مادہ، سیروٹونین کی افزائش کرتے ہیں۔ واضح رہے، یہی کیمیکل ہم میں خوشی و مسرت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

ایک تجربے میں شدید تھکن کے شکار مرد و زن کو آٹھ ہفتے تک 1.5 اونس سیاہ چاکلیٹ کھلائی گئی۔ اس چاکلیٹ کا 85 فیصد حصہ سیاہ چاکلیٹ پر مشتمل تھا۔ آٹھ ہفتے بعد تقریباً سبھی بالغوں نے تھکن میں کمی کی خوش خبری سنائی اور ان کا وزن بھی نہیں بڑھا۔

یاد رہے، چاکلیٹ کے طبی فوائد سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے کہ سیاہ چاکلیٹ تناول کی جائے۔ مِلک چاکلیٹ کھانے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اس میں شامل دودھ ضد تکسیدی مادوں کو بدن میں جذب نہیں ہونے دیتا۔ نیز چاکلیٹ میں ہائیڈروجنیٹڈ تیل بھی موجود نہیں ہونا چاہیے۔ مزید برآں دن میں ایک اونس سیاہ چاکلیٹ کھانا کافی ہے، یوں مطلوبہ طبی فائدے مل جاتے ہیں۔

وٹامن ڈی کے غذائی ماخذ:

ماہرین طب کا کہنا ہے کہ بالغوں کو روزانہ 400 آئی یو (انٹرنیشنل یونٹ) جبکہ بچوں کو 200 آئی یو کی ضرورت ہوتی ہے۔ چند برس کے دوران آنے والی تحقیقی رپورٹوں نے اس حیاتین کو بہت اہم قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ آشکارا کرتی ہیں کہ یہ حیاتین ہمارے نظام مامون کو طاقتور بناتا اور کئی بیماریوں سے بچاتا ہے۔

وٹامن ڈی سب سے زیادہ دھوپ میں ملتا ہے۔ انسان 20 سے 25 منٹ دھوپ میں رہے، تو اسے وٹامن ڈی کی مطلوبہ مقدار مل جاتی ہے۔ لیکن بہت سے لوگ دھوپ میں اتنا عرصہ نہیں رہ پاتے۔ لہٰذا ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ غذاؤں سے یہ حیاتین حاصل کریں۔ مسئلہ یہ ہے کہ وٹامن ڈی بہت کم غذاؤں میں ملتا ہے۔ لہٰذا وہ فہرست طعام میں شامل نہ ہوں، تو انسانی جسم میں اس حیاتین کی کمی ہو جاتی ہے۔ ذیل میں انہی غذاؤں کا تعارف پیش ہے جن میں یہ قیمتی حیاتین خاطر خواہ مقدار میں ملتا ہے۔

کاڈ لیور آئل:

یہ تمام غذاؤں میں حیاتین کا سب سے بڑا منبع ہے۔ کاڈ لیور آئل (Cod lever oil) کا صرف ایک چمچ ہمیں مطلوبہ وٹامن ڈی سے دو سو فیصد زیادہ مقدار مہیا کرتا ہے۔ مزید برآں یہ تیل انسانی صحت کے لیے مفید چکنائی، اومیگا-3 فیٹی ایسڈز بھی رکھتا ہے۔

سالمن اور ٹونا مچھلیاں:

یہ دونوں روغنی (oily) سمندری مچھلیاں بھی اپنے گوشت میں وٹامن ڈی اور اومیگا-3 فیٹی ایسڈز کا کثیر خزانہ رکھتی ہیں۔ اگر آپ کی جیب بھاری ہے، تو ان مچھلیوں کو روزمرہ غذا میں شامل رکھیے۔

دودھ:

گائے کا دودھ قدرتاً وٹامن ڈی رکھتا ہے۔ اس کی ایک پیالی دودھ میں 100 آئی یو وٹامن ملتا ہے۔ (یاد رہے، بھینس کے دودھ میں یہ حیاتین نہیں ملتا)۔

انڈا:

ایک انڈے کی زردی میں 21 آئی یو وٹامن ڈی موجود ہوتا ہے۔ جب کہ اس کی سفیدی خاصی مقدار میں پروٹین رکھتی ہے۔ اپنی خصوصیات کے باعث انڈا عمدہ غذا ہے۔

طب و صحت

وہ پانچ طریقے جانیے

جس سے اپنی تخیلاتی قوت کو روزانہ بڑھانا ممکن ہوگیا ہے

کوئی بھی پُرسکون گوشہ اور مخصوص وقت آپ کو یہ خوشی دے سکتا ہے

شکیل احمد

سب سے پہلے تو میں یہ حقیقت آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ آپ کی تخیلاتی قوت نہایت کارآمد اور مفید ہے۔ یہ نظریہ محض فریب نہیں ہے بلکہ سائنسی طور پر اس کی افادیت ثابت ہو چکی ہے۔ اس ضمن میں تمام ماہرین باہمی طور پر اس حقیقت پر متفق ہیں کہ آپ اپنی مطلوبہ خواہش کے حصول کے لیے اس وقت تک تیاری کر سکتے ہیں جب تک آپ کا تحت الشعوری ذہن آپ کی مطلوبہ خواہش کو سچائی کے طور پر قبول کرتا ہے اور آپ کے نئے اعصابی اور دماغی روابط آپ کے تمام بدن کو آپ کی مطلوبہ خواہش کے حصول کے لیے راغب کرتے ہیں اور اس ضمن میں مواقع اور امکانات تلاش کرتے ہیں۔

میں نے ایک دفعہ ایک ایسے تختہ سوار (Skateboarder) کے متعلق پڑھا جس نے کہا تھا کہ اس نے تختہ سواری کبھی بھی ترک نہیں کی۔ ''میں اپنی زندگی کے ہر لمحے اسے انجام دیتا ہوں، یہی میری سوچ ہے، یہی میری خوراک ہے، یہی میرا سانس ہے اور یہی میری نیند ہے۔'' اب آپ یہ جانتے ہیں کہ اس کی کامیابی کی بنیاد تختہ سواری کے متعلق اس کے ذہن پر نقش ہونے والے مختلف خیالات ہیں۔ حال ہی میں میرے ایک واقف کار کے نوعمر بچے کو کوئی مسئلہ پیدا کرنے کی بنا پر پولیس نے تیسری دفعہ گرفتار کرلیا۔ اس کے باپ کو اور مجھے علم تھا کہ یہ واقعہ کیوں رونما ہوا۔ تقریباً ڈیڑھ سال سے یہ بچہ اس مجرمانہ زندگی کے خیال میں گم رہتا تھا جو دوسرے نوعمر بچے اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس نے مجرمانہ زندگی کے متعلق تحقیق کی نیز اس نے مجرم گروہوں کے سربراہوں کی زندگی کا مطالعہ کیا اور وہ اس تمام صورتِ حال سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے مجرمانہ زندگی اختیار کرنے کے لیے خود کو

تیار کرلیا۔ خوش قسمتی سے باپ اپنے بیٹے کے سامنے یہ ظاہر کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ اس نے قانونِ کشش کے ذریعے کیسے پولیس کے ساتھ بُرے تعلقات قائم کیے اور اب وہ نتائج تبدیل کرنے پر قادر ہوگیا ہے۔

اگر آپ اپنی مطلوبہ خواہش کی تکمیل کے ضمن میں اپنے ذہن کو آمادہ اور تیار کرنا چاہتے ہیں تو اس حوالے سے چند مفید تراکیب ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ اپنے تخیل کے مطابق تصاویر اور مناظر بنائیے

آپ اپنی مطلوبہ خواہش پر مبنی تخیل کے مطابق ایک بڑی تصویر یا منظر بنائیے جس میں بہت سی متعلقہ چھوٹی چھوٹی تصاویر شامل ہوں۔ ہر تصویر کے نیچے اس کا عنوان لکھیں پھر اپنے اور اپنے عزیزوں کی حقیقی تصاویر ایک دوسرے میں شامل کر دیں۔ یہ امر یقینی بنائیں کہ یہ تصاویر آپ کی ذاتی خواہشات کے مطابق ہوں۔ وہ چیزیں بھی جو آپ کی آنکھوں میں آنسو لے آئیں، وہ قلعہ جس میں آپ ہمیشہ رہنے کے خواہش مند ہوں، وہ کار جو آپ ہمیشہ ہی چلانا چاہتے ہوں، وہ اسکول جہاں آپ اپنے بچوں کو داخل کرانا چاہتے ہوں، وہ پھل جس کے کھانے کی آپ کو ہمیشہ ہی سے خواہش ہو۔

۲۔ اپنی زندگی کی کہانی دوبارہ لکھیں

فعل حال میں اپنی زندگی کی وہ کہانی لکھیں جس طرح کی زندگی آپ چاہتے ہیں۔ جس قدر تفصیل آپ زیادہ سے زیادہ لکھ سکتے ہیں، لکھیں اور کوئی بھی تفصیل لکھنا مت بھولیں۔ اپنی پانچوں حسیات کو تحریری شکل میں لے کر آئیں نیز ان دیگر احساسات کو بھی تحریر کریں جو حقیقت میں ڈھل سکتے ہیں۔ میرا آپ کو مشورہ ہے کہ آپ آج کے دن میں ایک خاص لمحہ منتخب کریں اور سوچیں کہ آپ کی زندگی کیسی ہونی چاہیے۔

۳۔ اپنی آواز صدابند (ریکارڈ) کیجیے

اپنی آواز میں اپنی زندگی کے بارے تاثرات صدابند (ریکارڈ) کرلیجیے کہ آپ کی زندگی کیسی ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں آپ پہلا یا تیسرا صیغہ استعمال کرسکتے ہیں۔ اپنی آواز صدابند کرتے ہوئے پس منظر میں اپنی پسندیدہ موسیقی بجائیے۔ آپ اپنے اہداف کے حوالے سے اپنے پسندیدہ اثباتی اور یقینی الفاظ استعمال کرسکتے ہیں۔ جب آپ کسی دوسرے کام میں مصروف ہوں، گاڑی چلا رہے ہوں یا گھریلو کام کر رہے ہوں تو اس دوران اپنی صدابند کی ہوئی آواز سنیے۔ جان اصارف کا مشورہ یہ ہے کہ موسیقی کی آواز آپ کی آواز سے بلند ہونا چاہیے تاکہ آپ کے اثباتی خیالات آپ کے شعوری ذہن کے بجائے براہ راست تحت الشعوری ذہن میں داخل اور نقش ہوں۔

۴۔ اپنے اہداف روزانہ بار بار لکھیے

برائن ٹریسی کا کہنا ہے کہ روزانہ اپنے اہم 10 اہداف بار بار لکھیں۔ پہلی دفعہ آپ انھیں صبح کے وقت تحریر کریں پھر دوپہر کے وقت انھیں پڑھیں اور پھر رات سونے سے قبل انھیں پڑھیں۔ اپنا یہ عمل سارا سال جاری رکھیں اور یہ سلسلہ ترک مت کیجیے۔

۵۔ اپنے مقاصد اور اہداف دہراتے وقت رقص کیجیے

اپنی پسند کی دھن منتخب کیجیے، کوشش کریں کہ اس کے ساتھ نغمہ نہ ہو اور پھر اس دھن پر رقص کرتے ہوئے اپنے اہداف و مقاصد دہراتے رہیں اور انھیں اپنی زبان سے لہک لہک کر گائیے اور لطف اٹھائیے اور اس عمل کو ایک حقیقی طمانیت بخش مرحلے میں تبدیل کر دیجیے۔

مجھے کامل یقین ہے کہ مندرجہ بالا تراکیب بہت ہی مفید اور کارگر ثابت ہوں گی۔ یہ تراکیب میرے علاوہ بے شمار دوسرے افراد کے لیے یکساں طور پر مفید و مؤثر ہیں۔ آپ کے تخیل میں اس قدر زبردست طاقت موجود ہے کہ آپ اپنے اہداف کو حقیقی شکل میں ڈھال سکیں تو پھر آپ یہ قدم فوراً ہی اٹھا لیجیے۔

(از جسٹو ہیرارا)

ذاتی صلاحیتوں اور استعدادوں (شخصیت) میں اضافے پر مبنی معجزہ آرائی

ایک دن شعاف نے کہا ''ہم اگر تم دولت اور خوشی حاصل کرنا چاہتے ہو تو پھر یہ سبق اچھی طرح یاد کر لو: اپنے پیشہ ورانہ امور انجام دینے میں محنت سے کام لینے کے بجائے اپنی ذاتی صلاحیتوں اور استعدادوں (شخصیت) میں اضافے کے لیے سخت محنت کرو۔''

اس دن کے بعد سے میں اپنی ذاتی صلاحیتوں اور استعدادوں میں اضافے کے لیے جدوجہد اور کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے یہ تسلیم کر لینے میں کوئی عار نہیں کہ یہ سب سے مشکل کام ہے۔ اپنی ذاتی صلاحیتوں اور استعدادوں میں اضافے پر مبنی مراحل تمام زندگی جاری رہتے ہیں۔

آپ کو تو علم ہے کہ آپ اپنی زندگی میں جو کچھ حاصل کرتے ہیں اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آپ کی شخصیت کس رُخ پر تشکیل پاتی ہے۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے دوران پوچھا جانے والا یہ سوال اہم نہیں ہے کہ ''میں کیا حاصل کر رہا ہوں؟'' بلکہ اہم سوال یہ ہے کہ ''میری شخصیت کس نہج پر تشکیل پا رہی ہے؟'' کسی چیز کا حصول اور شخصیت کی تشکیل باہمی طور پر لازم و ملزوم ہیں۔ آپ کی شخصیت کا براہ راست اثر آپ کو حاصل ہونے والی چیز پر مرتب ہوتا ہے۔ اس اصول پر اس لحاظ سے نظر ڈالیے کہ آج آپ کو جو کچھ حاصل ہے، وہ آپ کی موجودہ شخصیت ہی کے باعث ہے۔

میں نے یہ بھی سیکھا کہ دولت، ذاتی صلاحیتوں اور استعدادوں سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ بعض اوقات خوش قسمتی کے باعث آپ کو دولت حاصل ہو جاتی ہے لیکن جب تک اس دولت کو سنبھالنے کا آپ کو طریقہ نہیں آتا، اس وقت تک آپ اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔

اگر کوئی شخص لاکھوں ڈالر آپ کے حوالے کر دیتا ہے تو آپ اس رقم کی فوری سرمایہ کاری کے ذریعے لکھ پتی بن جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک بہت ہی دولت مند شخص نے کہا ''اگر تم اس دنیا میں موجود تمام دولت دنیا میں موجود تمام افراد میں برابر برابر تقسیم کر دو تو پھر جلد ہی یہ دولت اس جیب میں واپس آجاتی جس سے یہ نکلی ہوتی۔''

جو چیز آپ اپنی ذاتی صلاحیتوں اور استعدادوں کے ذریعے حاصل نہیں کرتے، اسے اپنے پاس رکھنے کے لیے آپ کو بہت مشکل پیش آتی ہے لہٰذا آپ کو اس عظیم کہاوت پر عمل کرنا چاہیے۔

''اپنے موجودہ اسباب سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے آپ کو اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں میں مزید اضافہ کرنا ہوگا۔''

یہ وہ نکتہ ہے جس پر آپ کو زیادہ سے زیادہ توجہ مرکوز کرنی چاہیے، بصورت دیگر آپ اپنے پاس موجود معمولی اسباب اور آمدن پر ہی اکتفا کیے رکھیں گے اور

کسی تبدیلی کے لیے کوشش نہیں کریں گے۔

"جب تک آپ اپنے خیالات، رویے اور طرزِ عمل میں تبدیلی رونما نہیں کرتے، آپ مزید کچھ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

(از جم رون، 27 مارچ 2008ء)

مؤثر تخیلاتی عمل کے لیے تراکیب

اپنی شخصیت و کردار میں مثبت اور تعمیری پہلو اور طرزِ عمل پیدا کرنے اور اپنی مطلوبہ خواہشات حقیقی شکل میں ڈھالنے کے لیے "تخیلاتی عمل" ایک زبردست طریقہ ہے۔ تخیلاتی عمل کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ذہن میں یہ منظر واضح اور غیر مبہم طور پر جاگزیں کر دیا جائے کہ آپ اپنی زندگی سے اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ یہ زندگی، آپ کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ہے۔

اس امر اور حقیقت کا ادراک بہت اہم ہے کہ تخیلاتی عمل کے لیے کوئی مستند طریقہ اور ترکیب موجود نہیں ہے۔ اس ضمن میں بہت سے اجزائے ترکیبی موجود ہیں لیکن کامیاب تخیلاتی عمل کا انحصار صرف آپ ہی پر ہے۔ اس سلسلے میں تخلیقی عمل کے حوالے سے آپ کو وہ مشکلات و مسائل پیدا نہیں کرنے چاہئیں جن کا وجود ہی نہیں ہے۔ مزید حقیقت یہ ہے کہ آپ کی مطلوبہ خواہشات کی تکمیل کے حوالے سے آپ کے سامنے کسی بھی قسم کی رکاوٹیں اور مشکلات موجود نہیں ہیں۔ آپ اپنی مطلوبہ خواہشات کی تکمیل کے اہل ہیں اور انھیں لازمی طور پر حاصل کر لیں گے۔

سب سے پہلے، ایک ایسا پُرسکون گوشہ اور وقت تلاش کیجیے جہاں کوئی آپ کی تنہائی اور سکون میں مخل نہ ہو سکے۔ اگر آپ کو یہ سہولت میسر نہیں ہے کہ آپ مؤثر طور پر تخیلاتی عمل اختیار کر سکیں تو آپ اس عمل میں مہارت حاصل کر لیں گے، آپ میں اعتماد اور تجربہ پیدا ہو جائے گا تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ آپ یہ عمل کہیں بھی اور کسی بھی وقت انجام دے سکتے ہیں اور ہر قسم کی مداخلت سے خود کو مکمل طور پر محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اکثر لوگ یہ عمل، اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق فوری طور پر انجام دے سکتے ہیں۔

زیادہ خوشی پا سکتے ہیں

جب آپ مناسب طور پر آرام و سکون کی حالت اختیار کر لیں تو پھر اپنی مطلوبہ خواہش کا تصور و تخیل کرنا شروع کر دیں۔ یہ بہت خوش کن واردات ہے۔ اپنے ذہن میں یہ تصویر کشی کریں کہ جب آپ کی مطلوبہ خواہش عملی شکل میں ڈھل جائے گی تو پھر آپ کا رویہ اور طرزِ عمل کیا ہوگا۔ اپنے ذہن میں یہ منظر تشکیل دیجیے کہ آپ اپنے گھر میں اپنے فیملی ممبرز اور دوستوں کے ساتھ موجود ہیں۔ اس منظر کی اداکاری کیجیے کہ جب آپ اپنی مرضی کی شخصیت حاصل کر لیتے ہیں، پھر یہ منظر دیکھیے کہ آپ اپنے مطلوبہ شخص کے ساتھ موجود ہیں۔

اس عمل کے دوران اپنی تمام حسیات استعمال کیجیے۔ آپ جن لوگوں کے ساتھ ہیں، ان کے قہقہے سنیے اور ان کے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھیے۔ باغ میں اپنے مطلوبہ پھولوں کی خوشبو سونگھیے۔ اپنی نئی کار کی نشستوں کے چمڑے کی خوشبو محسوس کیجیے۔ اپنے لیے مطلوبہ آسائشوں کی موجودگی کا احساس کیجیے۔ اپنی مطلوبہ زندگی کی مسرتوں کا ذائقہ چکھیے۔ اپنے مطلوبہ مقاصد اور خواہش کی تکمیل کے بعد پیدا ہونے والے جذبات اور کیفیات کو محسوس کیجیے۔ ایسا محسوس کیجیے کہ یہ سب کچھ آپ کو پہلے ہی سے حاصل ہے۔

یہ تخیلاتی عمل روزانہ انجام دیجیے۔

طنز و مزاح

آئینہ سے شیشہ بننے تک

ہوسٹل میں گزرے زندگی کے ان جاندار اور شاندار لمحات کا تذکرہ جو یادوں کے آئینے کا حصہ بن گئے

مبشر الحق عباسی

کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ تعلیم یافتہ افراد کا وہ طبقہ جو کبھی یونیورسٹی کے ہوسٹل میں چند برس مقیم رہا ہو اپنی ہوسٹل کی زندگی پر لب کشائی کیوں نہیں کرتا۔ انتہائی بردبار مہذب اور اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگ جب اپنے ہوسٹل کے پرانے ساتھیوں سے ملتے ہیں تو تمام تہذیب و ادب لپیٹ کر ایک طرف کیوں رکھ دیتے ہیں اور کھسر پھسر کے دوران ایک آواز بلند ہوتی ہے اوئے یار تجھے یاد ہے؟ اور اس کے ساتھ ہی قہقہوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو اس عمر میں کھانسی پر ختم ہوتا ہے۔

ہوسٹل میں ایک بار زندگی گزارنے والے افراد KKK (Klu klux klan) یا فری میسن کی طرز کا ایک ایسا گروہ ہوتا ہے جو اپنے راز کسی سے نہیں کہتا۔ اس خاموشی سے ہی ان کی معاشرے میں عزت ہے اگر آپ کو ان چند برس کو زندگی کہنے پر اعتراض ہے تو یہ بات بھی کوئی ہوسٹل کا باسی ہی بتا سکتا ہے کہ زندگی ہوتی کیا ہے۔ قبل از ہوسٹل اور بعد از ہوسٹل زندگی کا مفہوم، معنی، مقصد، حاصل، غرض و غایت اور تصور کیسے بدلتا ہے۔ آپ اس بات پر بھی رائے کا حق رکھتے ہیں کہ آزادی کے بغیر زندگی بے معنی

ہے یا بامعنی۔ یا گھروں میں جوان ہونے والے کیا اس ذہنی بالیدگی کے مراحل سے گزرتے ہیں جن سے ہوسٹل میں رہنے والے گزرتے ہیں۔ ویسے تو کینگرو کی تھیلی میں بیٹھا بچہ اپنے آپ کو درخت میں بیٹھے چیتے سے اور مرغی کے پروں میں چھپا ہوا چوزہ خود کو بادلوں سے بلند شاہین سے زیادہ آزاد سمجھنے کا مکمل حق رکھتا ہے۔

ہوسٹل میں گزارے ہوئے شب و روز کی کیفیات قابل تحریر کیوں نہیں ہوتیں؟ اسکی بڑی معقول وجہ ہے۔ اگر تو ہوسٹل کی ڈائری یا واقعات ابتدا میں ہی قلمبند کر کے گھر بھیج دیں تو جوابی تار کے ذریعے ہی آپ کی واپسی یقینی ہے اور اعلیٰ تعلیم کا یہ خواب کسی مقامی ادارے میں ہی تکمیل کو پہنچے گا۔ اگر تعلیم کے اختتام پر یہ واقعات صفحہ قرطاس پر بکھیرے جائیں تو کالی روشنائی سے لکھنے کے باوجود یہ تحریر رنگین ہی کہلائے گی بالکل اسی طرح جیسے کالے کر توت نیلی روشنائی سے لکھ کر توقع کی جائے کہ یہ اب کالے نہیں رہے۔ اس حماقت کے دُور رس نتائج یہ ہوں گے کہ کوئی بھی نیک خاندان آپ کو داماد بنانے کا سوچے گا بھی نہیں۔ ملازمت کے بعد کچھ لکھیں گے تو آپ کا جمع کروایا ہوا کیریکٹر سرٹیفکیٹ فوراً منسوخ تصور ہوگا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد لکھنے کا ارادہ کریں گے تو زندگی بھر اخلاقیات، تعلیم، مذہب، قانون کی پاسداری، بسوں کی چھتوں پر سفر اور بازاروں میں فضول پھرنے کے نقصانات اور وقت کی اہمیت پر دیے گئے لیکچر اور پند و نصائح کا ڈھیر آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ ادھر آپ کا دل و دماغ کثرتِ واقعات سے پھٹا جا رہا ہے اور ادھر زندگی بھر کی تپسیا، بزرگی، معاشرے میں ساکھ نے لب پر مہر لگا دی ہے اور قلم کو اذنِ جنبش نہیں مل رہا۔ یہ پرنالہ تو بہتا ہے پرانے دوستوں کے ملنے پر، ہاتھ پر ہاتھ مار کر "اوئے یار تجھے یاد ہے" کہنے پر اور نہ ختم ہونے والے قہقہوں کے جاری ہونے سے۔ نجانے آنکھوں میں آنے والے پانی سے یہ آتش ماضی فرو ہوتی ہے یا فروزاں؟

کہاں تو گھر میں آپ رات جلدی سونے کے عادی تھے، وقت پر ناشتہ، دُھلے استری شدہ تیار کپڑے، رات کو مطالعہ اور دوسری صالح عادات۔ اور اب یہ عالم ہے کہ رات کو دو بجے بھوک لگ رہی ہے، تو اسٹیشن چل دیے، مرغوں کے جاگنے سے پہلے سو رہے، کتاب بینی فلم بینی میں بدل گئی، کہاں کالج کے زمانے میں گروپ سٹڈی ہو رہی ہے اور کہاں یہ کہ پورا غول دوستاں بازاروں اور میلوں کی سیر کو نکلا ہوا ہے۔ بے فکری کا وہ عالم کہ پیسے نہ ہونے کی فکر نہیں اور نہ وقت اور موسم آپ کے ارادوں میں حائل ہو سکتے ہیں۔

ہوسٹل یونیورسٹی کا وہ خطہ ہوتا ہے جہاں کے قواعد و ضوابط اور قوانین یہاں تک کہ وقت کی تقسیم اور اکائی باقی یونیورسٹی بلکہ پورے ملک سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ کبھی یہ پانچ ہزار برس قبل مسیح کی بستی معلوم ہوتی ہے اور کبھی پانچ ہزار برس بعد از مسیح کا جدید علاقہ۔ ہوسٹل میں کھانے کے مقابلے دیکھیں تو اس بات کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ پانی کے گلاس پینے پر منفی ایک نمبر، روٹی کا ایک نمبر اور سالن کی پلیٹ کے دو نمبر، عموماً 28 سے 30 نمبر حاصل کرنے والا جی دار دوسری پوزیشن حاصل کرتا ہے۔ خوش

خوراکی سے زیادہ حیرت اس بات پر ہونی چاہیے کہ کوئی ذی روح، صاحب نظر و عقل ہوسٹل کے سالن کی دوسری پلیٹ کیسے کھا لیتا ہے۔ ہوسٹل کی میس (Mess) میں موسم کی سبزی ہی پکتی ہے مثلاً مٹر کے زمانے میں مٹر گوشت، مٹر قیمہ، آلو مٹر، مٹر کے چاول یہاں تک کہ پانی کے جگ میں مٹر کے دانے تیرتے ہوئے ملتے ہیں کبھی باورچی ترنگ میں ہو تو کھانا اچھا بھی پکا لیتا ہے یا یوں کہیں کہ اس کے ہاتھ کے کھانے کی عادت سی ہو جاتی ہے۔ صیاد سے مانوس ہونا اسی کو کہتے ہیں۔ وہ امی کے ہاتھ کے کھانے بہن کے ہاتھ کے پراٹھے یاد ماضی بن جاتے ہیں۔ باورچی کی یاد اس وقت بہت آتی ہے جب وہ نہیں ہوتا۔ موسم گرما کی چھٹیوں کے بعد یا کسی مجبوری کے تحت اگر وہ نہ ہو تو ہوسٹل کے شیر اس بلی کے بچے بن جاتے ہیں جسے ان کی ماں چھوڑ کر کہیں چلی جائے۔ بغیر بوٹی کے سالن کی اضافی پلیٹ جسے سپلی (سپلیمینٹری کا مخفف) کہا جاتا ہے کھانے کا مزہ دوبالا کر دیتی ہے۔ بے حساب روٹیاں اور ان گنت سپلیاں ہوسٹل والے کی قسمت میں لکھی ہوتی ہیں۔ یہاں سپلی سے مراد تعلیمی سپلی ہے۔

لذت کام و دہن کی اس قربانی سے گزریں تو اور کئی مقتل آپ کی راہ تک رہے ہوتے ہیں۔ تقریباً 60 طلبا کے لئے 8 غسل خانے۔ یا اللہ ساڑھے سات افراد کیسے بیک وقت ایک غسلخانہ استعمال کر سکتے ہیں۔ واش بیسن پر آپ نے صابن رکھا اور ساتھ والے نے مسکراتے ہوئے اسے ہاتھ میں لے کر کھردری لکڑی جیسے ہاتھوں پر رندے کی طرح کہنیوں تک رگڑ لیا۔ دس بارہ لوگوں کی مسکراہٹوں کے بعد صابن اپنے لفافے سے بھی پتلا ہو جاتا ہے۔ آپ نے ابھی ٹوتھ پیسٹ کے ڈھکنے کو بند نہیں کیا کہ ایک مانوس چہرے پر التجائی مسکراہٹ نے ٹوتھ پیسٹ آپکے ہاتھ سے پکڑ لیا بلکہ جکڑ لیا۔ اب کہاں تو وہ موصوف بچپن سے آج صبح تک سامنے کے چار دانت ہی صاف کیا کرتے تھے اور آج 32 دانتوں کی اندر باہر سے صفائی ہو رہی ہے۔ چند

بغیر بوٹی کے سالن کی اضافی پلیٹ جسے سپلی (سپلیمینٹری کا مخفف) کہا جاتا ہے کھانے کا مزہ دوبالا کر دیتی ہے۔ بے حساب روٹیاں اور ان گنت سپلیاں ہوسٹل والے کی قسمت میں لکھی ہوتی ہیں۔ یہاں سپلی سے مراد تعلیمی سپلی ہے

لمحوں بعد ہی ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب تپ دق کے مریض یا دوسری جنگ عظیم کے جاپانی قیدی کی طرح ہو جاتی ہے۔ آپکے ماتھے کی شکنیں تعداد اور گہرائی میں اس ٹیوب پر پڑنے والی شکنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ غسل سے فارغ ہو کر جب آپ کمرے میں واپس آتے ہیں تو اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ کسی نے آپ کے جسم سے لپٹا تولیہ ہی نہیں مانگ لیا۔ کیونکہ ہوسٹل میں بے تکلفی انتہا کو چھوتی ہے تو دلوں میں جذبہ ایثار بھی پیچھے نہیں رہتا۔ صابن دانی میں چپکی صابن کی پرت اور نچڑی ہوئی ٹیوب کو گواہ بنا کر آپ خود سے وعدہ لیتے ہیں کہ آئندہ ان چیزوں پر پیسے نہیں خرچ کریں گے۔ آپ کا خود آگہی کا یہ سفر شروع ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے خود کو لاحق خطروں سے آگاہ کر لیا ہے اگلی صبح جب آپ صابن دانی کا یہ چراغ سحری ہاتھ میں لے کر نکلیں

کہتے ہیں کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں میرا خیال ہے کہ روم میٹوں کا تعین بھی روز ازل فرما دیا گیا ہوگا

گے تو آپ ان درویشوں اور فاقہ مستوں کی صف میں کھڑے ہوں گے جو مسکراہٹ کے ہتھیار سے دوسروں کی صابن دانی سے صابن ہتھیا لیتے ہیں۔ مانگے ہوئے صابن سے جس محبت کا اظہار یار لوگ کرتے ہیں اس کا ثبوت اس وقت ملتا ہے کہ جب کبھی اچانک شاور کی آواز بند ہوتی ہے اور اندر سے سفید براق بھوت جس کی کالی آنکھوں کے گھومتے ڈھیلے اس کی سامنے کی سمت کی نشاندہی کر رہے ہوتے ہیں صابن کے بلبلوں میں ملبوس یہ کہتا ہوا بھاگتا نظر آتا ہے کہ نیچے چلو پانی ختم ہو رہا ہے۔ اور صحراؤں اور دریاؤں کو ٹھوکر سے دو نیم کرنے والے نوجوان ٹھوکریں کھاتے افتاں و خیزاں، پانی کی رفتار سے تیز گراؤنڈ فلور پر پہنچ کر اس نعمت کو زمین میں جذب ہونے سے پہلے جا لیتے ہیں۔ جسے آپ نے سفید بھوت سمجھا تھا وہی کالا شخص ہے جس نے کسی دوسرے کے صابن کو اس خیال سے اتنا استعمال کیا کہ شاید وہ کور پر بنی تصویر جیسا نازک اندام بن جائے گا۔ یہ ویسی ہی معصوم خواہش ہے کہ کریلا چاہے کہ گل نرگس بن جائے اور گینڈا چاہے کہ اس کی جلد ہرن جیسی ہو جائے، مچھلی تو ساری عمر بھی پانی میں رہے تو اسکی بو نہیں جاتی۔

دوسروں کی چیزیں استعمال کرنے کے حوالے سے ایک مدت تک روم میٹ آپس میں کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔ لیکن بعد کا زمانہ مکمل اشتراک کا زمانہ ہوتا ہے۔ یہاں مدت سے مراد شروع کے پندرہ دن اور بعد کے زمانے سے سولہویں دن سے ابد تک کا وقت مراد ہے۔ بے تکلفی کا سفر عموماً بتدریج طے ہوتا ہے۔ لیکن ہوسٹل میں اسکی نشوونما بیکٹریا کی طرح ہوتی ہے، یعنی گھنٹوں کے لحاظ سے۔ ابتدائی دنوں میں سب نے اپنے اپنے کپڑے سلیقے سے اپنی الماریوں میں لٹکائے، کتابیں اور قلمدان میز پر سجائے۔ آپ نے ٹرنک میں سے میٹھی ٹکیوں کا شیشے کا جار جو آپ کے گھر والوں کی محبت اور سونف کی خوشبو سے معمور ہے الماری میں سامنے رکھا۔ اخلاقاً ہر روم میٹ کو ایک ایک ٹکیا دی۔ سب نے بے حد تعریف کی، کسی کو اپنی والدہ کے ہاتھ کے کھانے یاد آئے اور آنکھیں جھلملانے لگیں۔ اگلی شام قریبی کمروں کے احباب بھی اس تبرک کو چکھنے اور اپنی اپنی والدہ کو یاد کرنے حاضر ہو گئے۔ اس سے اگلی شام آپ کی الماری اور جار تو جذباتی اور نباتاتی خوشبو سے لبریز ہے پر جار سے روشنی آر پار ہو رہی ہے۔ رہ گیا الماری کا تالا تو یہ آہنی ڈھکوسلہ تو شرفا کے لیے حدود کی نشاندہی ہے حلقۂ یاراں میں تو یہ ابریشم کی طرح نرم ہوتا ہے۔ بھائی چارے کا لفظ اس حوالے سے برمحل ہے کہ اگلی بار گھر سے واپسی پر آپ یہ چارہ ساتھ نہیں لائیں گے۔ جسے کھا کر آپ کے دوست کہہ سکیں یہ تو میری امی بھی بناتی ہیں اور مائیں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ابھی ایک ماہ نہیں گزرے گا کہ دروازے سے ایک ہانپتی آواز آئے گی یار کسی کے پاس نیلی شرٹ ہے۔ آپ کہتے ہیں نیلی نہیں کالی ہے، وہ کہتا ہے

جلدی دے یار! دیر ہو رہی ہے۔ آپ اٹھتے ہیں تو آپ کا روم میٹ کہتا ہے یار میری الماری سے نکال لے میں نے کل تیری شرٹ پہنی تھی۔ یار دیر نہ کرو ابھی میں نے کسی سے پینٹ بھی مانگنی ہے۔ آپ حیرت سے سوچتے ہیں کہ یہ لوگ گھر سے پتے باندھ کر آئے تھے یا رات کے اندھیرے میں سفر کر کے یہاں پہنچے تھے۔ پہلا سمسٹر ختم ہونے سے پہلے ہر ایک الماری مختلف لوگوں کے کپڑوں سے آراستہ ہوتی ہے۔ آپ اور آپ کے دوست کپڑے اور جوتے خریدتے ہوئے دوسروں کی پسند اور کمرے میں پہلے سے موجود کپڑوں کے رنگ کا خیال رکھتے ہیں تاکہ بدل بدل کر ایک دوسرے کی چیزیں استعمال کر سکیں۔

قدیم راہِ سلوک کا تو پتا نہیں جدید راہِ سلوک کا جو سفر ان ابتدائی دنوں میں طے ہو جاتا ہے اس کے لیے آپ کی کشادہ دلی، وسعت قلبی اور اکٹھے رہنے کا جذبہ ضروری ہے۔ برداشت اور مسکراہٹ کا امتزاج ہی اس منزل کی پہلی شرط ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو آپ پانی کے جگ میں چکولے کھاتے مٹر کے دانے، کچے آٹے اور کوئلے کے درمیان روٹی کے ٹکڑے، ذائقے سے عاری سالن، صابن کی بے ثباتی، ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کی بے حرمتی، کسی غیر کے تن پر بھی آپ کی ذاتی قمیص، کمرے کے ساتھیوں کے ہاتھوں سے اٹھنے والی سونف کی خوشبو سب ایک قہقہے میں اڑا دیں گے۔

کہتے ہیں کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں میرا خیال ہے کہ روم میٹوں کا تعین بھی روز ازل فرما دیا گیا ہوگا۔ اور تمام نہیں کچھ خاص الخاص روم میٹ تو آئندہ زندگی میں بھی آپس میں ایسے رہتے کہ اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی صاف جھلکتی ہے۔ وہ ذات باری جو ہم شکل افراد پیدا کرتی ہے کیا عجب کہ مماثل روحیں بھی بنا دیتی ہو۔

ویسے تو عمر کے اس حصے میں توانائی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے لیکن ہوسٹل میں مشقت بڑھ جاتی ہے۔ ایک موٹر سائیکل پر چار سے زائد لوگ کیسے سوار ہو سکتے ہیں، رات ایک بجے سینما ختم ہونے پر کون سی ٹیکسی بغیر پیسوں کے آپ کو بارہ کلومیٹر دور لیکر جائے گی، لامحالہ پیدل ہی جانا پڑے گا۔ اور یہ دونوں وقت اور مشقت طلب کام ہیں۔ مشقت بڑھی تو بھوک میں اضافہ ہوا، رات تین بجے یا تو تھانہ کھلا ہوتا ہے یا اسٹیشن، شریف بھوکا شخص اسٹیشن نہ جائے تو کیا کرے۔ رات کے آخری پہر چلنے والی ٹھنڈی ہوا، بھرا پیٹ، جسمانی تھکن، اور جوانی ان میں سے کوئی تین چیزیں بھی اکٹھی ہو جائیں تو کیا شاندار نیند آتی ہے۔

> اہل خانہ سے کنارہ کشی روحانی ترقی میں کتنی معاون ہوتی ہے اس راز کو مہاتما بدھ نے جانا۔ شہر پھیلے اور ویرانے سکڑے تو اللہ نے ہوسٹل جیسی نعمت عطا کر دی

شب بیدار ملامتی صوفیوں کے اس گروہ کے علاوہ ایک اور گروہ بھی یونیورسٹی کے در و بام کے چکر لگاتا ہے۔ صبح آکر شام کو واپس لوٹ جانے والے یہ پچھی ڈے سکالرز کہلاتے ہیں۔ (اس حوالے سے ہوسٹل والوں کو نائٹ سٹرالر (Night Strollers) کہنا مناسب ہوگا) گھر سے یونیورسٹی اور واپس گھر تک اڑان رکھنے والے

یہ پرندے رفعتِ پرواز سے عاری ہوتے ہیں۔

دوسرے سمسٹر کے آخر تک آپ سب کے امتحانی نتائج، اخلاق، اطوار، اوقات کار کسی محفل میں بلند آواز سے بتانے کے قابل نہیں رہتے۔ اب کوئی اس دھارے میں بہنے کی بجائے ساحل کی طرف نظر

> شب بیدار ملامتی صوفیوں کے اس گروہ کے علاوہ ایک اور گروہ بھی یونیورسٹی کے در و بام کے چکر لگاتا ہے۔ صبح آکر شام کو واپس لوٹ جانے والے یہ پیچھی ڈے سکالرز کہلاتے ہیں

کرے تو یقیناً راندۂ درگاہ ہو جائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس گرداب میں بے حال گھومنے والا بچ نکلتا ہے اور سلامتی کا خواہاں ڈوب جاتا ہے۔ جو اس میکدے میں ایک بار جام آزادی پی بیٹھا اسی کوچے کا ہو رہا۔ آپ نے بھی ہوسٹل چھوڑنے والے مرتدین کا ذکر کم کم ہی سنا ہوگا۔ البتہ ایسی داغدار امتحانی کارکردگی کی اصلاح نو کے لیے اجتماعی توبہ ضرور کی جاتی ہے جو توبۃ النصوح نہ سمجھی جائے۔ لائق ہم جماعتوں سے دوستی اور تعلق بڑھ جاتا ہے۔ مزہ تو اس روز آتا ہے جب ڈے سکالر صبح سوجی ہوئی آنکھوں سے آپ کے کمروں میں آکر آپ کو جگاتے ہیں کہ چلو ٹیسٹ میں آدھ گھنٹا رہ گیا ہے اور آپ انہیں جمائی لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہ تو کل شام ہم نے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کے گھر جا کر موخر کروا دیا ہے۔ نیم خوابیدہ شخص کا قتل جائز ہوتا تو یقیناً یہ کمرہ مقتل ہوتا۔

آپ کی روح جسے مالی آسودگی، تن آسانی، خوش ذائقہ کھانوں کی فراوانی نے آپ کے فربہ جسم میں جکڑ رکھا تھا آج صحیح معنوں میں آزاد ہوئی ہے۔ یہ منزل سلوک نہیں تو کیا ہے۔ اہل مغرب اسے کتھارسس کا عمل کہتے ہیں۔ اہل طریقت ہوں کہ اہل مغرب یہاں پہنچنے کے لیے کیا کیا نہیں کرتے۔ ہر نو وارد کو یقین ہوتا ہے کہ وہ اس سمندر سے اپنا دامن بھگوئے بغیر ہی پار اتر جائے گا لیکن یہ خیال خام جلد ہی اس تلخ حقیقت میں بدل جاتا ہے کہ تعمیر کے لیے شکست و ریخت ضروری ہے۔ کچھ عرصے بعد آپ اپنے آپ کو ناتراشیدہ اور بے ہنگم پتھروں کے ڈھیر پر بیٹھا پاتے ہیں۔ اب آپ پر منحصر ہے کہ آخر میں اس سے بدہیئت کوٹھڑی بنا لیں یا تاج محل۔ گھر سے دوری، نامانوس حالات، آزاد ماحول اور تمام مروجہ قیود سے یکسر لاتعلقی آپ کو اپنا ذاتی کوڈ آف کنڈکٹ لکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اب خود عائد کردہ پابندیوں کی پاسداری آپ کا واحد کام رہ جاتا ہے۔ خرابات کی چمک، اجنبی رویوں کی تپش، نئے ماحول کی گرمی، شعلہ زن جوانی غرض تجربے کی یہ بے رحم بھٹی کئی نازک اندامو کو جلا کر راکھ بھی کر دیتی ہے لیکن عمومی طور پر لوہا فولاد اور سونا کندن بن کر ہی نکلتا ہے۔ اگر دعائیں دینے والے زندہ ہوں اور ہمیشہ زندہ رہنے والی ذات آپ پر کرم کرے تو ویسے بھی کچے کوئلے اور سخت جان ہیرے میں واحد فرق تخلیقی مراحل میں سختی برداشت کرنے کے وصف کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

ہوسٹل پھولوں کی سیج نہیں تو کانٹوں کا بستر بھی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عمر میں سیج و بستر، تخت و تختہ بے معنی ہوتے ہیں اور جس کو جان و دل عزیز ہوتے ہیں وہ اس کوچے کا رخ بھی نہیں کرتا یہ تو دیوانوں کا خطہ ہے، فرزانوں کا یہاں کیا کام۔ جفاکشی،

خود انحصاری کے اسباق و تجربات روح میں ایسے پیوست ہوتے ہیں کہ باقی زندگی کسی ہنر سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کپڑے دھونا، چارپائی مرمت کرنا، کھانا پکانا، سبزی کاٹنا، برتن دھونا غرض کیا کام ہے جو وقت نہیں سکھا دیتا۔ ان خوبیوں کے ساتھ کوئی شریف شہری بنے نہ بنے کارآمد فرماں بردار شوہر ضرور بن جاتا ہے۔

ہوسٹل کے نوٹس بورڈ پر آویزاں ادب پارے اپنی گہرائی اور بے ساختہ پن میں جدید سبع معلقات کہے جاسکتے ہیں۔ افسوس مشرق کی زبان میں فحش الفاظ گالی کے زمرے میں آتے ہیں اور اہل مشرق کھلی تحریروں کا ذوق بھی نہیں رکھتے ورنہ تحریری ادب میں خوب اضافہ ہوتا۔ اب یہ ہوسٹل والوں کے وسیع سینوں میں دفن بے شمار خفتہ رازوں میں شامل ہیں۔ یونیورسٹی میں درسی کتب حصول علم کا ذریعہ ہوتی ہیں جبکہ ہوسٹل میں ہر شخص بغیر جلد اور ملمع سے پاک کھلی کتاب کی مانند ہوتا ہے۔ اس لائبریری میں رہ کر چاہے تعلیمی جی پی اے (GPA) دو اور تین کے درمیان رہ جائے لیکن عملی اور معاشرتی جی پی اے چار سے کم نہیں ہوتا۔ یہ سن کر ڈارون بھی خوش ہوگا کہ چھوٹے شہروں، قصبوں اور گاؤں سے آنے والی معصوم فاختائیں بھی چند ماہ میں شکرے، باز اور شاہین بن جاتی ہیں۔

اہل خانہ سے کنارہ کشی روحانی ترقی میں کتنی معاون ہوتی ہے اس راز کو مہاتما بدھ نے جانا۔ شہر پھیلے اور ویرانے سکڑے تو اللہ نے ہوسٹل جیسی نعمت عطا کر دی۔ اب دیوانوں کو ویرانوں کی خوبیوں والی چار دیواری میسر آگئی۔ ذہن اور تخلیقی سوچ کو جامد کرنے

> ہوسٹل کا قیام صیقل شدہ آئینے کو شفاف شیشہ بنانے کے سفر کے سوا کچھ نہیں اور قسمت یاوری کرے تو چند برس بعد آپ بھی کسی پرانے دوست کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہہ رہے ہوں گے ''اوئے یار تجھے یاد ہے؟''

والی گھریلو آسائشوں سے دور ویرانے ہوں، جیل کی کوٹھڑیاں یا ہوسٹل۔ اپنوں سے دور چلتے ہوں، بن باس ہو، اعتکاف ہو یا ہوسٹل کا قیام، خود شناسی اور وجدان کی راہیں ہی لگتی ہیں۔ زندگی کی تلخیوں سے کون بچ سکا ہے لیکن ان پر مسکرانے کا فن بلکہ ٹھٹھے مار کر ہنسنے کا طریقہ اس کراماتی چار دیواری میں ہی سکھایا جاتا ہے۔

ان تمام نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد گھر سے لایا ہوا آپ کی انا کا صیقل شدہ آئینہ جس میں آپ کی اپنی شبیہ کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا، رفتہ رفتہ زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ کافی عرصے بعد آپ اسے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صیقل ماند ہو کر ختم ہو گیا ہے۔ یہ آئینہ شفاف شیشے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ آپ کا عکس مدھم یا مبہم کسی حالت میں نظر نہیں آرہا۔ دکھائی دیتے ہیں تو اس کے اس پار صرف اور صرف دوسرے لوگ۔ اس سفر میں اگر یہ شیشہ شکستگی کا شکار بھی ہو جائے تو سودا برا نہیں کہ شیشے کی شکستگی سفید روشنی کو قوس قزح میں بدل دیتی ہے۔

ہوسٹل کا قیام صیقل شدہ آئینے کو شفاف شیشہ بنانے کے سفر کے سوا کچھ نہیں اور قسمت یاوری کرے تو چند برس بعد آپ بھی کسی پرانے دوست کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہہ رہے ہوں گے ''اوئے یار تجھے یاد ہے؟''

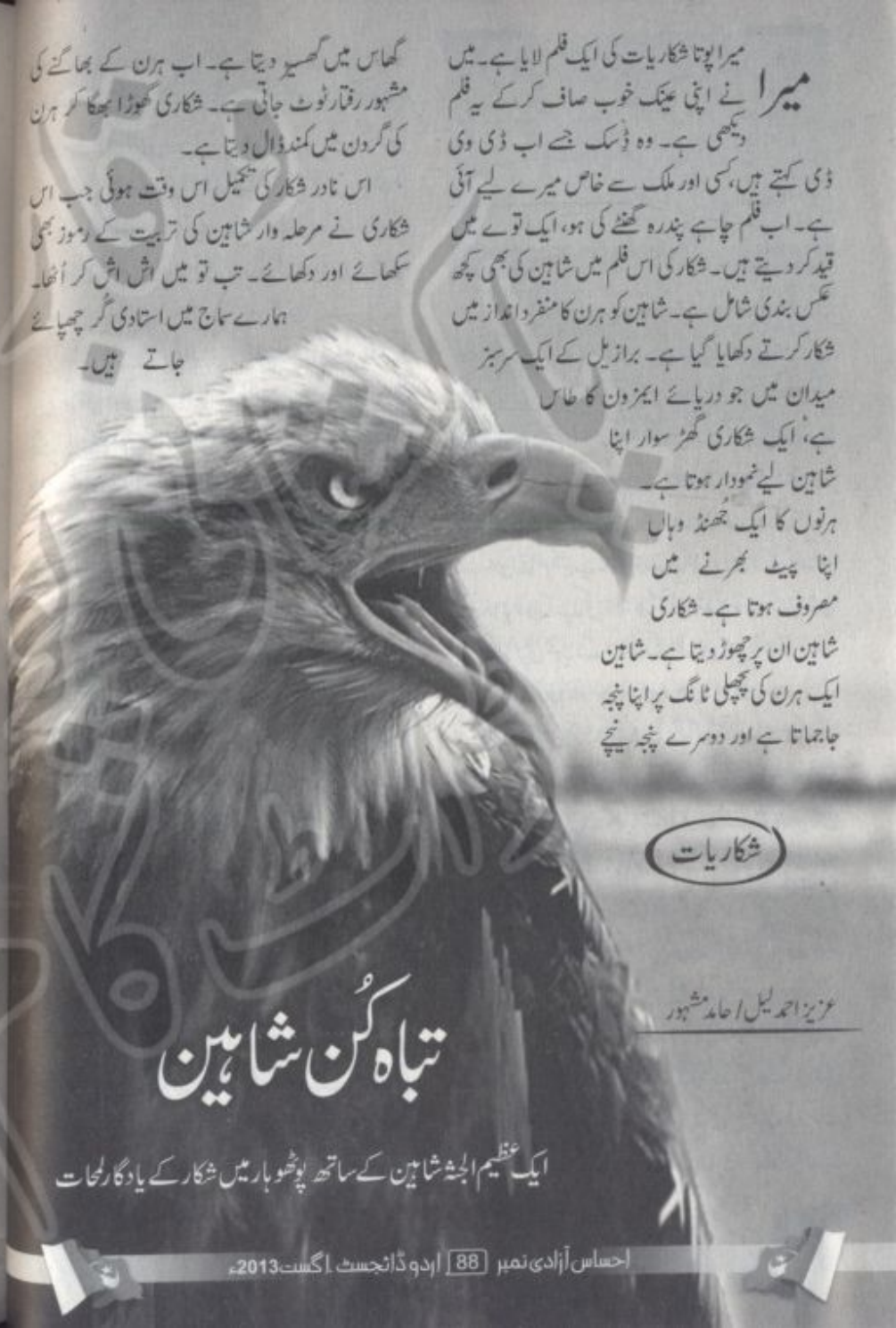

شکاریات

تباہ کُن شاہین

ایک عظیم الجثہ شاہین کے ساتھ پوٹھوہار میں شکار کے یادگار لمحات

عزیز احمد لیل / حامد مشہور

میرا پوتا شکاریات کی ایک فلم لایا ہے۔ میں نے اپنی عینک خوب صاف کر کے یہ فلم دیکھی ہے۔ وہ ڈسک جسے اب ڈی وی ڈی کہتے ہیں، کسی اور ملک سے خاص میرے لیے آئی ہے۔ اب فلم چاہے پندرہ گھنٹے کی ہو، ایک توے میں قید کر دیتے ہیں۔ شکار کی اس فلم میں شاہین کی بھی کچھ عکس بندی شامل ہے۔ شاہین کو ہرن کا منفرد انداز میں شکار کرتے دکھایا گیا ہے۔ برازیل کے ایک سرسبز میدان میں جو دریائے ایمزون کا خاص ہے، ایک شکاری گھڑ سوار اپنا شاہین لیے نمودار ہوتا ہے۔ ہرنوں کا ایک جُھنڈ وہاں اپنا پیٹ بھرنے میں مصروف ہوتا ہے۔ شکاری شاہین ان پر چھوڑ دیتا ہے۔ شاہین ایک ہرن کی پچھلی ٹانگ پر اپنا پنجہ جاجماتا ہے اور دوسرے پنجہ نیچے گھاس میں گھسیر دیتا ہے۔ اب ہرن کے بھاگنے کی مشہور رفتار ٹوٹ جاتی ہے۔ شکاری گھوڑا بھگا کر ہرن کی گردن میں کمند ڈال دیتا ہے۔

اس نادر شکار کی تکمیل اس وقت ہوئی جب اس شکاری نے مرحلہ وار شاہین کی تربیت کے رموز بھی سکھائے اور دکھائے۔ تب تو میں اش اش کر اُٹھا۔ ہمارے سماج میں استادی گُر چھپائے جاتے ہیں۔

حکما مجرب نسخے سینے میں چھپائے دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ علم و ہنر کو چھپانا نہیں چاہیے۔ اس شاہین کی تربیت شکار کے علاوہ دیگر کسی فلاحی اور سائنسی مقصد کے تحت بھی کی جاسکتی ہے کہ شاہین ایک بلند پرواز اور قوی پرندہ ہے۔ یہ کسی بھی مخصوص آلے (Device) کو اس بلندی تک لے جاسکتے ہے جہاں انسان بھاری مشینوں اور دقت طلب مہنگے سہاروں کا محتاج ہوتا ہے۔

شاہین دیکھ کر مجھے ایک شکار یاد آگیا جو کبھی ہم نے کیا تھا۔ کہانی آپ کی نذر ہے۔

اس انگریز زمیندار کے پاس ایک شان دار شاہین تھا، اتنا بڑا شاہین جو ایک چھوٹے ہرن کو بآسانی اٹھا سکتا تھا۔ اس صحت مند اور جوان عمر انگریز کا نام تھا ''جیکب'' اور اس کی بیوی تھی ''جین''۔ یہ شادی کے بعد دنیا کی سیر کرنے نکلے تو برِصغیر بھی چلے آئے۔ موسمِ سرما کے اختتام کے قریب میری ملاقات ان سے پوٹھوہار کے علاقے میں ہوئی تھی۔

پوٹھوہار تقسیم ہند کے بعد پاکستان کا نصیب ٹھہرا۔ میں پوٹھوہار کا شکاری نہیں۔ یہ ایک بالکل خاص علاقہ ہے اور اس کے شکاری بھی خاص ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ اب پوٹھوہار بھی بدلتا چلا جارہا ہے۔ تاہم اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس علاقے میں ٹیلے، برساتی نالے، چھوٹے بڑے بلند اور پستہ درختوں کے جھنڈ کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں..... اور ویرانہ! تو جناب ویرانہ بھی خوب پایا جاتا ہے۔ آپ اگر لاہور یا گجرات سے راول پنڈی جائیں تو گاڑی میں سے اس کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔ خارپشت، گوہ، بھیڑیا، سانپ، ناگ، سور، خرگوش، گیدڑ اور لومڑی یہاں اکثر نظر آجاتے ہیں۔ کئی کم یاب اور قیمتی پرندے بھی ادھر پائے جاتے ہیں۔ کچھ پرندے یہاں کے مستقل باسی ہیں اور باقی ہر سال سرد علاقوں سے چند ماہ کے لیے ادھر آتے ہیں۔

پوٹھوہار میں کبھی پاڑھے اور ہرن بھی خال خال ہوتے تھے۔ اسی طرح چیتا اور شیر یہاں عام نہیں ہوتے کہ اس خطے میں بڑے جنگل موجود نہیں۔ ہاں بعض اوقات کشمیر یا دوسرے علاقوں سے شیر اور چیتا بھوک کے زیرِ اثر ادھر آجاتے تھے۔ تب وہاں خوب اودھم مچتا تھا۔

پوٹھوہار کی زمین اُونچی نیچی ہے اور موسم ایسا کہ پل میں کچھ تو پل میں کچھ۔ آپ گھر سے سر پر چھاتا تان کر نکلیں کہ دھوپ سے بچت ہو تو گاؤں سے ذرا دور جا کر ایسا چھاجوں مینہ برسے گا کہ گویا دھوپ ہزار سال سے ادھر تھی ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں برساتی نالے اور زیرِ زمین کھال ہوتے ہیں۔ برساتی نالا جو بارش میں جان لیوا نظر آتا ہے اور ایک گھنٹے بعد ایسا شانت ہو جاتا ہے کہ آپ کے لیے پایاب۔

زمین ہموار نیست موسم، اعتبار نیست

رہی بات زیرِ زمین کھالوں کی تو اگر آپ کی انتہائی قیمتی شے بھی اس میں چلی جائے تو آپ اس کا تعاقب نہ کریں، چاہے آبی گزرگاہ خشک ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ آپ کو اور شے دے دے گا مگر زندگی نہ گنوائیں کہ وہاں کے باسی بھی اکثر ان کھالوں کے اندر کی دنیا کا حال نہیں جانتے۔ موذی جانور، بے پناہ حبس، زہریلی گیس اور راہ کی بھول بھلیاں..... الامان۔

مجھے پوٹھوہار میں شکار کے لیے ایک صاحب نے بُلایا تھا۔ ان کا اصل نام تو میری ڈائری میں درج ہے مگر میں بدل کر ملک ریاض لکھ رہا ہوں کہ ان کی تمنا ہے کہ ان کا نام صیغۂ راز میں رکھا جائے وہ اب زندگی

کے آخری ایام گزار رہے ہیں۔

ٹرین کا سفر کر کے ہم پوٹھوہار کے ایک چھوٹے سے سٹیشن پر جا اُترے۔ جوان العمر ملک ریاض تانگے اور یکے لے کر ہمارا استقبال کرنے آیا ہوا تھا۔ اس وقت ملک نے پینٹ کوٹ کے ساتھ نکٹائی سجا رکھی تھی۔ اس کی نکٹائی بالکل ایسی تھی کہ گویا سانڈ کے گلے میں گھنٹا باندھ رکھا ہو۔ ہم اس کے ساتھ اس کے گاؤں جا پہنچے۔ ریاض کا گھر خاصا بڑا تھا اور گاؤں کے دیگر مکانات سے قدرے بلند بھی۔ ریاض ایک حاضر سروس کرنل کا بیٹا تھا۔ اس کا دادا انگریزوں کی فوج کا کنٹریکٹر رہا تھا۔ اس نے بڑا مال کمایا تھا۔

ملک ریاض جو باغوں اور وسیع زمین کا مالک تھا، شکار کا شوقین تھا۔ اس نے کتے بھی پال رکھے تھے مگر ان کی تربیت مکمل نہیں تھی۔ چند ہفتے قبل کسی پوٹھوہاری شکاری گروہ نے اسے اپنے گروہ سے خارج کر دیا تھا۔ ان ہی دنوں ان کے گاؤں پر بھیڑیے حملہ کرنے لگے۔ یہ بھیڑیے بھی خوب پلے ہوئے تھے۔ بھیڑیوں نے دو بکریاں کھالیں، پانچ میمنے اٹھا لیے بلکہ چار افراد کو زخمی بھی کر ڈالا۔ ایک پندرہ سال کی لڑکی بیر توڑنے گئی تو بھیڑیوں نے ہلّا بول دیا۔ اس کی سکھیاں چیختی چلاتی بھاگ اُٹھیں..... لڑکی کی لاش بھی نہ ملی۔ چنانچہ ریاض نے مجھ سے رابطہ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناتجربہ کار پوٹھوہاری شکاری بھیڑیوں سے نمٹ نہ سکے تھے۔

ریاض علاقے سے بھیڑیوں کا خاتمہ چاہتا تھا تاکہ علاقے میں اس کے خاندان کی دھاک بیٹھ جائے دوسرے وہ ہم سے شکار کی تکنیک سیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے کتوں کو سُراغ رسانی بھی سکھانا چاہتا تھا، جو اتنے اچھے کھوجی نہیں تھے۔ وہ اپنے حریف شکاری گروہ سے بہتر کارکردگی دکھانا چاہتا تھا جو چھوٹے چھوٹے شکار پر ہی قانع تھا۔

ہماری آمد کی خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ سارا گاؤں ہمارے کتے دیکھنے آیا تھا۔ البتہ ہم سے کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ شکار اور رکھوالی کے لیے کتے پالنا چونکہ وہاں اس دور میں عام تھا، اس لیے لوگ جوق در جوق ادھر کا رُخ کرنے لگے۔ وہ شکاری گروہ جو ریاض کو خارج کر چکا تھا، بھی آیا مگر ساتھ ایک معزز بوڑھا بھی لایا تاکہ وہاں دنگا فساد نہ ہو۔ ریاض نے اس حریف گروہ کو چڑانے کے لیے ہمارے کتوں کا ذکر کچھ یوں مرچ مصالحہ لگا لگا کر کیا کہ کتے نہ ہوں، سکاٹ لینڈ یارڈ کے جاسوس ہوں، جو کمانڈو ایکشن کا بھی خصوصی تجربہ رکھتے ہوں۔

ملک ریاض کے مخالف گروہ نے میری مہارت جانچنے کے لیے کچھ سوالات بھی کیے اور طنزیہ مسکراہٹ بکھیری۔ ریاض نے مجھے بتایا کہ وہ دِلّی میں اس طرح کے افراد سے کئی کترانا سیکھ چکا تھا۔ اس نے مزید کہا کہ کل گھوڑوں کا انتظام نہیں ہوگا، کل ہم پیدل ہی شکار کریں گے۔

شام رات میں ڈھل رہی تھی۔ ہمارے لئے دسترخوان بچھا دیا گیا۔ اسی وقت ایک بھاری بھرکم جیپ میں میاں بیوی جیکب اور جین وہاں آن پہنچے۔ ان کا ذکر کہانی کے آغاز میں کر چکا ہوں۔ وہ ریاض کے والد کے حوالے سے وہاں آئے تھے۔ انہیں بھی شریک طعام کیا گیا۔ اب گاؤں میں گورا گوری کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھی مگر ریاض کے ملازم نے عوام کو مہمان خانے کے باہر ہی روکا ہوا تھا کہ مہمان تسلی سے کھانا کھالیں۔

جیکب کے پاس ایک شان دار شاہین تھا۔ جیکب کھانا کھاتے ہوئے اسے بھی گوشت کے ٹکڑے کھلاتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم عوامی ہال میں آگئے کہ

عوام مہمانوں سے ملنا چاہتے تھے۔ اس وقت وہاں کوئی 60 افراد موجود تھے۔ اب یہ ہمارے کتوں کے بجائے گورے، گوری اور ان کے شاہین کو دیکھنے آئے تھے۔ ایک لڑکا ہمارے لیے لذیذ اور گرم پنیاں بھی لایا تھا۔ ایک بابا جی ہمارے لیے اور ہمارے کتوں کے لیے دو بالٹیاں دودھ کی بھر لائے تھے۔ وہ یہ خدمت روزانہ کرنا چاہتے تھے۔ انگریز میاں بیوی عوام کے خلوص سے بہت خوش ہوئے۔

جیکب نے ہمیں بتایا کہ اس کی بیوی ''آپا، باجی اور بہن جی'' جیسے خطابات سے بہت خوش ہوتی تھی، جو اسے برِصغیر میں جابجا ملے تھے۔ وہ بولا ''ایک اور خطاب میں اب بھول گیا ہوں۔''

''بھابھی۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''او یس مسٹر ہنٹر!'' وہ ہنسا ''پوٹھوہار ود گریٹ میموری۔''

پھر تعارف کا سلسلہ دراز ہوا اور باتوں نے سر اُٹھایا۔ وہ میاں بیوی بمبے سے چلے تھے اور ان کا عزم اب وادی شابان تک کا تھا۔ جین نے انگریزی میں کہا کہ وادی شابان بہت حسین علاقہ ہے مگر ہم سب شابان سے ناواقف تھے، سو حیران ہو کر رہ گئے۔

تب جین نے ہم سب لاعلم افراد کو بتایا ''یہ وادی بلوچستان میں کوئٹہ کے پاس ہے۔ وہاں زیتون کے درخت عام ہوتے ہیں۔ پھر چشمے اور حسین راستے..... پھلوں میں سیب، چیری، آڑو اور خوبانی نمایاں ہیں..... چکور جیسا حسین پرندہ ان سب پر مستزاد۔ وادی شابان کو وادی زرغون غر بھی کہتے ہیں۔'' میں نے میاں بیوی کی تعریف کی کہ وہ اس قدر تحقیق کے بعد سیر پر نکلے ہیں۔

بھگت سنگھ نے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ بہت جلد اپنے مینڈھے بیچ کر وادی زرغون غر کی سیر کو جائے گا۔

پھر وہاں پر موجود لوگوں کی فرمائش پر جیکب نے اپنا شاہین پنجرے میں سے باہر نکالا۔ تمام شکاری پرندے باز، شکرا اور عقاب بڑی احتیاط سے پکڑے جاتے ہیں کہ یہ گوشت کھاتے ہیں۔ ان کے ہینڈلرز اپنی آنکھوں پر مضبوط چشمہ لگاتے ہیں۔ پرندے کی ٹانگوں میں لوہے کی پتلی سی زنجیر باندھ کر اس کا دوسرا سرا وہ اپنے ہاتھ یا بازو کے گرد لپیٹ لیتے ہیں۔ ایسے خطرناک پرندے کو اکثر اوقات لمبی ٹوپی بھی پہنائی جاتی ہے کہ اس کی آنکھیں ڈھک جائیں اور وہ کچھ نہ دیکھ سکے۔ یہ ٹوپی اسی وقت اتاری جاتی ہے جب پرندے کو شکار پر چھوڑنا مطلوب ہو۔ اس ٹوپی کے کیا کہنے..... اُمرا تو اپنے شکاری پرندوں کو سونے کی ٹوپیاں بھی پہناتے ہیں۔ ویسے جیکب اپنے شاہین کو سوتی کپڑے کی ٹوپی پہناتا تھا۔

جیکب کے پاس جو شاہین تھا، وہ بہت زبردست تھا۔ نام اس کا گرینڈ تھا۔ جیکب اسے نام لے کر پکارتا تھا تو وہ فوری متوجہ ہوتا۔ اس عظیم الجثہ شاہین کا زیادہ تر جسم بھورے پروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ تاہم اس کا کراؤن یعنی سر کا بالائی حصہ سفید تھا۔

گرینڈ کے کندھے اور رانیں سفید پروں سے مزین تھیں۔ باقی نوے فی صد جسم بھورا ہی تھا۔ یہ ایک بہت بڑا شاہین تھا، جو بہت وزنی تھا اور اس کے دراز پَر دور دور تک پھیل جاتے تھے۔ جیکب نے مجھے بتایا ''میں نے خود اپنا گرینڈ شکار کے لیے تیار کیا ہے۔ شاہین پالنا، تیار کرنا اور اس سے پھر شکار کرنا، ہماری خاندانی روایت ہے۔''

شاہین پر اس وقت تک میں ایک معتبر کتاب پڑھ چکا تھا جو یورپ سے چھپی تھی۔ میں نے اس کتاب کی روشنی میں جیکب کے ساتھ تبادلہ خیالات کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ جین کو شاہین کی بجائے کتوں سے رغبت تھی۔ وہ یورپ میں کتوں اور فیرٹس کی مدد سے سور، خرگوش اور لومڑی کا شکار

کر چکی تھی۔ اس نے ہمارے کتے دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا کہ ایسے پس ماندہ علاقے میں بھی اچھے کتے موجود تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ فیرٹ (Ferret) برِصغیر میں نہیں پایا جاتا۔

باتوں باتوں میں جیکب اور جین نے ہمارے ساتھ شکار پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو ہم نے بخوشی آمادگی ظاہر کردی۔ میں نے اس سے پہلے کبھی شاہین کو شکار کرتے اور لاکر مالک کے سپرد کرتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ حصولِ معلومات اور علم افزائی کا اچھا موقع تھا۔

تب ہم کتوں سمیت چہل قدمی کے لیے گاؤں سے باہر نکل گئے۔

دیوان خانے میں واپس آکر میں نے ریاض کی مدد سے علاقے کا نقشہ بنایا اور بھیڑیوں کی واردات اور رہائش کے علاقے نمایاں کردیے۔ ایک بھرپور نیند کے بعد ہم شکار پر نکلے۔ ریاض ہمیں علاقے سے آگاہ کرتا گیا۔ وہاں دھرتی ایسی تھی کہ اگر تین افراد درمیان میں سو سو گز کا فاصلہ رکھ کر چل دیں تو بعض اوقات نشیب و فراز کے سبب ایک دوسرے کو دیکھ نہ پائیں۔

راستے میں ہمیں پوٹھوہاری شکاری بھی ملے۔ پوٹھوہاری شکاری اس زمانے میں صرف خرگوش، لومڑی، سؤر اور گیدڑ شکار کرتے تھے، زیادہ ہمت کی تو بھیڑیا مارلیا۔ بڑا درندہ چوں کہ ادھر بہت ہی کم ملتا تھا، پس یہ بڑے شکار بالخصوص آدم خور جانور کے شکاری تجربات سے قریباً محروم ہی رہتے تھے۔ یہ کوئی 15 افراد کا گروہ تھا، جو ہمیں ملا۔ ان کے ساتھ کتے بھی خاصے تھے۔ ایک لڑکے نے، جس کے ہاتھ میں، ایک مکسڈ ٹیریئر کی زنجیر تھی، ہمیں دائیں بازو کی طرف جانے سے منع کیا۔ مگر یہ علاقہ ہمارے نقشے میں نمایاں تھا۔

"چڑیلوں کے ڈیرے ہیں، سارا علاقہ سخت اور بھاری ہے۔" لڑکا بولا تو اس گروہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"جنات کا وجود اپنی جگہ حقیقت ہے مگر ہم تو اس علاقے میں ضرور جائیں گے کہ ہمیں بھیڑیوں کی تلاش ہے۔" میں نے یہ کہا تو اس شکاری گروہ کا ملا جلا ردِعمل سامنے آیا۔

ایک مرد بولا "کوئی خود ہی کنویں میں کودنا چاہے تو بھی ہم اسے منع کریں گے۔"

دوسرا مرد بولا "تمھارے پاس چڑیلیں ہیں؟"

"چڑیلیں تو خیر نہیں..... جن بھوت ہیں۔" میں نے محمد انور اور بھگت سنگھ کو آگے کرتے کہا تو سب ہنسنے لگے۔

"تیری پھر مرضی چاچا!" وہی لڑکا بولا "ماہی انور کے گھر سے چڑیلوں نے دس سیر دیسی گھی کھالیا تھا۔ چھلی راجپوت ایک جن کے گھٹنے تلے آتے آتے مشکل سے بچا تھا، پھر اسے پانچ دن بخار رہا۔ کل، پرسوں اور ترسوں..... تین راتوں کو میں نے خود آدھی رات کو، ادھر اس علاقے میں انگارے نکلتے دیکھے ہیں، جو سیدھے آسمان کی طرف جاتے ہیں۔"

باقی افراد نے بھی کچھ ایسے ہی تاثرات پیش کیے۔ میں نے انہیں سمجھایا "جنات بعض اوقات انسانوں کو تنگ کرتے ہیں مگر ان کی خاطر ہم دنیا سے کنارہ تو نہیں کرسکتے۔ کوئی ایک واقعہ ہو تو لوگ یوں مرچ مصالحہ لگا لگا کر پیش کرتے ہیں۔ تم قرآن پڑھ کر ہمارے ساتھ ہی چلو۔"

ان لوگوں نے کہا "ہم قرآن ضرور پڑھیں گے مگر

ادھر نہیں جائیں گے، کبھی نہیں جائیں گے۔"

قرآن پڑھ کر تب ہم وہاں سے دائیں بازو کی طرف چل پڑے۔ جیکب اور جین ایک ماہ سے برِصغیر میں تھے اور اُردو کے چند الفاظ سے ہی آگاہ تھے۔ ان کے سوال پر میں نے پنجابی اور پوٹھوہاری میں ہونے والی ساری گفتگو انہیں انگریزی میں سنادی۔ تب وہ بولے "ہم پر بھی قرآن پڑھ کر پھونک دو۔"

ہم اس "ممنوعہ اور حساس" علاقے میں داخل ہوئے تو دو موٹے تازے خرگوش قابو آگئے۔ میں نے خرگوش جین کو تحفہ میں دے دیے کہ وہ اس شکار کی شوقین تھی۔ ایک بلند ٹیکری پر چڑھ کر ہم نے دور دور تک کا جائزہ لیا۔ یہ خاصا سرسبز علاقہ تھا، جس پر بہار اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ جیکب نے اپنا شاہین اپنے کندھے پر بٹھا رکھا تھا کہ اچانک ہمیں جنگلی کبوتروں کا غول نظر آیا جو گھاس میں سے کچھ چگ رہا تھا۔

جیکب نے اپنے پرندے کے پیروں سے بندھا بندھن کھولا، اس کے سر سے ٹوپی اُتاری اور اس کی توجہ کبوتروں کی طرف دلانے کی نوبت ہی نہ آئی کہ اس نے اپنی فطرت کے عین مطابق کبوتروں کو دیکھتے ہی بے تابی کا اظہار کیا۔ شکاری نے خاص رمز کے ساتھ کبوتروں کے لیے شاہین چھوڑا تو وہ تیر کی طرح ان پر جا ٹوٹا۔

کبوتروں نے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر شاہین نے ایک موٹا کبوتر منتخب کرلیا تھا۔ جوں ہی شاہین کبوتر پر جھپٹا، کبوتر نیچے کو غوطہ دے گیا۔ تب شاہین نے پرواز بند کرکے، ہوائی جہاز کی طرح غوطہ لگایا اور کبوتر دبوچ کر جیکب کے حوالے کردیا۔ شکاری نے شاہین سے کبوتر لیتے ہی اسے انعام کے طور پر گوشت کا ٹکڑا کھلایا۔

ہمیں بھیڑیوں کے کچھ تازہ کھُرے مل گئے تھے۔ کتے انہیں سونگھ سونگھ کر ان کی جانب بھاگنے لگے۔ ہم جلد ہی خون خوار بھیڑیوں تک جا پہنچے۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ برِصغیر کا بھیڑیا جسمانی طور پر دنیا کے کئی بھیڑیوں سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ ہم نے تین بھیڑیے پہلے بلّے میں ہی مار ڈالے، جال ڈال کر دو زندہ پکڑ لیے جبکہ باقی بھاگ نکلے۔ بھاگنے والوں میں سے کچھ دور جا کر دو ہمارے کتوں نے مار ڈالے اور چار ہم نے گولیوں سے اُڑا دیے۔ اس کے باوجود کچھ بھیڑیے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ اگر اس دن ہمارے پاس گھوڑے ہوتے تو ہم ان کا تعاقب کرکے انھیں بھی مار دیتے۔ زندہ بھیڑیے ہم نے باندھ کر وہاں ڈال دیے۔ ملک ریاض کو اُمید تھی کہ اس کے گھوڑے آج گھر آگئے ہوں گے۔ وہ واپس آکر ان بھیڑیوں کو لے جانا اور پالنا چاہتا تھا۔

سہ پہر کو ہم واپس چل پڑے۔ واپسی پر جیکب نے تین پرندے اور شکار کیے..... ایک بھاری بھرکم خرگوش بھی گرینڈ اٹھا لایا، جس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ ریاض کے گھر اس کے تین گھوڑے واپس آچکے تھے، جو سواروں کو لے کر کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ اسی وقت جا کر گرفتار شدہ بھیڑیوں کو لانا چاہتا تھا۔ اس کے اس فیصلے کی مخالفت کی گئی کہ شام رات میں بدل رہی تھی اور وہ خطہ آسیب زدہ تھا۔ لیکن ریاض کی شدید خواہش تھی کہ وہ واپس جائے۔

ریاض نے تین گھوڑے مستعار لیے تھے، یہ شکار میں بھی استعمال ہونے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت روشنی اور اسلحہ لے کر چلا گیا۔ شاید دن کے وقت سے وہ ہمارے رویے سے متاثر ہو کر اس خطے کو کم خطرناک گردانے لگا تھا۔ بہر حال وہ ناکام واپس آئے۔ انھوں نے بتایا کہ بھیڑیے وہاں موجود نہیں تھے۔ ان سے

بندھے رسے بھی غائب تھے۔ لوگ اسے پھر جنات کی کارستانی قرار دینے لگے۔

مگر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے یہ سوچ کر کہ جب جنات ہمارے متعلق باتیں نہیں کرتے تو ہم کیوں ان کے متعلق مغز کھپائیں؟

اُدھر جیکب کچھ اور سوچ رہا تھا، بولا "یہاں کے لوگ انگریزوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں۔"

"وجہ تو آپ کو معلوم ہوگی؟" میں نے کہا۔

جین بولی "ہم وجہ جانتے ہیں۔ ایک قوم دوسری قوم کو غلام بنائے گی تو نفرت ہی پیدا ہوگی۔"

جیکب نے کہا "میں ٹیپو سلطان کا بڑا احترام کرتا ہوں، اس نے آزادی کی خاطر کتنی جدوجہد کی اور آخر کار جان دے دی..... انگریز قوم کو اب اپنا قبضہ ختم کرنا چاہیے۔"

ہم شکار کی بھاگ دوڑ سے تھکے ہوئے تھے۔ مختصر چہل قدمی کے بعد سو گئے۔ اگلے دن ہم پھر گھوڑوں پر شکار کے لیے نکلے۔ راہ میں مجھ سے جیکب نے پوچھا "مسٹر عزیز احمد! برِصغیر میں شاہین اور باز سے کہاں کہاں شکار ہوتا ہے۔؟"

"برِصغیر بہت بڑا ہے۔ اس میں پچاس انگلستان سما سکتے ہیں۔ یہاں مختلف علاقوں میں شاہین اور باز سے شکار کیا جاتا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "تلور بہت قیمتی پرندہ ہے۔ اس کا شکار کسی طاقت ور شکاری پرندے سے کیا جاتا ہے۔ تھر، چولستان اور راجستان میں ایسا شکار ہوتا ہے۔ تلور انتہا درجے کا تیز رفتار ہوتا ہے۔ شکاری پرندہ اکثر اوقات اس کے تعاقب میں میلوں دور نکل جاتا ہے اور کھو بھی جاتا ہے، بعض اوقات جب پرندہ تلور کے پیچھے چھوڑا جاتا ہے تو شکاری اس کے پیچھے اپنے گھوڑے بھگاتے ہیں۔ پھر بھی یہ کام بڑا مشکل ہے۔ تلور کو زبردست رفتار میں نچا دینا بھی آتا ہے۔"

"کیا یہ تلور بہت قیمتی ہوتا ہے؟" جین نے پوچھا۔

"بس شاہین سے کم مول پاتا ہے..... پھر بھی بہت دام ہوتے ہیں اس کے۔"

کہانی روک کر میں قارئین کو بتاتا چلوں کہ اب جدید آلات کی بدولت شکاری پرندے کا کھوج بھی سائنسی ہو چکا ہے۔ تلور کے پیچھے جو پرندہ چھوڑا جاتا ہے، اس کے ساتھ مائیکروچپ لگی ہوتی ہے۔ نیچے جیپوں میں موجود کمپیوٹر اس چپ کا سراغ پا کر دور دور تک اس کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔ اس زبردست بندوبست کے باوجود عقاب اور باز کھو سکتے ہیں، کیوں کہ کچھ کھو جانا اور کچھ پالینا شکار کا حصہ ہے، اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

اگلے روز شکار کے آغاز میں ہی جیکب نے ایک بہت بڑے پرندے پر اپنا شاہین چھوڑا۔ پرندہ شاہین کو بار بار پینترا بدل کر ناکامی سے ہمکنار کرتا رہا۔ اس کے بعد شاہین ہوا میں اس پرندے سے زیادہ بلند ہو گیا۔ جیکب نے بتایا کہ اب شاہین اس پرندے پر آن گرے گا۔

لیکن حالات کچھ اور رُخ اختیار کر گئے۔ پرندہ اچانک پیچھے پلٹ گیا۔ شاہین نے بھی ایسا کیا۔ ہم نے بھی ان کے پیچھے گھوڑے ڈال دیے۔ شاہین بہت جلد پرندے تک جا پہنچا..... مگر وہ بار بار شاہین کو جل دے جاتا تھا۔

شاہین دو طرح اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ ایک پرواز بند کر کے اور دوسرا اپنے پنکھ بند کر کے۔ شاہین جب پرواز بند کر کے اپنے شکار پر گرتا ہے تو اس کی رفتار ایک سو کلومیٹر فی گھنٹا ہوتی ہے۔ اس طوفانی رفتار سے کسی پرندے کا بچ جانا محال ہوتا ہے۔

تب شاہین فضا میں بلند ہو پھر اس نے اپنے پنکھ بند کیے اور سیدھا اس تیز پرندے پر جھپٹا اور اسے نیچے

میں دبوچ کر اپنے مالک کے پاس لے آیا اور اس سے انعام پایا۔ لیکن اس پرندے کو شکار کرتے ہم کافی دور نکل گئے تھے۔ تب میں نے اپنے بُزگیر کتوں کے تاثرات دیکھے۔ اس دوری میں بھیڑیے موجود تھے۔ ہم نے مزید دو بھیڑیے مار ڈالے۔

ہم جوں ہی اس علاقے میں داخل ہوئے، جہاں سے بندھے ہوئے بھیڑیے کھول دیے گئے تھے، ہمیں ملک ریاض کی طرف سے تلقین یاد آئی کہ ہم اسے زندہ بھیڑیے ضرور پکڑ کر دیں۔ ہم ایک موڑ سے مڑے تو سامنے ایک جوان مرد آتا دکھائی دیا۔ اس ویرانے میں، جہاں لوگ جنات کا بسیرا خیال کرتے تھے، ایک صاحب مطمئن چلے آ رہے تھے۔

ملک ریاض نے اسے روک لیا۔ "میں سوہاوا کا ہوں۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

سوہاوا اس زمانے میں ایک بڑا گاؤں تھا اور بس۔

ریاض نے سوہاوا کے چند مشہور افراد کے نام پوچھے، اجنبی کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ دے پایا۔ پھر اس نے اپنا تعلق گوجر خان سے ظاہر کرنا چاہا کہ سوہاوا میں وہ ابھی منتقل ہوا تھا۔ گوجر خان کے افراد ریاض کے ساتھ دلّی میں رہتے تھے۔ ریاض وہاں کے سرکردہ افراد کو جانتا تھا۔ اجنبی انھیں بھی نہیں جانتا تھا۔ تب اجنبی نے اپنا تعلق "جہلم" سے ظاہر کیا تو ریاض نے گھوڑے سے جھک کر اس شخص کا گریبان پکڑ لیا کہ اس جھوٹے نے ہی اس کے بھیڑیے کھول کر بھگائے تھے۔ اس شخص نے بھی لباس میں سے ہتھیار نکال کر ہم پر تان لیا۔

ہمارے پاس ہی ایک بلند اور چوڑا ٹیلا تھا، جس پر درختوں کی بہتات تھی۔ اچانک وہاں سے ایک نسوانی آواز گونجی "جوان! اسے چھوڑ دے اور واپس چلا جا۔"

نصیب کا رزق

شیخ ابو یعقوب بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حرم شریف میں دس روز تک بھوکا رہا۔ یہاں تک کہ میں ضعیف ہو گیا۔ میرے دل نے چاہا کہ میں جنگل کو نکل جاؤں۔ شاید کوئی ایسی چیز پالوں جس سے بھوک سے نجات مل جائے۔ راستے میں ایک شلجم پڑا ہوا زمین پر پڑا ملا۔ میں نے اس کو اٹھا لیا مگر میرے دل میں اس حرکت سے وحشت اور اضطراب پیدا ہو گیا۔ میں نے وہ شلجم پھینک دیا اور مسجد حرام میں چلا گیا اور بیٹھا رہا۔ اچانک ایک آدمی آیا اور آ کر میرے روبرو بیٹھ گیا۔ اس نے ایک تھیلی میرے سامنے رکھ کر کہا "یہ پانچ سو اشرفیوں کی تھیلی میرے واسطے ہے۔"

میں نے اس سے کہا "یہ خاص میرے واسطے کیوں ہے؟" اس نے جواب دیا "میں دس روز سے دریا میں تھا اور میری کشتی ڈوبنے کو تھی۔ اہل کشتی نے جدا جدا نذر مانی کہ اگر خدا ڈوبنے سے نجات دے دی تو کچھ خیرات کریں گے اور میں نے نذر مانی تھی کہ اگر خدا مجھے ڈوبنے سے بچا لے تو یہ پانچ سو اشرفیوں کی تھیلی خیرات کروں گا اور خانۂ کعبہ کے مجاورین میں سے جس پر سب سے پہلے میری نگاہ پڑے گی اسی کو دوں گا اور تم مجھے سب سے پہلے ملے ہو لہٰذا یہ تھیلی میں تمھیں دیتا ہوں۔"

میں نے کہا "اسے کھولو!" اس نے وہ تھیلی کھولی تو بجائے اشرفیوں کے میدے کی روٹی، مصری، چھلے ہوئے بادام اور شکر پارے اس میں تھے۔ میں نے ایک مٹھی سب میں سے لے لی اور اس نے کہا "باقی تم اپنے بچوں میں تقسیم کر دینا۔ میری جانب سے یہ ہدیہ ہے اور تمھارا ہدیہ میں نے قبول کر لیا۔" پھر میں نے اپنے جی سے کہا "اے نفس تیرا رزق دس روز سے تیری طرف چلا آ رہا تھا اور تو اسے جنگل میں ڈھونڈنے کے لیے گیا تھا۔"

(انتخاب: اویس دیپالپور)

ہم نے دیکھا، ٹیلے پر ایک موٹے درخت کے تنے کے پیچھے، ایک لڑکی ہم پر اس دور کی جدید رائفل تانے کھڑی تھی۔ یوں اوٹ میں کھڑے ہو کر نشانہ باندھنا اور للکارنا ظاہر کرتا تھا کہ وہ لڑکی جنگ کے اصول جانتی تھی۔ پھر ہمارے اوپر گدھ بہت نیچی پرواز کر کے چیخنے لگے۔

اجنبی اوپر دیکھ کر مکروہ ہنسی ہنسا۔ ”یہ گدھ میرے منتظر ہیں کہ میں انھیں انسان کی تازہ لاش کھلاؤں ابھی پرسوں ہی میں نے ان کی سیوا کی ہے۔ تم جان بچاؤ اور واپس چلے جاؤ۔“

میں نے انگریزی میں ریاض سے کہا ”ہم شکار پر نکلے ہیں، جنگ کے لیے نہیں۔ یہ دونوں مجرم ہیں، گریبان چھوڑ دو۔“ ریاض نے اجنبی کا گریبان چھوڑ دیا۔ جیکب غیر محسوس انداز میں اپنا شاہین کھول چکا تھا۔ اس نے شاہین اس مجرمہ کی طرف روانہ کر دیا اور ہم نے اپنے کتے ادھر بھگا دیے کہ لڑکی بلندی کی وجہ سے ہمارے لیے بڑا خطرہ تھی۔ پھر تڑا تڑ فائرنگ شروع ہوئی۔ اجنبی نے جیکب کو گولی ماری اور میں نے اس کا بازو بے کار کر دیا۔ لڑکی نے ہمارے دو کتے مار ڈالے اور شاہین سے بچنے کے لیے خود اس جیپ کی طرف لپکی جو پیچھے جھاڑیوں میں چھپائی گئی تھی۔ ہم نے بھی کتوں اور شاہین کا ساتھ دیا۔ اسے زخمی حالت میں پکڑا مگر تب تک شاہین نے اس کا منہ نوچ ڈالا تھا اور کتوں نے اس کی ٹانگیں۔

یہ خطرناک مفرور مجرم تھے۔ ان کا تعلق یہاں سے نہیں تھا۔ جناتی خطے کی آڑ میں یہ عارضی طور پر اس علاقے میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کی جیپ میں خاصا سامان، اسلحہ اور وائرلیس سسٹم موجود تھا۔ انھوں نے بندھے ہوئے بھیڑیے بھی اسی لیے کھول کر بھگا دیے تھے کہ جنات کا خوف اور بڑھ جائے۔ انھیں قانون کے حوالے کیا گیا تو ہمیں اچھا خاصا نقد انعام ملا۔ ان کے سر کی قیمت مقرر تھی۔ ریاض نے مجھے اسی دن اپنے دو کوہاٹی بل ٹیریئر تحفے میں دے دیے کہ میرے دو کتے مارے گئے تھے۔ یہ کتے اس نے صوبہ سرحد سے منگوائے تھے۔ بعد میں، میں نے یہ کتے کسی کو دے کر اس سے بلڈ ہاؤنڈز لے لیے تھے جو کہ درجہ اوّل کے سراغ رساں ہوتے ہیں۔

جیکب کی ٹانگ میں لگی گولی کو آپریشن سے نکال دیا گیا۔ ہسپتال میں لوگ اسے جوق در جوق دیکھنے آتے رہے۔ ریاض کے دیے کتوں نے برسوں تک مجھے پوٹھوہار میں اس تباہ کن شاہین کے ساتھ کیے گئے شکار کو بھولنے نہ دیا۔ یہ میری زندگی کا واقعی ایک یادگار تجربہ تھا۔

میں جیکب اور ریاض دونوں کو سلام کرتا ہوں.....

فرہنگ

پاڑھے: پاڑھا (ہرن کی نسل کا جانور) کی جمع

گھایل: زخمی۔ چپڑاس: چپڑ اس کا متبادل ہے۔

خط و کتابت: خط لکھنا۔ ان کی خواص (یہ خواص مؤنث ہے خاصیت کی جمع ہے)

فیرٹ (Ferret) ایک چھوٹا سا جانور، بلی سے بڑا اور کتے سے چھوٹا۔ خرگوش گلہری اور چوہے کے شکار کے لیے یورپ وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ برصغیر میں بالکل موجود نہیں۔

مکھیا: سردار۔ مکسڈ ٹیریئر: بل ٹیریئر نسل میں کوئی اور نسل سے پیدا ہوا کتا۔ ایسے کتے عموماً شکار یا رکھوالی کے لیے حاصل کیے جاتے ہیں کہ ان کے اوصاف بڑھ جاتے ہیں۔

کوہاٹی بل ٹیریئر: صوبہ خیبر پختونخوا کی خاص نسل۔ لڑاکا، تند خو اور کچھ ذہین بل ٹیریئر۔

سائنسی نقطہ نگاہ

اس صدی کے انسان کی بدنصیبی

ایک مضحکہ خیز غیر علمی اور غیر مقناطیسی مگر دلچسپ دلیل کا ماجرا جو خود اپنے وجود کے اندر ہی غیر سائنسی ہے

قاضی مظہر الدین طارق

آج کے انسان کی بدنصیبی دیکھیے کہ وہ اتنی بہت ساری معلومات کے باوجود جو مسلسل تجربات سے پرکھ بھی لی گئی ہیں، اس سے حاصل ہونے والے صاف صاف اور واضح نتائج کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ خود بہت سارے علوم سے واقف ہونے کے باوجود اپنی ہی قائم کی ہوئی ایک بنیادی فکر کا غلام ہے، اس نے ایک یک رنگی عینک پہن رکھی ہے، یہ اس کو ہر چیز کا وہی رنگ دکھاتی ہے جو اس عینک کا رنگ ہے۔ اسٹیفن ہاکینگ برطانیہ کے ایک سائنسدان ہیں جنہوں نے اپنی کتاب کا نام ہی عظیم منصوبہ (The Grand Design) رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ”یہ کائنات پہلے سے بنائے ہوئے منصوبے کے بغیر بننا ہی نہیں شروع ہو سکتی تھی، پھر کچھ طبعی قوانین (Physical Laws) تھے جو

(Self Triggerd) تھے جن کی بنیاد پر یہ کائنات آپ سے آپ اور اتفاقیہ (By Chance) یا حادثاتی (Accidental) طور پر عظیم دھماکہ سے بننا شروع ہو گئی۔" حیرت انگیز! پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ "عظیم دھماکے سے پہلے کچھ بھی نہ تھا، نہ توانائی، نہ مادّہ نہ ہی کوئی دھماکہ کرنے والا،" یعنی کہ کہتے ہیں اس دھماکے کے لیے نہ بارود تھا، نہ دیا سلائی، نہ بارود کو دیا سلائی دکھانے والا، بس دھماکا ہوگیا، اور وہ کہتے ہیں کہ اس کام کے لیے "کسی خالق (God) کی ضرورت محسوس نہیں کرتے" (Grand Design) تو موجود تھا مگر کوئی (Grand Designer) نہیں تھا، طبعی قوانین تو تھے مگر اس کا کوئی بنانے اور چلانے والا نہیں تھا، قوانین حرکت میں تھے حرکت دینے والا کوئی نہ تھا"، کیا یہ ایک انتہائی مضحکہ خیز، غیر علمی، غیر منطقی اور غیر سائنسی بات نہیں ہے؟

رویّہ

یہ رویّہ غیر علمی و غیر سائنسی ہے کیونکہ بڑے بڑے سائنسدانوں نے انسانی علم 'سائنس' کی یہی تعریف کی ہے کہ چاہے مشاہدات ہوں یا تجربات یا ان کی بنیاد پر بنائے گئے اصول و قوانین ہوں سب قیاس اور مفروضوں کی بنیاد پر انسان کے بنائے ہوئے ہیں، اس لیے ان کی بنیاد پر کوئی حتمی و یقینی بات نہیں کی جا سکتی ہے۔ سائنس نہ کسی بات کی تصدیق (Verify) ہی کر سکتی ہے نہ تکذیب (Falsify)۔ انسانی علم (سائنس) صرف ممکنہ ٹھوس حقائق (Probable Truth) کی بات کر سکتا ہے، مسلّمہ ٹھوس حقائق (Absolute Truth) بتانا اس کے بس میں ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے آپ کسی بھی احتمال (Probability) کو سائنسی بنیاد پر نہ مکمل طور پر قبول کر سکتے ہیں نہ رد اگر آپ حتمی طور پر یہ کہیں کہ "یہ کائنات کسی کے بنائے بغیر خود بخود بن گئی ہے" تو یہ ایک انتہائی غیر سائنسی رویّہ کہلائے گا۔

محنت

ان کی بدنصیبی اور بدبختی پر توجہ کیجیے کہ یہ لوگ جو بہت محنت کر رہے ہیں، بہت وقت بلکہ پوری پوری زندگیاں کھپا رہے ہیں، بڑا مال اور صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں، اس معاملے میں ان کی تعریف میں بخل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا، وہ انسان کے بنیادی سوالات کے جوابات کی تلاش میں ہیں، ہر قسم کے 'انسانی علم' کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہیں، زمین کی ایک ایک پرت میں تلاش کر رہے ہیں، ہر مادّے میں، ہر جاندار میں، چھوٹی سے چھوٹی چیز میں۔ انھوں نے اربوں کھربوں گنا بڑی کر کے دکھانے والی خُردبینیں ایجاد کیں، تاکہ جوہر (Atom) کے اندر اور زندہ حیاتیاتی خلیے (Living Cell) کے اندر تک دیکھ سکیں، دنیا کا چپہ چپہ ہی کیا اس سوال کے جواب کی تلاش میں آسمانوں اور خلاؤں کو نہیں چھوڑا، ایک ایک شہاب ثاقب (Meteorite) کا خوردبینوں سے مطالعہ کر رہے ہیں، ایک ایک شہابیے (Asteroids)، دُمدار سیارچے (Comets)، سیارے (Planets) اور ان کے چاندوں (Moons) پر تحقیق کر رہے ہیں، نہ محنت میں کوئی کسر ہے، نہ سرمایہ خرچ کرنے میں کنجوسی، مصنوعی سیارے تک خلا میں بھیج بھیج کر معلومات جمع کر رہے ہیں۔

اصل سوال

مگر اصل سوال کیا ہے جس کی تلاش میں یہ لوگ سرگرداں ہیں؟ سوال وہی ہے کہ یہ ساری کائنات اور ہم انسان کب، کہاں اور کیسے وجود میں آئے؟ ہماری ابتداء کیسے ہوئی؟ مگر ایک اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہم

کیوں کس مقصد اور کس کام کے لیے تخلیق کیے گئے؟ ہمارا اس کائنات میں کیا کردار ہے؟ کیا ہم پہلی اور آخری مرتبہ پیدا ہوئے ہیں؟ کیا ہم مر کر ہمیشہ کیلئے مٹی میں مل جائیں گے؟ کیا ہم کو ایک نئی زندگی دوبارہ عطا کی جائے گی؟

افسوس

مگر افسوس صد افسوس کہ ان کی ساری محنتیں اور کوششیں اکارت جا رہی ہیں، کیونکہ یہ لوگ اپنی تحقیقات کی بنیاد ہی غلط ڈالتے ہیں، ان کا رویّہ ذرا بھی انصاف پر مبنی نہیں ہے، ان کی فکر (Approach) انتہائی غیر علمی، غیر سائنسی، غیر منطقی اور غیر عقلی (Irrational) ہے۔ اگر کسی بات کا کھوج لگانے والا پہلے ہی یہ طے کر لے کہ اس کی مرضی کا نتیجہ آئے گا تو وہ قبول کرے گا، اس کے خلاف آئے گا تو رد کر دے گا۔ پہلے سے قائم کیے ہوئے گمان کو یقین پر ترجیح دے گا تو اس کو اپنی تحقیق میں بھی وہی کچھ نظر آئے گا جو اس کا گمان (Presumption) ہوگا، وہ اپنی محنت سے حاصل کیے ہوئے صحیح نتائج کو بھی رد کر دے گا اور اپنے علم کے مُردہ خانے میں جمع کر دے گا، اگر کوئی شخص ایک رنگ کی عینک لگا کر دنیا کو دیکھے گا تو اس کو ہر چیز کا وہی رنگ نظر آئے گا جو عینک کے شیشوں کا رنگ ہوگا، کوئی دوسرا رنگ وہ کیسے دیکھ سکے گا؟

انصاف کا تقاضا

یہ محنت کرنے والے پوری دنیا کی جامعات میں ہر مضمون کے 'انسانی علوم' میں ڈاکٹریٹ کرنے اور کرانے والوں کی ننانوے اعشاریہ نو (99.9) فی صد اکثریت نے یہ فرض بلکہ یقین کر رکھا ہے کہ یہ کائنات، یہ زمین، یہ حیات اور ہم انسان اپنے آپ از خود، اتفاقیہ، حادثاتی طور پر وجود میں آگئے ہیں، دوسرے کسی امکان و احتمال پر غور ہی نہیں کرنا چاہتے ہیں، چاہے وہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو۔

یہ سب آپ سے آپ از خود، اتفاقیہ اور حادثاتی طور پر بن جانے کا احتمال چاہے کتنا ہی کم کیوں نہ ہو، یہ لوگ اس کے علاوہ دوسری بات پر غور کرنے کیلئے تیار ہی نہیں ہیں، جو امکانات اور احتمالات نظر آرہے ہیں ان پر غور و فکر کرنے کو غیر علمی، غیر سائنسی اور غیر عقلی بات سمجھتے ہیں، وہ یہ بات ماننے کے لیے تیار ہی نہیں کہ ان ساری موجودات کا اس سے باہر کوئی مافوق الفطرت خالق (Creator) بھی ہے یا ہو سکتا ہے۔

کوئی ایسا کام ہونا چاہیے جو ان عقل کے اندھوں کی آنکھیں کھلوا سکے، ان کو انصاف پر مبنی غیر جانبدار اور حقیقی و عقلی (Rational) رویّہ کی طرف بلائے، ان کو اصل علمی، عقلی اور سائنسی طریقہ کی طرف مائل کرے اور پھر ان کے قلوب میں اپنے اور ان کے خالق (Creator) کی جگہ بنائے۔

میں یہ تو نہیں کہنا چاہتا کہ ان کو مجبور کیا جائے کہ خالق کو مانیں، میں تو صرف یہ خواہش رکھتا ہوں کہ یہ لوگ اپنی تحقیقات مکمل غیر جانبداری سے اپنے ہی بڑے بڑے سائنسدانوں کی بتائی ہوئی 'سائنس' کی اصل تعریف کے مطابق خالص (Pure) علمی انداز میں کریں، صاف اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ ہر امکان (Possibility) اور احتمال (Probability) کو انصاف کے ساتھ حق کے مطابق برابر کی اہمیت دیں اور اپنے نتائج کو اپنے پہلے سے قائم کیے ہوئے گمان (Presumptions) سے آزاد کر کے غور کرنے کے بعد نظریہ قائم کریں۔ جو کسی سائنسی اصول کے ہی تحت ہو۔

مشاہدات

بولتے اشارے

سڑکوں اور شاہراہوں پہ لگے ان اشارتی بورڈز کا ماجرا
جو زیادہ کہے بنا بھی بہت کچھ بولتے ہیں

شمس الدین

میں پیشے کے لحاظ سے چھوٹا سا صنعت کار ہوں۔ سیروسیاحت میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہر سال ایک ڈیڑھ ماہ کسی نئی جگہ کی سیاحت کرنے میں گزارتا ہوں۔ یوں مجھے نت نئی چیزیں دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ نیز دلچسپ و تلخ و شیریں تجربات بھی پاتا ہوں۔

سیروسیاحت محض پُرلطف تجربہ نہیں بلکہ اس سے معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوتا ہے۔ سفر کا ایک پہلو قرآن پاک میں آیا ہے: دنیا میں گھومو پھرو تاکہ (آثار قدیمہ سے) عبرت حاصل کرسکو۔

سفر ہی سے متعلق مشہور امریکی ادیبہ، مایا آنجلو کا قول بھی قابل مطالعہ ہے۔ وہ کہتی ہے: ''سفر شاید تعصب کا خاتمہ نہ کرسکے لیکن سفر یہ ضرور بتاتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی طرح مسکراتے، ہنستے، روتے، کھانا کھاتے، پریشان ہوتے اور مرتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسان ایک دوسرے کو سمجھنے کی سعی کریں تو دوست بھی بن سکتے ہیں۔''

سیروسیاحت کے دوران مجھے بھی تمام انسانوں کے درمیان کئی مشترک باتیں نظر آئیں۔ مثلاً تقریباً ہر ملک میں کوئی بھی زبان بولنے والا فون سنے تو کلام سے قبل ''ہیلو'' ضرور کہتا ہے۔ چاہے آپ چین میں کسی دکان دار کے ساتھ ہوں یا برازیل میں کسی ٹیکسی میں سفر کررہے ہوں۔

دنیا بھر میں انسانی زندگی کی ایک اور قدر مشترک اشاروں (Signs) والے بورڈ ہیں۔ میں اب تک کئی ممالک میں مختلف سائز، اقسام، ڈیزائن اور رنگوں کے اشارتی بورڈ دیکھ چکا ہوں۔ بعض بورڈ سڑکوں اور شاہراہوں پہ حکومت لگواتی ہے۔ کئی بورڈ نجی شعبہ لگواتا ہے۔

اشاروں کے بورڈز کو معمولی چیز نہ سمجھیے، ان کی تیاری و تخلیق میں بڑی محنت لگتی ہے۔ دراصل ہر اشارتی بورڈ ذہن میں یہ بات رکھ کر بنایا جاتا ہے کہ وہ اپنا پیغام بہت جلد اور بخوبی دیکھنے والے تک پہنچادے گا۔ وجہ یہ ہے کہ عموماً بورڈ پڑھنے والے گاڑی میں ہوتے ہیں۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ رک کر بورڈ پڑھیں اور مطلب نکالنے کی سعی کریں۔ انھیں منزل تک پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔

سڑکوں، شاہراہوں اور اہم مقامات پر نصب یہ بورڈ دیکھنے والے تک اہم پیغام یا معلومات پہنچاتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ انسان کو بھٹکنے کی دردسری اور خطرے سے بچاتے ہیں۔ وہ انسان یقیناً داد و تحسین کا مستحق ہے جسے پہلے پہل اشارتی بورڈ سے فوائد حاصل کرنے کا خیال آیا۔

دنیا کے مختلف ممالک میں گھومتے پھرتے مجھے اکثر جگہ منفرد اشاراتی بورڈ نظر آئے۔ میں ندرت سمجھ کر ہر انوکھے بورڈ کی تصویر اتار لیتا۔ چناں چہ آج میرے پاس سیکڑوں بورڈوں کی تصاویر کا مجموعہ جمع ہو چکا۔ قارئین اُردو ڈائجسٹ کی خدمت میں اسی ذخیرے سے بعض تصاویر کے متعلق انہیں بتانے جارہا ہوں۔ ان میں کچھ معلوماتی ہیں اور بعض مزاحیہ۔ پڑھیے اور لطف اٹھائیے۔

1۔ سوئٹزرلینڈ میں ایک بورڈ نظر سے گزرا۔ اس

میں پڑھنے والے کو خبردار کیا جارہا ہے کہ آگے ڈائنامیٹ سے پہاڑی پھاڑی جارہی ہے۔

2۔ کیوبا میں ایسے بورڈ کئی جگہ ریل کی پٹڑیوں کے نزدیک لگے نظر آتے ہیں۔ دراصل وہاں کراسنگ پر دروازے نہیں بس یہ بورڈ نظر آتے ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ یہاں سے ٹرین چھکا چھک، چھکا چھک گزرتی ہے، لہٰذا ہوشیار رہیے۔

> چزارہ پاوزہ کا شمار اہم اطالوی شعرا میں ہوتا ہے۔ اس نے ایک بار کہا تھا: ''اگر آپ دور دراز کا سفر تیزی سے کرنا چاہتے ہیں تو ہلکے پھلکے ہو کر کریں۔ اپنے تمام خوف، حسد، غصہ، خودغرضیاں اور برائیاں اتار پھینکیے اور پھر سفر کیجیے۔

3۔ ایک بورڈ برطانیہ میں ایک جگہ لگا ہوا تھا۔ وہاں سڑک کی مرمت ہو رہی تھی۔ تکلیف پر اظہار معذرت کے لیے میں نے اتنا مہذب اور بااخلاق طریقہ کہیں اور نہیں دیکھا۔

4۔ آسٹریلیا کی سڑک پر نصب ایک بورڈ مسافر پر عیاں کرتا ہے کہ مزید ایک کلومیٹر بعد پینگوئنوں کا علاقہ شروع ہو جائے گا۔ لہٰذا ڈرائیونگ احتیاط سے کریں۔

5۔ ایک اشارتی بورڈ فرانس میں لگا تھا جو یہ بتاتا تھا کہ آنے والی سڑک پر گھوڑا گاڑیاں بھی چلتی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ گاڑی والے ہوشیار رہیں۔

6۔ فلپائن کے ایک جزیرے میں بورڈ لگا دیکھا۔ لگتا ہے کہ یہ جزیرہ خریداروں میں بہت مقبول رہا ہوگا۔ تبھی یہ بورڈ لگا دیا گیا کہ یہ جزیرہ برائے فروخت نہیں۔

کمپیوٹر سائنس

ہارڈ ڈسک کو تیز رفتار بنائیے

اپنے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک کو تیز رفتار اور مؤثر بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

عبداللہ خان

بعض اوقات ہارڈ ڈسک کی خراب کارکردگی کے باعث کمپیوٹر کی رفتار خاصی سست ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جوں جوں ہارڈ ڈسک کی عمر بڑھے اور وہ زیر استعمال آئے تو اس کی رفتار گھٹ جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ ہارڈ ڈسک پھر کوئی چیز کاپی کرنے یا پروگرام انسٹال کرنے میں خاصی دیر لگاتی ہے۔ یہ مسئلہ یوں حل کرنا ممکن ہے کہ ہارڈ ڈسک کی رفتار بڑھا لی جائے۔ ذیل میں اس ضمن میں ایک آسان ترکیب پیش ہے۔ اسے اپنائیے اور اپنی ڈسک کی رفتار بڑھا لیجیے۔

1۔ سٹارٹ مینو پر کلک کیجیے اور 'ان' کی کمانڈ پر پہنچ جائیے۔

2۔ 'ان' پر یہ الفاظ ٹائپ کیجیے: Sysdit.exe اور پھر انٹر کر دیجیے۔

3۔ آپ کے سامنے سسٹم کنفیگریشن ایڈیٹر کھل جائے گا۔

4۔ آپ کو ایڈیٹر میں کئی ونڈوز کھلی نظر آئیں گی۔ آپ نے اسی ونڈوز کا انتخاب کرنا ہے جس پر System.ini لکھا ہو۔

5۔ اس ونڈو میں اوپر ہی آپ کو 386ENH7 لکھا نظر آئے گا۔

6۔ آپ نے درج بالا لائن کے آگے یہ مواد ٹائپ کرنا ہے (Irq14=4096)

7۔ درج بالا الفاظ لکھنے کے بعد ونڈو محفوظ (Safe) کر کے بند کر دیجیے۔

8۔ اب کمپیوٹر کو ری بوٹ کیجیے۔ آپ کمپیوٹر کو پہلے سے زیادہ تیز رفتار پائیں گے۔

کی بورڈ کو ماؤس سے چلائیے

اکثر اوقات کی بورڈ کی کوئی کی (Key) خراب ہو جاتی ہے۔ تب کی بورڈ استعمال کرتے ہوئے خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی چابیوں (Keys) کے اوپر درج لفظ مٹنے سے بھی دوران ٹائپنگ مصیبت پیش آتی ہے۔ اس مسئلے کا ایک آسان حل یہ ہے کہ آپ چھوٹا موٹا مواد ٹائپ کرنے کے لیے ڈیسک ٹاپ کی بورڈ سے کام لیجیے۔ یہ سہولت ونڈوز ایکس پی اور اس کے بعد آنے والے تمام ونڈوز میں موجود ہے۔

1۔ سب سے پہلے سٹارٹ مینو پر جائیے اور رن کمانڈ کھولیے۔

2۔ ان کے خانے میں OSK لکھیے اور انٹر دبا دیجیے۔

3۔ اگر آپ کے پاس ونڈوز ایکس پی ہے تو 'ڈیسک ٹاپ' کی بورڈ' کھل جائے گا۔ اگر ونڈوز 7 یا 8 ہے تو ایپلی کیشن سامنے آجائے گی۔ بس اسے کھولیے اور ماؤس کے ذریعے کیز پر کلک کر کے اپنا کام کیجیے۔

ونڈوز ایکس پی تیزی سے انسٹال کریں

گو ونڈوز 7 اور 8 بھی آچکی ہیں مگر پاکستان میں کئی لوگ اب بھی ونڈوز ایکس پی ہی استعمال کرتے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ یہ استعمال میں آسان ہے۔ اور اسے برتنے کے لیے مہنگا کمپیوٹر بھی درکار نہیں ہوتا۔

عام طور پر ایکس پی انسٹال ہونے میں 30 تا 40 منٹ لگاتی ہے۔ لیکن اسے سرعت سے انسٹال کرنے کا طریق کار بھی موجود ہے۔ اسے اپنانے سے عام رفتار والا کمپیوٹر بھی 15 تا 20 منٹ میں اسے انسٹال کر ڈالے گا۔ آج کے لوڈشیڈنگ والے زمانے میں بیس پچیس منٹ کی بچت معمولی بات نہیں۔ طریق کار درج ذیل ہے۔

سب سے پہلے بوٹ ایبل سی ڈی کے لیے ایکس پی کی فائلیں ڈرائیو سی میں انسٹال کریں۔ اس سے قبل ڈرائیو سی کو NTFS فارمیٹ پر کر لیں۔

جب فائلیں انسٹال ہو جائیں گی تو کمپیوٹر ری اسٹارٹ ہو گا۔ جب آپ کو ایکس پی لوگو دکھائی دے تو شفٹ + F10 کو دبائیے۔ آپ کے سامنے کمانڈ پرومپٹ کھل جائے گا۔

کمانڈ پرومپٹ پر Taskmgr لکھیے۔ آپ کے پاس ٹاسک منیجر کھل جائے گا۔

اب منیجر میں Process ٹیب پر جائیے اور وہاں Setup.exe فائل ڈھونڈیے۔ مل جائے تو Setup.exe پر رائٹ کلک کیجیے۔ جو ونڈوز کھلے اس میں Set Priority تلاش کیجیے۔

اس جگہ آپ کو سب مینو نظر آئے گا۔ وہاں پرائیوریٹی نارمل (Normal) پر سیٹ ہو گی۔ آپ

آئن اسٹائن کا بیان

امریکی حکومت نے دنیا کے مشہور سائنسدان آئن اسٹائن سے سوال کیا۔ ''اگر ایٹم بم دوسری جنگ عظیم کا ہتھیار تھا تو تیسری جنگ عظیم میں کون سے ہتھیار استعمال ہوں گے؟''

جواب دیا ''مجھے تیسری جنگ عظیم کے بارے میں تو معلوم نہیں۔ البتہ میرا اندازہ ہے کہ چوتھی جنگ عظیم میں لوگ پتھر کے بنے ہوئے نوکدار ہتھیار استعمال کریں گے۔''

(مرسلہ: شاہد ملک، گوجرہ)

پرائیوریٹی ہائی (High) یا نارمل سے اوپر سیٹ کر دیں۔ اس عمل کی تکمیل کے بعد ونڈوز ایکس پی تیزی سے انسٹال ہو جائے گی۔ یہ نسخہ آزما کر دیکھیے۔

www ٹائپ کرنے کی ضرورت نہیں

کئی لوگ براؤزر کی ایڈریس بار میں ویب سائٹ کا پورا پتا لکھتے ہیں۔ مثلاً www.google.com حالانکہ صرف google.com کھلنے سے بھی ویب سائٹ کھل جاتی ہے۔

براؤزر کے مفید شارٹ کٹ

دنیائے انٹرنیٹ میں آسانی اور تیزی سے گھومنے پھرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان براؤزر کے چند ضروری شارٹ کٹ ذہن نشین کر لے۔ ذیل میں کچھ ایسے ہی شارٹ کٹ پیش ہیں جن کی ضرورت دوران کار اکثر پیش آتی ہے۔

☆ Alt+D دبانے سے ہر بڑے براؤزر میں کرسر ایڈریس بار پر پہنچ جاتا ہے۔ یوں ماؤس کی ضرورت نہیں پڑتی۔

☆ صفحے کو ری لوڈ یا ری فریش کرنے کے لیے F5 دبائیے۔

☆ F11 دبائیے، براؤزر پوری سکرین پر چھا جائے گا اور یوں چیزیں بڑی نظر آئیں گی۔ اگر نارمل ویو درکار ہے تو دوبارہ F11 دبا دیجیے۔

☆ اگر آپ براؤزر کے بک مارکس کھولنا چاہتے ہیں تو Ctrl+B دبائیے۔

☆ Ctrl+F دبائیے۔ آپ کے سامنے فائنڈ باکس کھل جائے گا۔ اب آپ ویب صفحے پر کوئی بھی مطلوبہ میٹر تلاش کر سکتے ہیں۔

بوٹ ایبل یو ایس بی بنائیے

''وقت کم ہے اور مقابلہ سخت'' والے اس دور میں ہر کوئی چاہتا ہے کہ کمپیوٹر میں ونڈوز تیزی سے انسٹال ہو جائے۔ تجربے نے بتایا ہے کہ سی ڈی یا ڈی وی ڈی کی نسبت یو ایس بی سے ونڈوز زیادہ تیزی سے انسٹال ہوتی ہے۔ مگر اس کے لیے یو ایس بی کو بوٹ ایبل بنانا پڑتا ہے۔

آن لائن فارم تیزی سے بھریے

کسی بھی قسم کا آن لائن بھرتے ہوئے ہر فیلڈ پر بار بار کرسر لانا پڑتا ہے۔ یوں ماؤس بہ کثرت استعمال ہوتا ہے۔ نیز وقت اور توانائی بھی خاصی خرچ ہوتی ہے۔ اسی مسئلے سے یوں چھٹکارا ممکن ہے کہ ٹیب (Tab) سے مدد لیجیے۔ ایک فیلڈ پر جب آپ مطلوبہ میٹر لکھ چکیں تو ٹیب دبائیے۔ کرسر خود بخود اگلی فیلڈ پر چلا جائے گا۔ یوں ماؤس کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

خوش قسمتی سے یو ایس بی کو بوٹ ایبل بنانے والے مفت سافٹ ویئر نیٹ پر دستیاب ہیں۔ مثال کے طور پر رفس (Rufus)، ون ٹو بوٹک، یونٹ بوٹین وغیرہ۔ ان میں سب سے تیز رفتار اور جدید سافٹ ویئر رفس (Rufus) ہے۔ اس کے ذریعے آپ ونڈوز 7 کی بھی بوٹ ایبل یو ایس بی بنا سکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے۔ ونڈوز 7 کے لیے یو ایس بی کئی جی بی (GB) کی ہونی چاہیے۔ البتہ ایکس پی کے لیے 1 جی بی والی کافی ہے۔

سائنس و ٹیکنالوجی

حسرت اُن غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے

وہ ایجادات جو مقبولیت حاصل نہ کر سکیں انسانی سوچ کے ان شاہکاروں کا تذکرہ جو ہماری سوچ سے محو ہو چکے ہیں

معظم علی

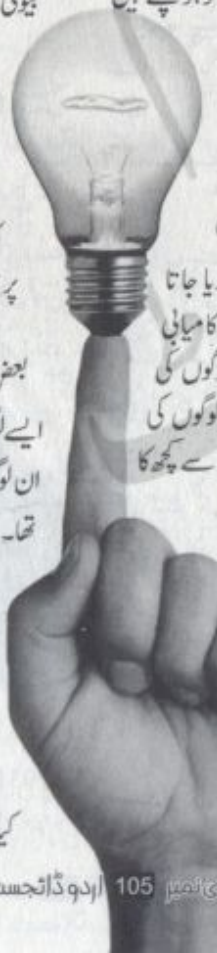

کچھ ایسی دلچسپ ایجادات بھی ہوتی ہیں جنہیں یاد تو رکھا جاتا ہے اگرچہ بعد میں آنے والی نئی ٹیکنالوجی کی وجہ سے انہیں متروک کر دیا جاتا ہے۔ تاہم کچھ ایسی ایجادات بھی ہیں جو کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکیں اور بہت جلد لوگوں کی نظروں اور یادداشتوں سے محو ہو گئیں۔ لوگوں کی دلچسپی کے لیے ہم ان ناکام ایجادات میں سے کچھ کا یہاں تذکرہ کرتے ہیں۔

ہیلیم گیس فائر کرنے والی کار

1930ء کے عشرے میں جب دنیا میں بہت زیادہ سیاسی بے چینی تھی تب مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے اس کار کا نظریہ پیش کیا گیا تھا۔ جہاں کہیں بھی حکومت مخالف لوگ جمع ہوں تو ان لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے اس کار کی مدد سے بدبودار ہیلیم گیس فائر کی جائے تاکہ اس کی بدبو لوگوں کو منتشر ہونے پر مجبور کر دے۔ یہ اعجوبہ کار 1938ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی لیکن اس کو تیار نہیں کیا گیا۔

ویکیوم بیوٹی ہیلمٹ

آپ نے بیوٹی پارلروں میں میک اپ کرواتی خواتین کے سروں پر پلاسٹک بیگ تو چڑھے دیکھے ہوں گے لیکن میک اپ کرواتے ہوئے کسی عورت کے سر پر ہیلمٹ نما کنٹوپ چڑھا نہیں دیکھا ہوگا۔ 1941ء میں بیوٹی پارلروں میں ایسا ہیلمٹ متعارف کرایا گیا تھا جس کی مدد سے خواتین کے چہروں کو بھاپ دی جاتی تھی مگر یہ ہیلمٹ مقبولیت حاصل نہ کر سکا اور کچھ عرصے کے بعد اس کا استعمال ترک کر دیا گیا۔ ایک عرصے تک دنیا میں اس طرح کا ہیلمٹ سزائے موت کے مجرموں کے سروں پر چڑھا کر انہیں موت سے ہمکنار کیا جاتا تھا۔

پڑھنے میں مدد دینے والا روبوٹ

بعض لوگ پڑھنے میں بہت سست ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مدد کے لیے ایک روبوٹ تیار کیا گیا جو ان لوگوں کی پڑھنے کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دیتا تھا۔ یہ روبوٹ اپنا ہاتھ اس صفحے کی لائنوں پر رکھتا جو طالب علم یا کسی اور نے پڑھنا ہوتی تھیں۔ اپنا ہاتھ نہ استعمال کرنے کی وجہ سے توجہ زیادہ پڑھنے کی طرف مرکوز ہوتی تھی اس وجہ سے سست پڑھنے والے کی رفتار میں اضافہ ہو جاتا تھا لیکن اس ایجاد کو بڑے پیمانے پر استعمال نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ یہ ختم ہو گئی۔

ایک پیسے والی گاڑی

لوگ عموماً دو پہیے والی گاڑیوں یا چار پہیے والی گاڑیوں پر سفر کرتے ہیں۔ کچھ ایجادکاروں نے کوشش کی کہ ایک پہیے والی گاڑی متعارف کرائی جائے۔ اس سلسلے میں پہلی کاوش 1869ء میں سامنے آئی جب دنیا کی پہلی ایک پہیے والی سائیکل متعارف کرائی گئی۔ اگرچہ یہ دیگر گاڑیوں کے مقابلے میں زیادہ خاموش، محفوظ تھی اور اسے چلانا آسان تھا، لیکن یہ لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہی۔

فون کا جواب دینے والا روبوٹ

فون کا جواب دینے والا روبوٹ 1964ء میں متعارف کرایا گیا تھا۔ اس وقت روبوٹس کو گھریلو استعمال میں لانے کا نظریہ عام تھا اور لوگ چاہتے تھے کہ روبوٹ عام لوگوں کی طرح ذمہ داریاں سرانجام دے لیکن یہ تجربہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ روبوٹ صرف فون اٹھاتا تھا اور پھر کچھ سنے اور جواب دیے بغیر اسے دوبارہ واپس کریڈل پر رکھ دیتا تھا۔ یہ پیغام وصول کرنے یا پیغام ریکارڈ کرانے کی کوئی سہولت فراہم نہیں کرتا تھا بس صرف یہ دکھائی اچھا دیتا تھا۔

چھتری والا سگریٹ

آج کل سگریٹ نوشی بہت عام ہے لیکن 1931ء میں یہ وبا کچھ زیادہ عام نہیں تھی۔ لوگوں کی کم تعداد سگریٹ نوشی کرتی تھی اور اس وقت سگریٹ نوشی امراء کی ایک نشانی ہوتا تھا۔ چونکہ اس وقت ترقی اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی اور جو لوگ بارش میں سگریٹ نہیں پی سکتے تھے ان کی سہولت کے لیے ایسا سگریٹ متعارف کرایا گیا جس پر چھوٹی چھتری بنی ہوتی تھی جو بارش کے دوران سگریٹ کو گیلا ہونے سے محفوظ کرتی تھی اور سگریٹ پینے والا بارش میں بھیگنے کا لطف اٹھانے کے ساتھ ساتھ سگریٹ پینے کا مزہ بھی لیتا تھا لیکن یہ ایجاد زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کرسکی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہوگئی۔

اُڑنے والا ٹینک

اس سے پہلے فوجی طیاروں میں ٹینکوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا تھا۔ فوجی ماہرین کو خیال آیا کہ کیوں نہ ٹینک کو ہی پر لگا دیے جائیں اس سے وہ براہ راست جنگی میدان میں اتارا جاسکتا ہے اور آسانی سے اور کم وقت میں اپنی مطلوبہ جگہ تک پہنچ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہونے والے ابتدائی تجربات اگرچہ کامیاب تھے تاہم یہ فوجی ماہرین کے درمیان مقبولیت نہیں حاصل کرسکے تھے۔ اس کی بجائے طیاروں کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دی گئی اور آج طیاروں کے ذریعے ہی ٹینکوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے۔

ایک پہیے والا ٹینک

یہ ٹینک جرمن نے بنایا تھا۔ اس ایک پہیے کے ٹینک میں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا تھا۔ اس پر ایک ہیوی مشین گن اور دیگر بھاری ہتھیار نصب تھے۔ ٹینک ڈرائیور ٹینک چلانے کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کا بھی استعمال کرتا تھا لیکن یہ ٹینک اپنی آزمائش کے دوران ہی ناکام قرار پایا۔

سکوٹر پر نصب توپ

یہ توپ فرانسیسی فوج نے ویت نام کی جنگ میں تیار کی تھی۔ سکوٹر پر 75 ملی میٹر کی توپ نصب کی گئی تھی۔ اس سکوٹر توپ کا زیادہ تر استعمال 1950ء کے دوران فرانسیسی پیراٹروپرز نے کیا تھا۔ اگرچہ یہ محفوظ تھی لیکن اس کا استعمال زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ سکا کیونکہ جنگ کے دوران اس کا توپچی بہت زیادہ غیر محفوظ ہوتا تھا اور بندوق کی ایک گولی اس کے توپچی کو زخمی یا مار کے پوری توپ کو ناکارہ بنا دیتی تھی۔

راکٹ بیلٹ

راکٹ بیلٹ فوجیوں کو چھوٹے فاصلے تک محفوظ سفر کے لیے تیار کی گئی تھی۔ راکٹ بیلٹ 1960ء میں تیار کی گئی تھی اور اکتوبر 1961ء میں اس کا مظاہرہ امریکا کے صدر جان ایف کینیڈی کے سامنے کیا گیا تھا۔ تاہم 1960ء کے وسط تک فوج نے اس راکٹ بیلٹ میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اس راکٹ بیلٹ کی مدد سے زیادہ سے زیادہ 21 سیکنڈ تک اڑا جاسکتا تھا اور یہ صرف 120 میٹر تک کا فاصلہ طے کرسکتی تھی۔

تھامس الوا ایڈیسن کی ناکام ایجادات

ایڈی سن ایک مشہور سائنسدان ہے اور اس نے ایک ہزار 93 کے قریب مختلف ایجادات کی ہیں۔ ان میں سے بہت سی ایجادات بہت مقبول ہوئیں جن میں لائٹ بلب، فونوگراف اور موشن پکچر کیمرہ شامل ہیں اور ان کا انسانی زندگی میں بہت زیادہ حصہ ہے۔ تاہم اس کی ہر ایجاد کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی تھی چند ایک ایجادات ناکام بھی ہوئی تھیں۔ یہاں ہم اس کی چند ناکام ایجادات کا تذکرہ کررہے ہیں۔

ایڈی سن کی ایک ایجاد جو زیادہ مقبولیت نہیں حاصل کرسکی کہ وہ ہر چیز سیمنٹ سے تیار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے 1899ء میں ایڈی سن پورٹ لینڈ سیمنٹ کمپنی قائم کی اور ہر چیز جیسے الماریاں (فونوگراف کے لیے) پیانو اور گھروں کے لیے سب سیمنٹ سے تیار کیا۔ بدقسمتی سے اس وقت کنکریٹ بہت زیادہ مہنگا تھا اس لیے اس کے اس نظریہ کو زیادہ قبول نہیں کیا گیا۔ اگرچہ سیمنٹ مکمل طور پر ناکام نہیں ہوا۔ اس کی کمپنی کو برونکس میں یانکی سٹیڈیم کی تعمیر کا کام سونپا گیا لیکن یہ سٹیڈیم مکمل نہیں ہوسکا تھا۔

حرکت کرتی تصویروں کی ابتدائی ایجادات میں لوگ کوشش کرتے تھے کہ وہ ایک ساتھ حرکت اور بات کرتی تصاویر بنا سکیں۔ 1895ء میں ایڈی سن نے ایک کنٹوفون، کنٹوسکوپ (peep hole motion picture viewer) فونوگرام کے ساتھ بنایا جو ایک الماری کے اندر چلتا تھا۔ آواز دو کانوں کی ٹیوبز سے آتی تھی جبکہ آدمی تصویروں کو دیکھتا تھا لیکن اس کی یہ ایجاد بھی مقبولیت نہ حاصل کرسکی اور 1915ء میں ایڈی سن نے اپنے ساؤنڈ موشن پکچرز کے اس نظریہ پر کام ختم کردیا۔

ایڈی سن کے کیریئر کی سب سے بڑی ناکامی لوہے کی کانوں کو کھودنے کا طریقہ دریافت کرنے کے متعلق تھی۔ پنسلوانیا کی سٹیل مل نے ایڈی سن سے لوہے کی کان کو کھودنے کا طریقہ دریافت کرنے کے لیے کہا

تھا۔ 1880ء کے اوائل اور 1890ء کے اوائل تک ایڈی سن نے کان کنی کے طریقوں پر کام جاری رکھا لیکن وہ کوئی بھی ایسا طریقہ دریافت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا جس سے ادنیٰ درجے کے خام لوہے اور ناقابل استعمال خام لوہے سے معیاری لوہا نکالا جا سکے۔ اپنے اس تجربے میں ناکامی کے بعد ایڈی سن نے اس خیال کو ترک کر دیا لیکن اس کو اس سلسلے میں خرچ ہونے والی اپنی ساری رقم سے ہاتھ دھونا پڑے۔

ولیم نیلسن

ولیم نیلسن 1879ء میں پیدا ہوا۔ یہ ایک بجلی کی کمپنی میں ملازم تھا۔ اس نے بجلی سے چلنے والی سائیکل ایجاد کی تھی۔ 1903ء میں ولیم اپنی ایجاد کردہ سائیکل کی آزمائش کرتے ہوئے اس سے نیچے گر کر ہلاک ہو گیا۔

اسماعیل بن حماد الجواہری

اسماعیل 1003ء میں پیدا ہوا۔ یہ مسلم ترک اسکالر تھا اور اس کا تعلق فاراب سے تھا۔ اس نے لکڑی کے دو پروں اور رسی کی مدد سے اڑنے کی کوشش کی۔ اپنے اس تجربے کے لیے اس نے نیشاپور کی مسجد کی چھت سے چھلانگ لگائی لیکن اُڑ نہ سکا اور زمین پر گر کر ہلاک ہو گیا۔

جین فرانسس پالٹر ڈی رونے

یہ تاریخ کے پہلے ہوائی حادثہ میں ہلاک ہوا۔ 15 جون 1785ء کو جین فرانسس غبارے میں بیٹھ کر انگلش چینل عبور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا غبارہ ہوا میں پھٹ گیا اور وہ نیچے گر کر ہلاک ہو گیا۔

اوتو لی اینتھل

اوتو لی 1848ء میں پیدا ہوا اور 1896ء میں اپنے ایجاد کردہ گلائیڈرز سے گر کر ہلاک ہو گیا۔

فرانز ورپچلٹ

فرانز 1879ء میں پیدا ہوا۔ یہ پیشے کے لحاظ سے درزی تھا اور اس نے پیراشوٹ کوٹ تیار کیا تھا۔ اس نے اپنے ایجادہ کردہ کوٹ کا تجربہ کرنے کے لیے ایفل ٹاور کو منتخب کیا۔ اس نے پیرس کے حکام کو بتایا کہ وہ اپنے تیار کردہ پیراشوٹ کا مصنوعی تجربہ کرنا چاہتا ہے لیکن اس نے حقیقی تجربہ کیا۔ تجربے کے دوران اس کا پیراشوٹ کوٹ کام نہیں کر سکا اور وہ 1912ء میں ایفل ٹاور سے گر کر ہلاک ہو گیا۔

ایرل ولاشو

ایرل ولاشو 1882ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اڑنے والا طیارہ خود تیار کیا لیکن اس کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ 1913ء میں اس نے 932 میل طویل پہاڑی سلسلے کیراٹافین کو اپنے بنائے گئے طیارے سے عبور کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا طیارہ خرابی کی وجہ سے گر کر تباہ ہو گیا اور ولاشو اس ہوائی حادثہ میں ہلاک ہو گیا۔

ہنری سمول انسلی

یہ 1973ء میں اڑنے والی کار کا تجربہ کرنے کے دوران ہلاک ہوا۔ فورڈ پینٹو کمپنی نے یہ اڑنے والی کار تیار کی تھی۔ ناکام تجربے کے بعد کمپنی نے اس طرح کی کاریں بنانے کا منصوبہ ترک کر دیا۔

مائیکل ڈکرے

مائیکل 1973ء میں فلائنگ ٹیلی ڈیوائس کے تجربے میں ہلاک ہوا۔ یہ ڈیوائس گاڑیوں کو بہت زیادہ تیز رفتار اور آرام دہ بنانے کے لیے تیار کی گئی تھی تاکہ لوگ قریبی علاقوں میں زیادہ تیزی اور آرام دہ سفر کر سکیں۔

سرخ سیارے پر مفادات کی جنگ

ایک اور سیارے پر پائی جانے والی زندگی کا ماجرا
وہاں انسانوں نے اپنی ذہانت کا لوہا منوانے
میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی

ایرک ونی کوف / فیضان اللہ خان

پچھلی اقساط کا خلاصہ

ٹوتھی لونے ریلوے لائن کو جلدی سے بچھانے اور اپنا کام مکمل کرنے کے لیے مشینری کے بجائے افرادی قوت کے استعمال کو بہتر جانا، اس نے زمین سے 5 ہزار افراد کو مریخ پر لانے کا منصوبہ بنایا اور فیصلہ کیا کہ ان کو اُجرت رقم کی بجائے رقبے کی صورت میں دی جائے گی۔ اس کے لیے اس نے مریخ کی بنجر زمین کو آباد کرنے کا لائحہ عمل تیار کیا۔

اس بات پر اڈاچی کچھ دیر سوچتا رہا۔ ''بات یہ ہے کہ اس سارے عمل میں جو تکنیکی مسائل درپیش ہیں وہ آپ کے تصور سے کہیں زیادہ الجھے ہوئے ہیں۔ تاہم ایسا نہیں ہے کہ انہیں سلجھایا ہی نہ جاسکے۔ میرا خیال ہے کہ ہم آپ کو فارم بنا کر دے سکتے ہیں اور بڑی تعداد میں ایسے فارم بنا کر ان کی قیمتیں بھی مناسب سطح پر لائی جاسکتی ہیں۔ لیکن کیا آپ پانچ ہزار افراد کے اخراجات برداشت کرلیں گے؟''

''آپ میری بات صحیح طرح سمجھ نہیں پائے۔'' ٹموتھی لو نے کہا ''زرعی تجارت میرا شعبہ نہیں ہے۔ آپ یہ فارم بنا کر براہِ راست کسانوں کو فروخت کریں گے اور توانائی، پانی اور ہوا وغیرہ کی فراہمی کا انتظام بھی آپ خود کریں گے۔''

''یہ تو انتہائی لغو بات ہے۔ کسانوں کے پاس فارم خریدنے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ وہ کیونکر ان کی ادائی کر پائیں گے؟''

''کریڈٹ پر..... وہ یہاں پر فصلیں اگائیں گے انہیں فروخت کرنے سے جو آمدنی حاصل ہوگی اس سے وہ فارموں کا معاوضہ مع سود ادا کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ کنسورشیم کے تیس ہزار سے زائد کارکن جو مصنوعی ذائقے والی اجی کھا کھا کر تنگ آچکے ہیں، اس غذائی پیداوار کو نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں سمجھیں گے۔'' ٹموتھی لو نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا'' نہ صرف یہ بلکہ صنعتی استعمال کے لیے جو نامیاتی مادے آپ مہنگے داموں زمین پر سے منگواتے ہیں، مریخ ہی پر بہت کم قیمت میں دستیاب ہوں گے۔''

''اچھا اگر کوئی کاشت کار اپنے رقبے کی قیمت ادا کرنے میں ناکام رہے تو پھر کون ادائی کرے گا؟''

''اول تو چینی کاشت کاروں کی ثابت قدمی افسانوی نوعیت کی ہے۔ ان کا پورا خاندان اپنی زمین بچانے کے لیے غلاموں کی طرح دن رات مشقت کرے گا۔ تاہم نادہندگی کی صورت میں، جس کا امکان نہایت کم ہے، آپ زمین کا قبضہ چھڑا کر اسے کسی اور کے ہاتھ فروخت کرسکتے ہیں۔''

''یہ تو خاصی غیر انسانی سوچ ہے۔'' ہیڈا اڈاچی نے رائے ظاہر کی۔

''دیکھیے جناب، میں ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ لے کر یہاں آیا ہوں، انسانی ہمدردی کے فروغ کا ادارہ کھولنے نہیں۔ آپ اس پیکج کا اچھی طرح مطالعہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اس پر عمل درآمد سے حاصل ہونے والے طویل المدت منافع جات آپ کو خاصے پرکشش محسوس ہوں گے۔''

لیکن ہیڈا اڈاچی کچھ زیادہ متاثر ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ ''اگر ہم ایسی مشکوک مارکیٹ میں کاروبار کرنے میں دلچسپی لیں بھی تو اس کے لیے ابتدا ہی میں بہت بڑی رقوم صرف کرنا پڑیں گی۔''

''مجھے آپ کی بات سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔'' ٹموتھی لو نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ مجھے بھی یورپین انڈسٹریل پارک والوں ہی سے معاہدہ کرنا پڑے گا۔''

''میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں۔'' ہیڈا اڈاچی نے پہلو بدلا اور اپنی کرسی پر آگے کو ہو کر بیٹھ گیا۔

''مائیکل کلین نامی ایک بدبخت شخص نے میرا منصوبہ چوری کرلیا ہے۔ وہ اس کام کے لیے آئرلینڈ سے پانچ ہزار مزدور منگوا رہا ہے۔ یہ شمالی آئرلینڈ کے

پرلسٹ ہیں جو ملک کے دوبارہ اتحاد سے خوش نہیں ہیں۔ فرلاگس گروپے (Verlagsgruppe) نامی ادارے نے اس کے لیے فارم بنانے کی ہامی بھی بھر لی ہے اور ظاہر ہے کہ جتنے زیادہ گاہک کسی کو ملیں گے، اتنا ہی زیادہ منافع اسے حاصل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ فرلاگس گروپے کا مالک ہر زِسر (Herr Zisser) مجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔''

ہیڈا اڈاچی کے ماتھے پر تیوریاں نمودار ہوئیں۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد ایک مسکراہٹ کے ساتھ بولا ''یہ تو ہمارے لیے بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی کہ ہمارے نئے ہمسائے سامان اور خدمات کی فراہمی کے لیے اتنے فاصلے پر کسی سے رابطہ کریں۔ مجھے آپ اپنی تجویز کا مطالعہ کرنے کے لیے تھوڑی سی مہلت دیجیے۔ کیا آئندہ چند روز کے اندر آپ سے دوبارہ ملاقات ممکن ہو پائے گی، قبل اس سے کہ آپ ہر زِسر سے رابطہ کریں؟''

''یقیناً'' ٹموتھی لو نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

☆☆☆

ٹموتھی لو مریخی گاڑی کے بلبلہ نما کاک پٹ میں سے چٹانوں بھرے مریخی میدان میں ہونے والے کام کا جائزہ لے رہا تھا۔ اب سے چار گھنٹے قبل وہ پہلے کیمپ سے روانہ ہوا تھا۔ ابتدا میں اس لق و دق بیابان میں صرف وہ لوگ نظر آتے تھے جن کا کام سروے کرنا یا مریخ کی سطح کا جائزہ لینا تھا، لیکن اب رفتہ رفتہ یہاں پر نظر آنے والے انسانوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوگیا تھا۔ مریخی گاڑی جس کی ساخت کریم رول سے ملتی جلتی تھی، رابطہ سڑک پر ٹرکوں اور دیگر گاڑیوں کے ہجوم میں سے نکلتی ہوئی ٹیڑھے میڑھے راستوں پر لہراتی چلی جارہی تھی۔ ہر طرف مریخ کے خصوصی لباس پہنے ہوئے کارکنوں کے جتھے اپنے اپنے حصے کا کام انجام دیتے نظر آرہے تھے۔ ہر کارکن اور اس کے کام کی پہچان اس کے لباس کے رنگوں سے کی جاسکتی تھی۔ رابطہ سڑک جو پہلے ایک معمولی سی سڑک تھی اب مریخ کی پوری سطح کا احاطہ کرنے والی ایک عظیم الشان شاہراہ کی شکل اختیار کرتی جارہی تھی۔ سڑک کے لیے راستہ صاف کرنے، کھدائی، بجری نما روڑی کی بھرائی اور اس کی درجہ بندی کا کام زور شور سے جاری تھا۔

''کام بڑے منظم طریقے سے ہو رہا ہے۔'' کینڈس نے رائے ظاہر کی۔

''یہ اس سے بھی زیادہ منظم ہونا چاہیے تھا۔'' ٹموتھی لو نے کہا ''جنوب کی جانب سے ملنے والی رپورٹوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ مائیکل خبیث کے کارندے روزانہ 35 کلومیٹر سے زائد ریلوے لائن بچھا رہے ہیں۔''

اس کی نظریں مریخ کے اجنبی ماحول میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ دور فاصلے پر شہاب ثاقب کی ٹکر سے بنے ہوئے ایک بہت بڑے گڑھے کا کٹا پھٹا ابھرا ہوا کنارہ پورے میدانی منظر میں سب سے نمایاں معلوم ہو رہا تھا۔ آسمان کے گلابی رنگ میں شفق کی سرخی نمایاں ہوتی جارہی تھی اور ہوا کا ایک بگولا کچھ فاصلے پر گرد کے مرغولے فضا میں اڑا رہا تھا۔

''اب ہم منزل پر پہنچ چکے ہیں جناب'' آٹو کون نے رپورٹ دی۔ بغلی سڑک کے قریب تین بڑے بڑے گنبد تعمیر کیے گئے تھے۔ مریخی گاڑی ''تعمیراتی جھونپڑے'' کے نزدیک ایک خالی جگہ پر رک گئی۔ جھونپڑے کے ایئرلاک کے اوپر لگے بورڈ پر جلی حروف

میں ''نارتھ مارشین ریل روڈ کمپنی، کیمپ نمبر 38'' لکھا ہوا تھا۔

دو آدمی ایئر لاک سے باہر آ رہے تھے۔ ٹموتھی لو اور کینڈس نے اپنی اپنی ہیلمٹیں پہنیں، کیبن کا دروازہ کھلنے کا انتظار کیا اور پھر مریخ کی منجمد سطح پر اتر گئے۔

''جنابِ لو، آپ سے دوبارہ مل کر بہت خوشی ہوئی'' دونوں میں سے پستہ قد شخص نے ہیلمٹ پر لگے کوم چینل کے ذریعے بات کی۔ تب دونوں نے مصافحہ کیا۔

ٹموتھی لو نے عرصہ پہلے اپنے تجربے کی بنیاد پر نتیجہ اخذ کیا تھا کہ گو نچلے درجے کے کارکن آنی جانی چیز ہیں لیکن اہم عہدوں پر مناسب افراد کا مستقل تقرر بے حد ضروری ہے۔ اس نے ڈاکٹر سیوکی ناکانو کی صورت میں ایک انتہائی قابل خاتون انجینئر کو دریافت کیا تھا جو اس سے پہلے کنسورشیم کے شعبۂ انجینئرنگ میں عضوِ معطل بنی ہوئی تھی اور عورتوں کی ترقی کے بارے میں جاپانیوں کے روایتی استحصال کا شکار رہی تھی۔ لیکن اب وہ اُس کے ادارے میں چیف انجینئر کے عہدے پر فائز تھی اور ایک مرد کی تنخواہ سے بھی کہیں کم معاوضے پر دو افراد کا کام انجام دے رہی تھی۔ اس کے باوجود اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع دیے جانے پر اُس کی احسان مند تھی۔

''ہاں، ٹھیک ہے'' لو نے جواب دیا ''میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں تمہارے کام سے بہت خوش ہوں۔ میرے اس دورے سے پریشان نہ ہونا۔ کینڈس کے پرس میں میرا 'مولا بخش' موجود نہیں ہے۔ میں تو یہاں پر صرف اپنی ریلوے لائن بنتے ہوئے دیکھنے آیا ہوں۔'' اس نے گفتگو میں شگفتگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر ناکانو حسِ مزاح سے عاری تھی تاہم اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''آپ بڑے صحیح وقت پر یہاں پہنچے ہیں۔ ابھی چند منٹ میں آپ ایک قابلِ دید نظارہ دیکھ سکیں گے۔ بشرطیکہ آپ معائنے کے دوران میرا ساتھ دے سکیں۔''

''ہاں، ہاں۔ بڑے شوق سے۔''

وہ اُس راستے کی جانب چل پڑے جو ریلوے لائن بچھانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ کینڈس اور ڈاکٹر ناکانو کا ترجمان رباڈی گارڈ دونوں پیچھے پیچھے ان کے ساتھ ہو لیے۔ ابھی انہوں نے آدھا ہی راستہ طے کیا ہوگا کہ ٹموتھی لو کے ہیلمٹ میں لگا سائرن تیز چیخنے والی آواز میں چیخنے لگا۔

''یہ شفٹ کی تبدیلی کا سائرن ہے جو تمام چینلوں پر نشر کیا جاتا ہے۔'' ڈاکٹر ناکانو نے وضاحت کی۔ ''قبل اس کے کہ ہم روندے جائیں، ہمیں ایک جانب ہو جانا چاہیے۔''

اونچے اونچے کھمبوں پر لگی فلڈ لائٹس بیک وقت روشن ہو گئیں جس سے کیمپ، رابطہ سڑک اور ریلوے لائن پر چھانے والا اندھیرا دور ہو گیا۔ رہائشی گنبدوں میں سے کارکنوں کے غول برآمد ہونے اور اپنے اپنے مرتبے کے مطابق گروہوں میں مارچ کرنے لگے۔ ٹموتھی لو نے مختلف چینل بدل کر سنا۔ لوگ اپنے اپنے مقامی لہجوں میں، جن میں سے زیادہ تر اس کے لیے اجنبی تھے، احکام دے رہے تھے یا ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی زبان کا ایک نیا لہجہ بھی نمایاں تھا جو ان تمام مقامی لہجوں کے ملاپ سے وجود میں آ رہا تھا۔

14 آزادی کا پہلا دن

چودھری محمد خلیل

اگست 1947ء پاکستان کی آزادی کا پہلا دن تھا۔ اس کا اعلان آدھی رات سے تقریباً دس منٹ پہلے آل انڈیا ریڈیو سروس نے اپنے آخری نشریے میں کیا۔ اس کے چند لمحے بعد ریڈیو پاکستان سے خواجہ خورشید انور کا مرتب کیا ہوا ریڈیو پاکستان کا عارضی ابتدائی نغمہ نشر کیا گیا۔ آدھی رات سے ایک منٹ پہلے فضا میں اعلان گونجا کہ آدھی رات کے وقت پاکستان کی آزادی اور خودمختار مملکت وجود میں آجائے گی۔ انگریزی میں یہ اعلان مسٹر ظہور آذر نے اور اردو میں مصطفیٰ علی ہمدانی نے کیا۔ ٹھیک آدھی رات کے وقت ہزاروں سامعین کے کانوں میں پہلے انگریزی اور پھر اردو میں یہ الفاظ گونجے۔ یہ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس ہے اس اعلان کے فوراً بعد مولانا ظاہر القاسمی نے قرآن حکیم کی درج ذیل آیات تلاوت کیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ O

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا O لِّیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ یُتِمَّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکَ وَ یَہۡدِیَکَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِیۡمًا O وَّ یَنۡصُرَکَ اللّٰہُ نَصۡرًا عَزِیۡزًا O ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ السَّکِیۡنَۃَ فِیۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِیۡمَانًا مَّعَ اِیۡمَانِہِمۡ ؕ وَ لِلّٰہِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا O

ترجمہ: ''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ بے شک ہم نے تم کو فتح دی فتح مبین صریح وصاف تاکہ خدا تمھارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دے اور تمھیں سیدھے راستے پر چلائے اور خدا تمھاری زبردست مدد کرے۔ وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی تاکہ ان کے ایمان کے ساتھ ایمان بڑھے اور آسمانوں اور زمین کے لشکر خدا ہی کے ہیں اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔''

تلاوت کلام پاک کے بعد خواجہ خورشید انور کا مرتب کیا ہوا ریڈیو پاکستان کا آرکسٹرا بجایا گیا۔ اور سنتو خاں اور ان کے ہم نواؤں نے قوالی میں علامہ اقبالؒ کی ایک نظم پیش کی۔ آدھی رات کو ریڈیو نشریات کا اختتام جناب حفیظ ہوشیار پوری کی تقریر سے ہوا جو انھوں نے جدوجہد پاکستان کے سلسلے میں کی۔

بابا جناحؒ

اس کی زبان نہ سمجھنے والے بھی یقین رکھتے تھے کہ اس سے زیادہ سچا اور اچھا اور کوئی نہیں

اشفاق احمد

آپ کی آسانی کے لیے عرض کروں کہ بابا وہ ہوتا ہے، جو لینے کے بجائے دینے کے مقام پر ہو۔ بہت سی زبانوں میں باپ کے لیے بابا کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو تھوڑی سی اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ کہیں اسے بابو کہتے ہیں اٹالین میں، اسے باپک کہتے ہیں انڈونیشین میں، اسے باپو کہتے ہیں انڈیا میں لیکن اس کا رُوٹ (Root) جو ہے وہ لفظ بابا سے ہے۔ باپ کی سب سے بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ گھر کے اندر، اپنے گھروندے کے اندر، اپنے خاندان کے اندر، دینے والا ہوتا ہے، لینے والا نہیں ہوتا۔ جو شخص کسی بھی انسانی گروہ کے درمیان دینے کے مقام پر ہو وہ بابا ہے اور یہ موٹی سی اس کی نشانی ہے۔ جب بھی آپ کسی آدمی کو ایسے مقام پر دیکھیں تو پھر آپ سمجھیں کہ یہ بابا ہے اور یہ داتا ہے، عطا کرنے والا آدمی ہے۔ اور لینے والا ہو، سمیٹنے والا ہو، وہ بالکل اس کے الٹ ہوتا ہے اور عیاری کی بہت ساری منازل طے کر کے ایک گانٹھ کی صورت میں انسان بن کے زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میری زندگی میں جو سب سے پہلے بابا آیا وہ دیر کی بات ہے۔ میں اس وقت سیکنڈ ائیر میں پڑھتا تھا اور پڑھتا تو میں یہاں لاہور میں تھا۔ لیکن میرا ایک قصبے کے ساتھ تعلق تھا، جہاں مجھے چھٹیوں میں لوٹ کر جانا پڑتا تھا۔ وہیں سے میں نے میٹرک کیا تھا تو وہاں کے لوگ دیہاتی لوگ، کسان لوگ، وہ ایک بابے کے عشق میں مبتلا تھے۔ اور وہ بابا ایسا تھا، جسے ان لوگوں نے دیکھا نہیں تھا لیکن وہ جان لیتے تھے، سن لیتے تھے نام کہیں سے، خبر

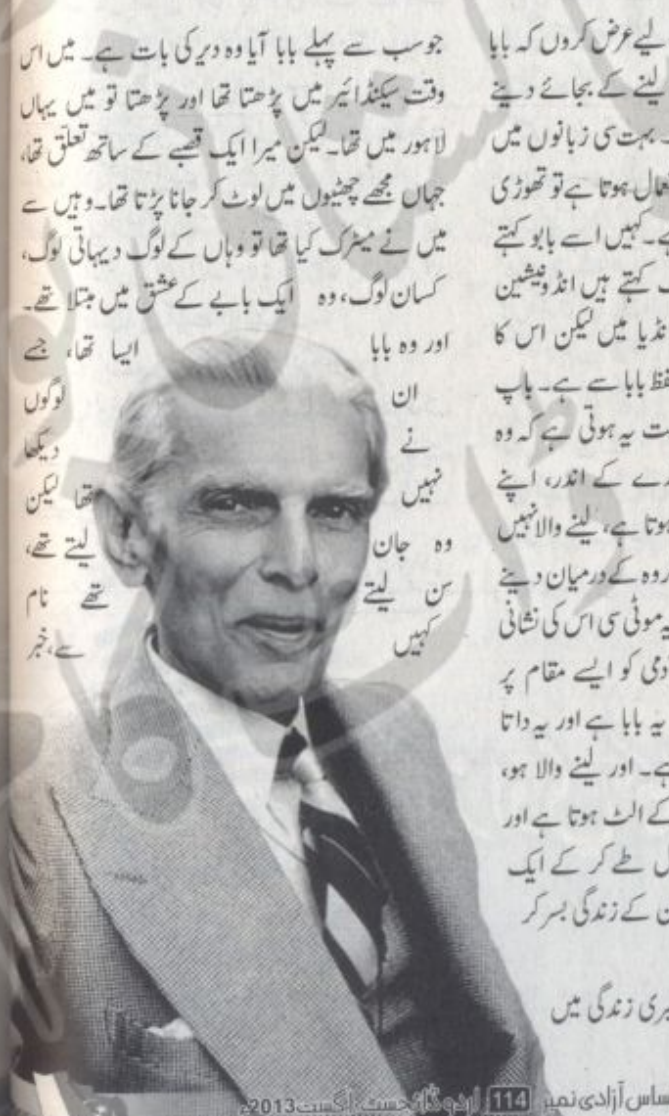

پہنچ جاتی تھی اور وہ اس کو بہت مانتے تھے۔ اور اس تمنا اور آرزو میں بیٹھے رہتے تھے کہ وہ آئے گا اور جو ہمارے دکھی دن ہیں، ان کو یہ بابا کسی طرح سے ہماری زندگیوں سے دور کر دے گا لیکن وہ بے چارے اس کے بارے میں زیادہ کچھ جانتے نہیں تھے تو میں بہت حیران ہو کے ان سے کہتا تھا کہ تمھارا بابا کیسا ہے جو تمھارے درمیان میں نہیں ہے اور تمھاری بولی نہیں بولتا۔ تم اس کی بولی نہیں سمجھتے تو پھر کیسے تمھارا اور اس کا رابطہ ہو۔ وہ کہتے تھے، بھلے ہم اس کی بات نہ سمجھیں وہ ہماری بات نہ جانیں لیکن دلوں کے اندر جو آرزوئیں پوشیدہ ہوتیں ہیں جو تمنائیں ہوتی ہیں، دل کی زبان ایک سانجھی زبان ہے۔ جو ساری دنیا میں بولی جاتی ہے۔ اس بابے کو وہ بابا قائداعظم کہہ کر پکارتے تھے اور اس کا نام لے کر وہ اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ کہتے بھلے اس کی بولی ہم سے مختلف ہو، یہ بات ہماری جاننے اور سمجھنے لگے گا۔ بالکل اسی طرح سے جیسے ہمارے بڑوں کی زبان ہمارے بابوں کی زبان چاہے مختلف ہے لیکن ہم اس سے اچھی طرح سے واقف ہیں اور ہمارے درمیان رابطے کا ایک سلسلہ قائم ہے، میں بہت حیران ہوتا تھا کہ اس وقت لوگ تھوڑے سے متزلزل تھے، کچھ دبدبے کا شکار تھے کہ کبھی آگے بڑھتے تھے، کبھی پیچھے ہٹتے تھے۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ انہی لوگوں نے لاہور کے اندر پنجاب یونیورسٹی کی سپورٹس گراؤنڈ میں، جہاں اب ایک ہوائی جہاز کھڑا ہے، اپنے بابے قائداعظم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور کوئی ایک لاکھ کا مجمع، بالکل Pindrop Silence میں، بے حس و حرکت خاموش بیٹھا ہوا ہے اور وہ اپنی زبان میں بات کر رہا ہے۔ جتنا بھی اس کا گھنٹے کا یا ڈیڑھ گھنٹے کا لیکچر ہوا اس میں، اور یہ لوگ سارے کے سارے اس زبان سے واقف نہیں تھے۔ ایک ایک بات اپنے اندر سمو کے اپنے رگ و پے میں اتار کے وہاں سے اٹھے۔ باوجود اس کے کہ ان پر بہت مشکل وقت آیا ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ ان معنوں میں بابا تھا کہ وہ عطا کرنے والا آدمی تھا، دینے والا آدمی تھا، لینے والی آنکھ نہیں تھی۔ اس نے بڑی چوکھی لڑائی لڑ کے برہمن کے خلاف اور انگریز کے خلاف، اپنے ماننے والوں کو ایک ملک لے کر دیا اور جب ملک لے دے چکا تو پھر اس نے آپ اپنا سرمایہ، اپنا ورثہ ان سے چھپا کر نہیں رکھا اور جب وہ یہاں سے جانے لگا تو اس نے اپنی ساری جائیداد سب کچھ اپنی قوم کو دے دیا۔ سب سے بڑا حصہ اس نے پشاور کے اسلامیہ کالج کو دیا، حالانکہ وہ زیادہ وہاں گئے نہیں تھے لیکن ان کو پسند تھا۔ پھر ایک حصہ علی گڑھ یونیورسٹی کو دیا، پھر سندھ مدرسہ کو دیا جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے رہے تھے اور یوں ہاتھ جھاڑ کے اور فاطمہ جو ان کی بہت چہیتی بہن تھی اور بظاہر جس کے لیے انھیں بہت کچھ چھوڑ کے جانا چاہیے تھا ان کی اتنی پروا نہیں کی اور وہ سب کچھ جو ان کی گاڑھے پسینے کی اپنی کمائی تھی جو انھوں نے وکالت کر کے کمائی تھی، یہاں سے کچھ نہیں لیا تھا۔ انھوں نے اپنے اس اکاؤنٹ سے وہ ساری کی ساری رقم اس کو دے کر یہاں سے رخصت ہو گئے، اس لیے آپ کے دلوں میں اور (ہم جو آپ سے بڑے ہیں تھوڑے سے عمر میں) ہمارے دلوں میں ان کی قدر باقی ہے۔

آپ کبھی کبھی دیکھیں گے، یہ ہمارے بابوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، خواتین وحضرات کہ ان کے مخالف ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ دینے کے مقام پر ہوتے ہیں، اور عام آدمی لینے کے مقام پر ہوتا ہے۔ اور جب لینے کے مقام پر آدمی ہو تو زیادہ شرمندگیوں میں گھر جاتا ہے، کیونکہ اردگرد کے لوگ دیکھتے ہیں ان کی نگاہیں ہر وقت دینے والے پر لگی رہتی ہیں تو لینے والا ان لوگوں کا دشمن ہو جاتا ہے۔

ہمارے بابے جو ڈیرے قائم کرتے ہیں۔ ان کی ٹریننگ کا بھی یہی حصہ ہوتا ہے کہ وہاں آنے والوں کو دینے کی تعلیم دی جائے اور ایک عام آدمی کو کس طرح سے بابا بنایا جائے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میرے مرشد سائیں فضل شاہ صاحبؒ گوجرانوالہ گئے، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں اپنی گاڑی چلاتا ہوا ان کو ساتھ وہاں لے کر گیا تھا۔ ہم جب وہاں گوجرانوالہ میں پورا دن گزار کر، مولوی یاسین صاحب سے مل کر واپس آرہے تھے تو بازار میں ایک فقیر ملا، اس نے میرے بابا جی سے کہا کہ دے اللہ کے نام پر۔ انھوں نے اس وقت ایک روپیہ بڑی دیر کی بات ہے، ایک روپیہ بہت ہوتا تھا، تو وہ اس کو دے دیا وہ لے کر بڑا خوش ہوا، دعائیں دیں، اور بہت پسند کیا اس بابا جی کو۔

انھوں نے اس سے پوچھا شام ہو گئی کتنی کمائی ہوئی؟ وہ ایک سچا آدمی تھا۔ اس نے کہا، دس روپے بنا لیے ہیں۔ تو دس روپے بڑے ہوتے تھے اس زمانے میں بہت زیادہ۔ آپ کو یاد ہو گا، میں نے آپ سے بات کی تھی، ''دِتے میں سے دیا کرو۔'' یہ ان کا فلسفہ تھا نا۔ اس میں سے یہ نہیں ہوتا کہ جو بہت زیادہ رکھتا ہے وہی دے۔ جس کے پاس دو پیسے ہیں، وہ بھی ایک پیسا دے۔ دتے میں سے دینا کہ مطلب یہ ہے کہ اپنے پاس جو کچھ ہے، اس میں سے دینے سے ہی تقویت آتی ہے۔ جب تک Post within نہیں کریں گے، اپنی جان کے ساتھ چمٹا کے رکھیں گے، جس طرح تپ محرقہ ساتھ جان کے چمٹ جاتا ہے نا اور وہ جان نہیں چھوڑتا، اسی طرح سے یہ دولت، اور سرمایہ جو ہے، یہ انسان کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا ہے۔ جسمانی طور پر چاہے تگڑا کر دے، روحانی طور پر کمزور کر دیتا ہے۔ تو انھوں نے کہا اس فقیر سے کہ تو نے اتنے پیسے بنا لیے ہیں، تو اپنے دتے میں سے کچھ دے۔ تو اس نے کہا، بابا میں فقیر آدمی ہوں، میں کہاں سے دوں۔ انھوں نے کہا، اس میں فقیر امیر کا کوئی سوال نہیں ہے جس کے پاس ہے اس کو دینا چاہیے، تو اس فقیر کے دل کو یہ بات بڑی لگی۔ بابا جی سے کہنے لگا، ''میں کیہ کراں۔'' انھوں نے کہا، کسی کو تو کچھ دے۔ کہنے لگا، اچھا۔ وہاں دو مزدور کدالیں کندھے پر ڈالے کہیں سے بیچارے دیہاڑی لے کر گھر کو واپس جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کسیاں تھیں۔ غالباً بنیادیں کھود کر آئے تھے۔ تو وہ فقیر بھاگا گیا، اس نے چار روپے کی جلیبیاں خریدیں، چار روپے کی ایک کلو جلیبیاں آیا کرتی تھیں، اور بھاگ کے لایا، اور آکر اس نے ان دونوں مزدوروں کو دے دیں۔ کہنے لگا، لو ادھی ادھی کر لینا۔ وہ بڑے حیران ہوئے، میں بھی کھڑا ان کو دیکھتا رہا تُو دے کے، وہ خوش ہو کے چلا۔ اور وہ چلے گئے۔ کہنے لگا، بڑی مہربانی بابا تیری، بابا بڑی

مہربانی، شاباش۔

تو وہ جو فقیر تھا کچھ کھسیانا، کچھ شرمندہ سا تھا، زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے خیرات دی تھی۔ وہ تو لینے والے مقام پر تھا تو شرمندہ سا ہو کر کھسکا۔ تو میرے بابا جی نے کہا، ''اوئے لکیاں کدھر جانا ایں تینوں فقیر توں داتا بنا دتا اے، خوش ہو، نچ کے وکھا۔'' تو فقیر سے جب داتا بنتا ہے نا، تو اس کا رتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ اور اگر باہر نہیں تو اس کا اندر ضرور ناچنے لگتا ہے۔ میرے تو یہ مقدر میں نہیں کہ کبھی دینے کے مقام پر آیا ہوں۔ لیکن میں نے ان لوگوں کو ضرور دیکھا ہے کہ جو دینے کے مقام پر ہوتے ہیں اور ان کی خوشیوں کو دیکھا۔ اسی طرح بابے قائداعظم نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیا، کبھی، اللہ آپ کو وقت دے اور بیٹھ کر اس کو جانچنے لگیں، آنکنے لگیں، تولنے لگیں تو آپ اندازہ نہیں لگا سکیں گے کہ وہ ایک دبلا پتلا تپِ دق زدہ، جسے آخر میں کینسر بھی ہو گیا تھا، اس نے کسی کو بتائے بغیر، کبھی گلہ کیے بغیر، کبھی ہائے یا اُف کا لفظ نکالے بغیر، اسی معاملے میں لگا رہا کہ میں دوں گا۔ اور اب آج کے سمجھدار سیاستدان، سیاست کے پنڈت، لکھنے والے، ولایت کے لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان نے پچھلے ایک سو برس میں صرف ایک ہی لیڈر پیدا کیا ہے اور اس کا نام محمد علی جناح تھا۔ لیڈر ایک ہی تھا، باقی کے لوگ اور بھی بہت سے تھے۔ گاندھی جی کا ہم احترام کرتے ہیں، ٹھیک تھے، لیکن وہ لیڈر نہیں تھے۔ نہرو، ایک لاڈلا بچہ تھا اس کو سیاست میں دلچسپی نہیں تھی ادب میں البتہ تھی، اس نے خط وغیرہ لکھے، بڑے کمال کے، بہت اچھے لکھے۔ لیکن انگریز کے ساتھ سیاست کی لڑائی میں آج کے سیانے کہتے ہیں، وہ ایک ہی بندہ تھا جس نے انگریزوں سے کہا کہ آؤ اگر تم میرے ساتھ Constitutional Fight کرنا چاہتے ہو تو میں، آئین کی جنگ لڑنے کے تیار ہوں، میں ایک ایک باریک بات کو کھول کر بیان کروں گا، ادھر آؤ میں ہنر آزماؤں تم تیر آزماؤ، ہم بھاگنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں گے۔ تو گاندھی جی نے اپنا لباس تبدیل کیا، لوگوں کو دھرنے کی تعلیم دی۔ مرن برت (بھوک ہڑتال) کئی کچھ کرتے تھے۔ ان کا اپنا انداز تھا لیکن وہ انگریزوں کے ساتھ آنکھ میں آنکھ ڈال کر ویسی Fight نہ دے سکے۔

قائداعظم کہتے تھے، میں لباس نہیں تبدیل کروں گا، تمھاری زبان میں تم سے بات کروں گا، میں تمھارے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق، میں تمھارے قانون کے مطابق تم سے لڑائی کروں گا، اور پھر بار بار انھوں نے کہا پاکستان تو بعد کی بات ہے۔ اللہ کرے آپ اس کو پڑھ سکیں، اور پوری تفصیلات کے ساتھ اس کی طرف جا سکیں تو اس بابے نے جو کہ دیہاتیوں، کسانوں، دہقانوں کا بابا تھا، اسے قائداعظم کہتے تھے، اس نے دینے کے مقام پر کھڑے ہو کر کیا کچھ عطا کیا، ایک آخری بات جو بہت عجیب وغریب ہے، وہ یہ کہ میرے بچے، میرے پوتے، اور میری پوتیاں اور بہت ذہین آپ جیسے لڑکے لڑکیاں، تھوڑے دن ہوئے وہ بیٹھے ہوئے تھے اور یہ ذکر کر رہے تھے آپس میں کہ اگر اوپر کے لوگ ٹھیک ہو جائیں تو پھر نیچے کے لوگ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے، یہ عام خیال ہے۔

میں نے کہا، مجھے اجازت دو گے۔ کہنے لگے، نہیں بابا، آپ بالکل الٹی بات کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا، نہیں اتنی سی اجازت دو کہنے کی کہ اگر اوپر کے لوگ ٹھیک ہو جائیں اور خدانخواستہ نیچے کے نہ ہوئے تو پھر ہم کیا کریں گے۔ کہنے لگے، دیکھیے یہ مفروضہ نہیں، اوپر

> یہ ملک، یہ پاکستان، یہ حضرت صالحؑ کی اونٹنی ہے۔ اس کا احترام اور اس کا ادب ہم پر واجب ہے۔ حکومت کا بالکل خیال نہ کریں، حکومت والوں کا نہ ادب کریں، ان کو نہ مانیں، جو کہنا چاہتے ہیں، ان کے خلاف کہیں، مجھے اعتراض نہیں، لیکن اس ملک کے اس سرزمین کے، اس دھرتی کے خلاف اگر آپ نے کوئی بات کی تو پکڑے جائیں گے اور بڑے عذاب کی صورت سے گزریں گے

سے دیکھ کر ہی لوگ متاثر ہوتے ہیں، اور وہی کرتے ہیں۔ میں نے کہا، پیارے بچو یاد رکھو! اور لکھ لو اسے اپنے دل کی ڈائری میں کہ ایک ملک بنام پاکستان اور اس کے رہنے والے پاکستانی، دنیا کی اس خوش قسمت ترین قوم میں سے ہیں، جن کو نہایت نیک، نہایت ایماندار، نہایت Honest، نہایت شفاف، نہایت ذہین، نہایت بڑا سیاستدان، نہایت بہترین دوسری زبان جاننے والا، نہایت اعلیٰ درجے کا وکیل عطا کیا ہے اور جس نے اس قوم سے تانبے کا ایک پیسہ بھی محنت کے طور پر نہیں لیا، اور کمال کی اس نے لیڈرشپ فراہم کی۔ جو آپ آج مانگ رہے ہیں۔ لیکن قوم نے اس کے جواب میں کیا کیا کہ ایئرپورٹ کے آدھے راستے کے اوپر اس کی موٹر کار کا پیٹرول ختم ہو گیا اور اس نے اپنی جان آدھے راستے میں جانِ آفریں کے حوالے کر دی۔ یہ ہوتا ہے زندگی میں۔ اس بات کی تلاش نہ کرو کہ وہاں سے ٹھیک ہوں گے تو نیچے آئیں گے۔ ہم سب کو اپنے اپنے مقام پر ٹھیک ہونا ہے۔ خدا کے واسطے، یہ مت کہا کرو، اے پیارے مزدور، کسانو، ان پڑھ لوگو! کہ اگر بڑے لوگ نماز پڑھیں گے تو ہم پڑھیں گے۔ ورنہ تب تک ہم بیٹھے ہیں، نماز تو تمھاری اپنی ہے بابا۔ اچھے ہونا تو تمھارے اپنے بس میں ہے۔ ذمہ داری تو ہماری اپنی ہے۔ یہ کیا بہانہ لے کر بیٹھ گئے، یہ بات جو میں نے اپنے بچوں سے کہی، یہ میں آپ سے بھی کہنا چاہ رہا تھا اور کہہ رہا ہوں، اور بڑی دردمندی کے ساتھ کہہ رہا ہوں، اور اس دین کو، اس ذمہ داری کو، جو ہمارے کندھوں کے اوپر ہے، اور جس کا ہم مداوا نہیں کر سکتے کہ ہم نے کیا سلوک کیا، وہ شرمندگی ہمارے ساتھ ہے اور ہمارے ساتھ چلتی رہے گی اور ہم سارے کے سارے اس کے دین دار ہیں۔ کسی ایک بندے کو، یا کسی ایک حکومت کو، یا کسی ایک سسٹم کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

الحمد للہ! ابھی تک کسی نے ملک کے خلاف کوئی بات نہیں کی، باریکیاں سی نکال کے کچھ سیاست میں سے الٹی پلٹی باتیں بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور اگر آپ کو کوئی دریدہ ذہن یا ایسا گندا ذہن آدمی ملے، جو قائداعظم کی ذات میں کوئی، کیڑے نکالنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کو ضرور قریب سے جا کر دیکھیں، وہ دینے والوں میں سے نہیں ہوگا، لینے والوں میں سے ہو گا۔ پاکستان کے رہنے والو! زندہ رہو، خوش رہو، پائندہ رہو۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے۔

نئے قارئین کے لیے خصوصی پیشکش

اشعار میں دلچسپ عنوان سوچیے اور انعام پائیے

مرتب: سندس قاسم

ان تصاویر کو غور سے دیکھیے اور پھر سوچیے کون سا شعر یا مصرع اس حوالے سے موزوں رہے گا۔ اس صفحے کی فوٹو کاپی یا الگ صفحے پر اپنے نام، عمر، فون نمبر اور مکمل پتے کے ساتھ ہمیں اپنا جواب بھجوا دیجیے۔ بہترین اشعار پر دو تحائف آپ کے منتظر ہیں۔ تحفے میں چھ چھ ماہ کے لیے اُردو ڈائجسٹ کی اعزازی ترسیل صرف آپ کی خوشی کا باعث ہی نہیں ہوگی بلکہ آپ کی ذہانت اور ذوقِ مطالعہ کی تحسین بھی ہوگی۔ (ایڈیٹر: اُردو ڈائجسٹ)

درثے میں ملے 3 عشق

وارث میر کا لکھا ہوا 1971ء کا سچ نصاب کا حصہ ہونا چاہیے

اوریا مقبول جان

تین عشق مجھے اپنے والد سے ورثے میں ملے ہیں۔ ایک سیدالانبیاء ﷺ سے، دوسرا اقبال سے اور تیسرا پاکستان سے۔ جب میں میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوا تو وقفے کے تین چار ماہ کے دوران میں نے مارکس کی ''داس کیپیٹل'' ،کمیونسٹ مینی فسٹو، اینگلز کی ''خاندان، ریاست اور نجی ملکیت کا آغاز'' اور علامہ نیاز فتح پوری کی ''من ویزداں'' پڑھ ڈالیں۔ میری عمر صرف تیرہ سال تھی۔ میرے والد اس مطالعے پر بہت پریشان رہتے، لیکن ان کی پریشانی عروج پر جا پہنچی جب میں دہریت کی طرف مائل ہوگیا۔ کافی سمجھاتے رہے اور پھر ایک دن بلا کر کہا، تم ضرور واپس لوٹو گے، اس لیے کہ میں نے تمھیں درودِ پاک کی لوریاں دے کر پالا ہے۔ میں نے بات ہنسی میں ٹال دی کہ اس عمر میں اس طرح کے لٹریچر سے ایسا ہی رویہ جنم لیتا ہے۔ لیکن پتا نہیں کیوں، سانحہ مشرقی پاکستان نے میرے دل پر شدید اثر ڈالا۔ 15 سالہ نوجوان ہونے کے باوجود میں نے وہ رات روتے ہوئے گزاری۔ پاکستان سے ورثے میں ملا عشق مجھے اس ملک کے دشمنوں کی تلاش میں سرگرداں کر گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس ملک سے نفرت کرنے والے، اس کی بنیاد کو مشکوک بنانے والے اور اسے گالی دینے والے تو وہی ہیں جو اللہ کو نہیں مانتے، سیدالانبیاء ﷺ اور ان کے نظام سے نفرت کرتے ہیں، انسانوں کو رنگ، نسل اور زبان کی بنیاد پر ایک دوسرے سے نفرت کا درس دے کر اسے طبقاتی جدوجہد کا نام دیتے ہیں۔ ان کی گفتگو اور دلیل بھارت میں بیٹھے دانشوروں سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ یہ کس قدر ایک جیسا سچ، ایک طرح کی حقیقتیں اور ایک ہی طرح پاکستان کی بنیاد اور اقبال سے نفرتیں دل میں چھپائے ہوتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرے ملک کے ان ''عظیم'' دانشوروں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ سانحہ مشرقی پاکستان ہماری پالیسیوں کی وجہ سے پیش آیا۔ کوئی فوج کا نام لیتا اور کسی کو سیاسی لیڈر یاد آجاتے۔ لیکن مدتوں ان ''عظیم دانشوروں'' نے بھارت کے

اپنے بھائی بندوں کے ساتھ مل کر جو کھیل کھیلا تھا اور جس طرح کی مصنوعی نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا تھا۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو اس ماحول میں اصل حقائق سے پردہ اٹھاتے تھے۔ ایسے میں ایک نظریاتی اخبار میں پنجاب یونیورسٹی کے ایک استاد وارث میر کا سفرنامہ چھپنا شروع ہوا۔ وارث میر مشرقی پاکستان میں سقوط ڈھاکہ سے قبل پنجاب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کا ایک خیر سگالی وفد لے کر ڈھاکہ گئے اور اکتوبر 1971ء میں ان کا سفرنامہ اقساط میں شائع ہونے لگا۔ میری خوش نصیبی کہ 1976ء میں پنجاب یونیورسٹی کے جس ہاسٹل میں مجھے کمرہ ملا، اس کے وارڈن وارث میر تھے جو اکثر شام کو ہاسٹل کے لان میں ہمارے ساتھ بے تکان گفتگو کرتے اور ہر موضوع زیر بحث آتا۔ ان کے فرزند حامد میر اس زمانے میں نیکر پہنے ہاسٹل کے لان میں کھیلا کرتے تھے۔ مجھے ایک اعتراف بھی کرنا ہے کہ ہم دوستوں نے ایک دفعہ ان کا مرغ ذبح کر کے کھالیا تھا جسے ڈھونڈنے کی ذمہ داری حامد میر کے سپرد لگی تھی لیکن اس وقت ان کی تحقیقاتی رپورٹنگ ناکام ہوگئی۔

وارث میر صاحب ایک سچے اور محبِ وطن پاکستانی کی حیثیت سے بنگلہ دیش بننے اور اس زمانے کے اپنے سفرنامے کا ذکر کرتے ہوئے جذباتی ہوجاتے اور سفرنامے کے علاوہ بھی بھارت کی منصوبہ بندیوں اور پاکستان سے اس کی نفرت اور تعصب کو اجاگر کرتے۔ میں یہاں وارث میر کے اکتوبر 1971ء کے سفرنامے کے اقتباسات نقل کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ اس سچے انسان کی زبان سے سنیں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں کیا کھیل کھیلا گیا۔ ''ایک طالب علم بولا ہمارے لیڈروں کا المیہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے مغربی پاکستان یا پنجاب کے عام مسلمانوں کا ذکر برائی کی علامت کے طور پر کیا، حالانکہ یہ برائی ملک کے دونوں حصوں کے عوام پر مسلط ہے.....'' ''یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ کم از کم تعلیمی اور رہائشی سہولتیں حاصل کرنے کی دوڑ میں مشرقی پاکستان کے طلبہ کہیں آگے تھے بلکہ مغربی پاکستان کے طلبہ بجا طور پر شکوہ کر سکتے ہیں.....'' ''یہ بات عام سننے میں آئی کہ عوامی لیگ کی دہشت گردی میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ پیش پیش تھے اور فوج کی کارروائی کے دوران ایسے طلبہ کی اکثریت سرحد عبور کر چکی ہے اور انہی طلبہ کو چند روز تربیت دینے کے بعد بھارتی فوج پاکستانی سرحدوں پر پھینک دیتی ہے.....'' ''اس ہال میں عوامی لیگ کے حامی طالب علموں نے اپنی ہی ہم جماعت غیر بنگالی لڑکیوں پر وہ وہ ظلم وستم ڈھائے ہیں کہ ان کا ذکر تو درکنار تصور کرتے ہی یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑ کر بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے.....''

وارث میر کا یہ سفرنامہ اس دور میں چھپا جب مشرقی پاکستان پر آرمی ایکشن ہو رہا تھا اور وہ وہاں گئے تھے۔ یہ ان کا اس دور کا سچ تھا اور میری ان سے آخری ملاقات جولائی 1979ء میں ہوئی اور وہ اس وقت تک اسی سچ پر قائم تھے اور مشرقی پاکستان کے ذکر سے ان کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ اور وہ کہتے مشرقی پاکستان بھارت اور مشرقی پاکستان کے ہندوؤں، پاکستان کے کمیونسٹوں اور قوم پرست دانشوروں کی مسلسل محنت سے ٹوٹا۔ یہ سفرنامہ وہ سچ ہے جو اس زمانے میں بولا گیا

اساتذہ ہمارے منہ پر کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا منصوبہ غیر بنگالیوں کی نسل کو ختم کرنا ہے اور آپ غیر بنگالی ہیں.....'' ''مشرقی پاکستان کی نئی نسل کے ذہنوں کو متاثر کرنے میں نیشنلسٹ مسلمان اساتذہ کے علاوہ ہندو اساتذہ نے جو کردار ادا کیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔'' ایک جگہ وارث میر نے پروفیسر گوبند چندر دیو کا ذکر کیا ہے جو اس نفرت کی فلسفیانہ اساس مہیا کرتا تھا۔ ''ان کی سرگرمیاں بہت ہی علمی اور پراسرار تھیں۔ وہ دوسرے تیسرے مہینے کسی نہ کسی ''تعلیمی مصروفیت'' کے بہانے بھارت کا چکر ضرور لگاتے تھے۔''

پاکستان کے دونوں حصوں میں غلط فہمیوں کو بڑھانے کی کوششوں کا سراغ لندن کے تعلیمی اور تحقیقی اداروں میں 55ء اور 56ء کے سالوں کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے۔ سندھ یونیورسٹی کے ایک استاد نے لندن کے ایک تعلیمی ادارے کو درخواست دی کہ وہ انھیں پاکستان میں بیٹھ کر ''ادائیگیوں کے توازن'' پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی اجازت دیں، جواب آیا اجازت ہے مقالہ مغربی اور مشرقی پاکستان کی ادائیگیوں کے توازن پر لکھنا ہوگا۔ اپریل 1971ء کے آغاز میں نیویارک کی سڑکوں پر بنگلہ دیش کی حمایت میں ایک جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس کے شرکاء میں یہودیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ انھوں نے ایک بے تکلف یہودی دوست سے پوچھا: ''تم ہندو بنگالیوں کی طرف سے منظم کیے جانے والے جلوس میں بطور خاص کیوں شریک ہو، یہودی بولا: ''ہمیں خفیہ طور پر ہدایت دی گئی ہے کہ بنگلہ دیش تحریک کا زیادہ سے زیادہ ساتھ دو۔'' ''اندرا گاندھی کا فرمانا تھا کہ میری رائے میں مجیب الرحمٰن کی ہم سے زیادہ دوستی ہے۔'' چیف منسٹر بہار کا بیان تھا: نتائج کچھ بھی ہوں، میں بنگلہ دیش کے لیے اسلحہ کی فراہمی سے پیچھے نہیں ہٹوں گا.....'' ''اس وقت تو ہم تھرا گئے جب جلسے کے بعد ہمیں وہ سلاٹر ہاؤس دکھایا گیا جہاں غیر بنگالیوں کو ذبح کیا جاتا اور ایک بڑی میز پر لٹا کر ان کے جسم سے خون نچوڑ کر بڑے بڑے برتنوں میں جمع کیا جاتا۔''

''عوامی لیگ کی بغاوت کے بعد کپتیا ڈیم کے غیر ملکی انجینئروں کو قیامت صغریٰ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس علاقے میں آباد تمام خاندانوں کے مردوں کو ان کے اہل خانہ کے سامنے گولی سے اڑا دیا گیا اور عورتیں پاگلوں کی طرح گلی کوچوں میں چیختی چلاتی اور بھاگتی پھرتی تھیں۔ محمد پور اور میر پور کے کیمپوں میں کٹے پھٹے جسموں والی عورتیں مکتی باہنی کے دہشت پسندوں کی غیر انسانی کارروائیوں کی دردناک کہانیاں سناتی تھیں۔''

وارث میر کا یہ سفرنامہ اس دور میں چھپا جب مشرقی پاکستان پر آرمی ایکشن ہو رہا تھا اور وہ وہاں گئے تھے۔ یہ ان کا اس دور کا سچ تھا اور میری ان سے آخری ملاقات جولائی 1979ء میں ہوئی اور وہ اس وقت تک اسی سچ پر قائم تھے اور مشرقی پاکستان کے ذکر سے ان کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ اور وہ کہتے مشرقی پاکستان بھارت اور مشرقی پاکستان کے ہندوؤں، پاکستان کے کمیونسٹوں اور قوم پرست دانشوروں کی مسلسل محنت سے ٹوٹا۔ یہ سفرنامہ وہ سچ ہے جو اس زمانے میں بولا گیا۔ اس سفرنامے کو ہمارے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔ اسے کسی اخبار کو دوبارہ شائع کرنا چاہیے کہ میرے ملک کو آج بھی ویسی ہی صورت حال کا سامنا ہے۔

یہ 29 مارچ کی بات ہے، 7 سالہ پوجا میگھوال اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مویشی چرانے اور لکڑیاں لینے جنگل میں گئی۔ وہ 43 کے وائی ڈی (KYD) گاؤں کی باسی تھی۔ یہ گاؤں بھارتی ریاست راجھستان کے ضلع بیکانیر میں واقع ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بھارتی شہر بیکانیر اور پاکستانی بین الاقوامی سرحدی گاؤں سے صرف سوا میل دور ہے۔

بھائی تو مویشی چراتا آگے نکل گیا، پوجا لکڑیاں چننے لگی۔ جب اس کا کام ختم ہوا، تو پوجا نے سوچا کہ

پاکستانی رینجرز نے بھارتی عوام کا دل جیت لیا

راستہ بھول کر سرحد پار کرنے والی ایک سات سالہ راجھستانی بچی پر کیا بیتی

عالیہ احمد

تنہا ہی گھر چلی جاتی ہوں۔ چنانچہ وہ واپس چل پڑی۔ سر پہ لکڑیوں کا گٹھا تھا اور یہ ننھی سی جان، وہ کچھ ہی دیر بعد تھک گئی مگر اس نے چلنا جاری رکھا۔

پوجا کو خبر نہ تھی کہ تھکن کے مارے وہ راستہ بھٹک گئی اور پاک بھارت سرحد پر جا پہنچی۔ عجیب اتفاق کہ وہ جس جگہ گئی، وہاں سرحد کے درمیان لگی باڑ یا تار ٹوٹی ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ عالم بے خبری میں اس کھلے راستے سے گزرتی پاکستان میں داخل ہوگئی۔

وہ خاصی دور تک چلی گئی۔ جب گاؤں نہ آیا، تب معصوم بچی کو احساس ہوا کہ وہ راستہ کھو چکی ہے۔ خوف کے مارے اس کا برا حال ہوگیا۔ تبھی دور اُسے ایک کچا مکان نظر آیا۔ وہ وہاں پہنچی، تو دیکھا کہ مکان خالی ہے۔ اندھیرا چھا چکا تھا، لہٰذا اس نے رات وہیں بسر کرنے کا پروگرام بنایا۔ وہ دیر تک روتی بسورتی رہی، پھر نندیا اُسے خوابوں کی وادی میں لے گئی۔

صبح آہٹ سن کر پوجا کی آنکھ کھلی۔ دیکھا تین آدمی نامانوس وردی پہنے اُسے حیرت سے تک رہے ہیں۔ وہ خوفزدہ ہوگئی۔ تاہم ایک آدمی نے اُسے دلاسا دیا اور پیار سے سر پہ ہاتھ پھیرا، تو پوجا کا ڈر کم ہوا۔ اُسے علم نہ تھا کہ یہ پاکستان رینجرز کے جوان ہیں۔

رینجرز اُسے قریب واقع چوکی لے گئے۔ جہاں بعض رینجرز کے اہل خانہ بھی مقیم تھے۔ وہاں ایک جوان کی بیگم نے بچی کو نہلایا دھلایا اور پہننے کو لباس دیا۔ تاہم پوجا سہمی رہی۔ بچی کا خوف بالآخر اس وقت دور ہوا جب اُسے روٹی اور سبزی کھانے کو ملی۔ پھر جوانوں نے اُسے بسکٹ، چپس اور ٹافیاں بھی دیں۔

سرحد کے پار

اُدھر رات چھا گئی اور پوجا گاؤں واپس نہ پہنچی تو اس کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ وہ گھر ہی نہیں پورے گاؤں کی لاڈلی بچی تھی۔ سب اس نٹ کھٹ اور خوبصورت بچی کو چاہتے تھے۔ ویسے بھی راجستھان میں لڑکیاں اب خال خال ہی نظر آتی ہیں۔

پوجا کا باپ، سکھ رام گاؤں کے مکھیا، رینوندر سکھ کو لیے مقامی پولیس چوکی پہنچا۔ سپاہیوں نے اُسے کہا کہ اب رات کو جنگل میں ڈھونڈنا محال ہے، صبح ہی کچھ ہوسکے گا۔ چنانچہ صبح اجالا پھیلتے ہی پوجا کی تلاش شروع ہوگئی۔

ایک جگہ کھوجیوں کو پوجا کے پاؤں کے نشان مل گئے۔ ان کا پیچھا کیا گیا، تو وہ پاکستان کی طرف جا رہے تھے۔ سپاہی سمجھ گئے کہ بچی سرحد پار چلی گئی ہے۔ لہٰذا اب بارڈر سیکورٹی فورس سے رابطہ کیا گیا۔ چنانچہ بھارتی سرحدی فوج نے پاکستان رینجرز سے رجوع کیا۔

پاکستان رینجرز نے شروع میں بھارتیوں کو یہ نہیں بتایا کہ بچی مل گئی ہے۔ وہ پوجا سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ جب انھیں یقین ہوگیا کہ یہ جاسوسہ نہیں بلکہ معصوم بچی ہے، تو تبھی 31 مارچ کو بھارتی فوج نے جانا، پوجا مل گئی ہے۔

پوجا کی واپسی

اب پاکستان رینجرز اور بھارتی بارڈر فورس کے مابین میٹنگز ہوئیں۔ آخر 10 اپریل کو پوجا واپس اپنے دیس پہنچ گئی۔ اس کے والدین کو تشویش تھی کہ نہ جانے ان کی بچی کس حال میں ہو؟ لیکن جب انھوں نے پوجا کو نئے کپڑوں میں ملبوس اور نئی چپل پہنے دیکھا، تو وہ حیران رہ گئے۔ پوجا بہت خوش نظر آرہی تھی کیونکہ پاکستانی رینجرز نے اُسے ٹافیوں، چپس اور چاکلیٹ کے پیکٹ دیے تھے۔

متوحش والدین نے جب پوجا کو خوش دیکھا، تو وہ بھی مطمئن ہوگئے۔ پوجا نے انھیں پاکستانی رینجرز کی ہمدردی و محبت کے کئی واقعات سنائے۔ مثلاً یہ کہ وہ اس سے کھیلتے رہے۔ انھوں نے اس کے اہل خانہ کے متعلق سوالات کیے۔ حتیٰ کہ اتوار کو جب پوجا کی طبیعت خراب ہوگئی، تو اس کا علاج بھی ہوا اور ادویہ خریدی گئیں۔

گاؤں والوں کو علم ہوا کہ پوجا خیروعافیت سے ہے، تو انھوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ منگل کو سکھ رام نے گاؤں والوں میں مٹھائی بانٹی۔ جلد ہی یہ خبر پورے صوبے اور پھر بھارت میں پھیل گئی۔ تب صحافیوں نے 43 کے وائی ڈی پر یلغار کردی۔ وہ پوجا کی داستان تفصیل سے سننا اور پھر لکھنا چاہتے تھے۔

بعدازاں مختلف اخبارات نے پوجا کی داستان نمایاں انداز میں شائع کی۔ نیز نیوز چینلوں نے اس سے انٹرویو بھی کیے۔ یوں بھارت کے عوام اس حقیقت سے آگاہ ہوئے کہ پاکستانی رینجرز نے ایک راہ بھٹکی بھارتی لڑکی کو نہ صرف حفظ و امان میں رکھا بلکہ اس کی خوب خاطر مدارات بھی کی۔ اس واقع کو پورے بھارت میں بہ نظر تحسین دیکھا گیا۔ حتیٰ کہ پاکستان مخالف بھارتی اخبار، انڈین ایکسپریس نے پوجا پر مضمون چھاپا، تو اس میں پاکستانی رینجرز کی ستائش کی گئی۔

پاکستانی رینجرز کی خواہش ہے کہ پوجا ان سے دوبارہ ملاقات کرے۔ اُدھر بھارتی بارڈر فورس کا یہ رویہ ہے کہ انھوں نے پوجا کے والد کو تین مرتبہ طلب کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ بچی "تشدد" کی وجہ سے راتوں کو چیختی تو نہیں؟ انھوں نے سکھ رام کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ پاکستانی رینجرز کا دیا گیا جوڑا تلف کردے۔

قدیم پہاڑی سلسلے اور انبیاء کرامؑ

پہاڑوں کی رفعت اور ان کے سینے میں کھدے ہوئے غاروں کا وجود خالق کائنات کی عظمت و ہیبت کی علامت ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں موجود یہ غار گویا راحت و سکون کے فطری مراکز ہیں جہاں اکثر انبیاء کرام علیہم السلام نے تلاشِ سکون اور یکسوئی قلب کے لیے مجاہدات کیے۔ انبیاء کرامؑ کا پہاڑوں سے رشتہ بڑا قدیم ہے۔ ابوالبشر حضرت آدمؑ کا جنت سے زمین پر نزول ایک پہاڑ پر ہوا جو "کوہِ آدم" کہلاتا ہے..... طوفانِ بادوباراں کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی "کوہِ جودی" پر جا کر ٹھہری..... حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ سے کلام کا شرف "کوہِ طور" پر حاصل ہوا..... حضور اکرم ﷺ نے یکسوئی قلب کے لئے غارِ حرا کو پسند فرمایا۔ (محمد اویس اکرم، ساہیوال)

بھارتی فوج کے شکوک و شبہات کے باوجود پوجا کے اہل خانہ اور گاؤں والے پاکستانی رینجرز سے بہت خوش ہیں۔ وہ ان کے ممنون ہیں کہ انھوں نے پوجا کو بڑے آرام اور چاہت سے رکھا۔ پوجا بھی اپنے "چاچاؤں" سے ملنا چاہتی ہے، لیکن بھارتی بارڈر فورس آڑے آجاتی ہے۔

تجزیہ نگاروں کے مطابق اس واقعے نے پاک بھارت تعلقات پر خوشگوار اثر ڈالا ہے اور پچھلے چند ماہ سے نفرت اور کدورت کا جو ماحول بنا ہوا تھا، وہ خاصا کم ہوگیا۔ کاش باہمی اختلاف کا سب سے بڑا سبب مسئلہ کشمیر حل ہوجائے، تو امن کی فضا دونوں ممالک کی ترقی و خوشحالی کا سبب بن سکتی ہے۔

ایک برازیلی نے پاکستان کو کیسا پایا؟

اتنے کم خرچ میں شاید ہی کسی ملک کی سیاحت ممکن ہو

وے شین

جہاز اسلام آباد جانے کا فیصلہ کیا۔ گویوں میں شا
قراقرم پر آنے والے خوبصورت فطری م
دیکھنے سے محروم رہ گیا۔

آباد
اڈے
سلیمان

کیا۔ ہم دونوں جلد گھل مل گئے۔ اس
مجھے اپنا موبائل فون دے دیا تا کہ اُسے استع
کر سکوں۔ میں نے اخلاقاً اُسے 40
(چینی کرنسی) دیے جو اس نے قبول کر لیے
1 رینمبی 15 پاکستانی روپوں کے برابر تھا۔
سلیمان مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں میں نہا
اور آرام کیا۔ شام کو میں سعید پور دیہہ جانا چاہتا
اسلام آباد کا قدیم علاقہ ہے۔ وہاں پاکستانی تہذ
ثقافت کے نمونے ملتے ہیں۔ سلیمان کو ضروری کام
اس نے مجھے سعید پور جانے کا پتا اچھی طرح سمجھا دی
میں ٹیکسی میں جا سکتا تھا، مگر دانستہ میں نے
سفر کیا۔ پاکستان میں بسیں کم ہیں، وین زی
ہیں۔ ان پر بسوں کی طرح نمبر لکھے ہوتے ہیں

اسلام آباد میں آمد

میں اوائل جون میں سنکیانگ (چینی ترکستان) کے صدر مقام ''اورمچی'' پہنچ گیا۔ وہاں سے میں بذریعہ بس شاہراہ قراقرم پر سفر کرتا پاکستان میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ پاکستان جانے والی بس 15 دن بعد روانہ ہوگی۔ اس لیے میں نے بذریعہ ہوائی

1998ء میں وے شین (Way Chien) دس سال کا تھا کہ اپنے چینی والدین کے ہمراہ برازیل چلا گیا۔ ریوڈی جنیرو وہ ہی میں اس کی پرورش ہوئی اور وہ برازیلی شہری کی صورت پروان چڑھا۔ ایک عمدہ کمپیوٹر پروگرامر ہونے کے علاوہ سیر و سیاحت کا شوقین ہے۔ اُسے نئی جگہیں دیکھنے، نئے لوگوں سے ملنے اور نئی باتیں جاننے کا شوق ہے۔

2007ء میں بسلسلہ ملازمت وے شین بیجنگ، چین چلا آیا۔ 2012ء میں اس نے منصوبہ بنایا کہ وہ ہر سال سالانہ چھٹیاں کسی نئے ملک میں گزارے گا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے چین کے پڑوسی اور دیرینہ دوست، پاکستان کی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ فیس بک پر وے شین دس پاکستانی دوست رکھتا تھا۔ ان میں سے ایک سلیمان راولپنڈی میں مقیم تھا۔ وے سب سے پہلے اسی شہر میں قیام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ سلیمان نے اس کی میزبانی کرنا قبول کر لیا۔ وے نے پھر 17 دن پاکستان میں گذارے۔

اس دوران وے کو پاکستان میں تلخ و شیریں، دونوں قسم کے تجربات سے واسطہ پڑا۔ وے نے پھر اپنے بلاگ میں پاکستان کا سفرنامہ لکھا جس کے چیدہ حصے اب نذر قارئین ہیں۔ ایک چینی نژاد برازیلی نے جیسے وطن عزیز کو پایا اور دیکھا، وہ دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

وین مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہے۔ تاہم میں نشست حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

میرے ساتھ ایک نوجوان بھی مطلوبہ بس اسٹاپ پر اترا۔ اُسے جب احساس ہوا کہ میں پاکستان میں مہمان ہوں، تو اس نے مجھے جوس پلایا۔ پھر تفصیل سے سعید پور جانے کا راستہ بتایا۔ مجھے اس کا دوستانہ رویہ دیکھ کر حیرانی ہوئی۔

میں پھر قریب ہی واقع موبائل فونوں کی ایک دکان میں داخل ہوا تا کہ مقامی سم خرید سکوں۔ مجھے بتایا گیا کہ غیر ملکی صرف کمپنیوں کے صدر دفتر ہی سے سم خرید سکتے ہیں۔ میں یہ کام اگلے دن پر ملتوی کر کے سعید پور پہنچ گیا۔ وہاں ایک جگہ نیٹ مفت دستیاب تھا۔ مجھے خاصی حیرت ہوئی۔

سعید پور میں کئی اچھے ریستوران موجود ہیں۔ وہیں میں نے مزے دار کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد مٹرگشت کرتے ہوئے ایک پرتگالی سے ملاقات ہوئی۔ دیار غیر میں ایک ہم زبان سے گفتگو کرنا خوشگوار تجربہ رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے ہی دیس میں ہوں۔

اگلے دن میں سب سے پہلے ایرانی سفارت خانے پہنچا کیوں کہ میں ایران کا ویزا لینا چاہتا تھا لیکن مجھے وقت کا حساب لگانے میں غلطی ہوگئی۔ راستے میں وین ٹریفک میں پھنس گئی، تو خاصا وقت صرف ہوا۔ پھر

سیکورٹی چیک پوائنٹس پر کافی وقت لگا۔ چنانچہ جب میں سفارت خانے پہنچا، تو وہ بند ہو چکا تھا۔ مجھے علم نہ تھا کہ وہاں پہنچنا اتنا کٹھن مرحلہ ہوگا۔ میں نے کوفت سے بچنے کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز ہی ایران جانے کا فیصلہ کیا۔ یوں ہوائی اڈے ہی پر مجھے ویزہ مل جاتا۔

سہ پہر کو میں مری کی سیر کے لیے نکل گیا جو اسلام آباد کے نزدیک واقع مشہور پُر فضا مقام ہے۔ راستے میں پھر سیکورٹی چوکیوں سے گزرنا پڑا جہاں لمبی بندوقیں تانے گارڈ استادہ تھے۔ پاکستان میں واحد یہ مقام تھا جہاں میں نے خود کو کچھ تکلیف میں محسوس کیا۔ واپسی پر بس میں ایک طالب علم ملا۔ اس سے باتیں کرنے میں مزہ آیا۔ اس نے مجھے قائداعظم یونیورسٹی آنے کی دعوت دی جو میں نے قبول کرلی۔

ٹیکسلا کا سفر

ٹیکسلا ایک قدیم شہر ہے جو اب اجڑ چکا ہے۔ ماضی میں یہ بدھ مت کا اہم مرکز تھا۔ اب بیشتر عمارتیں صفحہ ہستی سے مٹ چکی ہیں۔ شہر کے آثار بھی دنیا بھر میں پھیل چکے، پھر بھی ٹیکسلا کے کھنڈر ناپید تہذیب کے متعلق بہت کچھ بتاتے ہیں۔ وہاں انگریزی بولنے والا ایک گائیڈ ملا جس نے ٹیکسلا اور قریبی معدوم شہر سرکپ کے متعلق بہت کچھ بتایا۔

ٹیکسلا میں گھومتے ہوئے ایک مقامی بوڑھے سے ملاقات ہوئی جو انگریزی جانتا تھا۔ وہ مجھے ہوٹل لے گیا۔ چائے پلائی اور بسکٹ کھلائے۔ اس سے مختلف موضوعات پر پرتکلف گفتگو رہی۔ اسی سے پتا چلا کہ ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کا گھر گرایا جاچکا ہے۔ میں ایبٹ آباد جا کر اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔ جب یہ خبر ملی، تو جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔

ٹیکسلا سے واپسی پر میں محمود سے ملنے قائداعظم یونیورسٹی پہنچا۔ وہ ایک عظیم الشان درس گاہ ہے جہاں کی سیر کرتے ہوئے بہت اچھا وقت کٹا۔ لیکن شام کو اچانک وہاں اندھیرا چھا گیا اور مجھے کچھ خوف محسوس ہوا۔ لیکن پھر یاد آیا کہ پاکستان میں بجلی کی شدید کمی ہے۔ روزانہ کئی گھنٹے بجلی جانا معمول ہے۔

اگلے دن سلیمان کے پاس وقت تھا۔ چنانچہ وہ مجھے مارگلہ ہلز کی چوٹی پر لے گیا۔ یہ تین ہزار میٹر سے بلند پہاڑیاں ہیں۔ وہاں سے اسلام آباد کا بڑا دلفریب اور خوش کن منظر نظر آتا ہے۔ چوٹی پر ایک خوبصورت ریستوران بھی واقع ہے۔

جس نے لاہور نہیں دیکھا.....

میرا اگلا پڑاؤ لاہور میں تھا۔ میں بذریعہ ریل راولپنڈی سے روانہ ہوا اور وقت پر لاہور اسٹیشن پہنچ گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ریلیں کئی گھنٹے دیر سے پہنچتی ہیں، لیکن میرے ساتھ یہ ماجرا پیش نہیں آیا۔ شاید میں خوش قسمت رہا۔ لاہور میں میرے میزبان محسن پنجاب یونیورسٹی میں استاد تھے۔

لاہور وسیع و عریض شہر ثابت ہوا۔ اس کے نزدیک ہی واہگہ بارڈر ہے۔ یہ بھارت آنے جانے کا واحد قانونی راستہ ہے۔ اگلے دن میں وہاں منعقد ہونے والی تقریب میں شریک ہوا۔ وہ موسیقی، ناچ اور بلند نعروں سے عبارت تھی۔ دونوں اطراف، پاکستانیوں اور بھارتیوں میں جذبات کی فروانی دیکھی۔ تقریب دلچسپ اور ولولہ خیز تھی۔

سہ پہر کو شاہی قلعہ اور بادشاہی مسجد کی سیر کرتے گزرا۔ لاہور میں کئی قابل دید مقامات ہیں، لیکن مجھے سب سے زیادہ وہاں کے باسیوں نے متاثر کیا۔ ایک

دفعہ بس میں ایسا لاہوریا ملا جو مجھے اردو سکھانے کی سعی کرتا رہا۔ ایک اجنبی نے 15 منٹ کا اپنا قیمتی وقت صرف کرکے مجھے بس سٹاپ پہ پہنچایا۔ دوسرے اجنبی نے دیکھا کہ میں مطلوبہ منزل پر بذریعہ بس نہیں جاسکتا، تو وہ مجھے اپنی موٹر سائیکل پر چھوڑ آیا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پاکستانی ہر جگہ مصیبت میں مبتلا انسان کی مدد کرتے اور حیران کردیتے ہیں۔

لاہور جی بھر کر دیکھ لیا، تو کراچی کا رُخ کیا۔ جس دن مجھے لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچنا تھا، اسی دن صبح وہاں بم دھماکہ ہوگیا۔ یہ ایک طرح سے میری خوش قسمتی تھی کیونکہ دہشت گرد عموماً اس جگہ دوبارہ حملہ نہیں کرتے۔ یہ بھی اچھی بات رہی کہ دھماکے کی خبر برازیل نہ پہنچی ورنہ میرے والدین اور بیگم پریشان ہوجاتے۔

کراچی میں مدیحہ کی مہمانی

کراچی جاتے ہوئے ریل میں پھر دوستانہ مزاج رکھنے والے کئی لوگ ملے۔ دورانِ سفر ان سے گفتگو کرتا رہا۔ کراچی میں میری میزبان، مدیحہ ایک اخبار میں کام کرتی ہیں۔ وہی مجھے اسٹیشن لینے آئی ہوئی تھیں۔ ریل صرف آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچی۔

اسٹیشن سے ہم کافی شاپ پہنچے۔ وہاں امن وسکون کا دور دورہ تھا۔ اچانک ریستوران میں افراتفری مچ گئی۔ بیروں نے دروازے کھڑکیاں بند کیں اور ان پر بھاری پردے ڈال دیے۔ باہر شاید کسی قسم کا احتجاج ہو رہا تھا۔ مجھے ڈر تو لگا، سنسنی کا احساس زیادہ ہوا۔ جلوس گزر گیا، تو پھر حالات معمول پر آگئے۔ مجھے اس سے پہلے کبھی ایسی مہم جویانہ صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

میں پانچ دن مدیحہ کے گھر رُکا۔ چونکہ اس کے اوقات کار لچک دار تھے، لہٰذا میں اسی کے ساتھ کراچی میں گھومتا پھرتا رہا۔ مجھے سب سے زیادہ لطف چوکنڈی کی قبریں دیکھ کر آیا۔ وہاں قبرستان کے چوکیدار نے ہمیں قبروں کی تاریخ سے آگاہ کیا اور بتایا کہ مردوں کی قبر پر ہتھیار جبکہ خواتین کی آرام گاہوں پر ہار بندے کندہ ہیں۔ ہمیں چوکیدار کی زبانی یہ جان کر صدمہ پہنچا کہ حکومت اس قومی ورثے کی دیکھ بھال نہیں کررہی۔

اگلے دن ہم نے کراچی کے مشہور ساحل سمندر، ہاکس بے جانا تھا، لیکن ہماری گاڑی لیاری میں پھنس کر رہ گئی۔ وہاں ایک بڑا جلوس نکلا ہوا تھا۔ ہر گاڑی والا وہاں سے بھاگ رہا تھا لیکن ہم جلوس کے نزدیک جا پہنچے۔ شاید میری ذات مصائب کو آنے کی دعوت دیتی ہے یا شاید میری مہم جوئی کی عادت مجھے خطرات سے کھیلنے پر ابھارتی ہے۔

آخرکار پاکستان سے روانگی کا دن قریب آپہنچا۔ یہ مملکت آج کئی مسائل مثلاً حکمرانوں کی کرپشن، بجلی کی کمی اور دہشت گردی کا شکار ہے، مگر یہاں کے باشندے انتہائی ہمدرد، مددگار اور دوستی پسند ہیں۔ پاکستانی قوم جب بھی اپنے مسائل حل کرنے میں کامیاب ہوئی وہ پاکستان کو ایک عظیم مملکت بنا سکتی ہے۔

دورہ پاکستان میں میرے کل 468 ڈالر خرچ ہوئے۔ لیکن اس میں اور مچی سے اسلام آباد تک کا ہوائی ٹکٹ بھی شامل ہے جو 300 ڈالر میں پڑا۔ میں نے سترہ دن پاکستان میں قیام کیا، گویا روزانہ میرا کل خرچ 9.88 ڈالر (988 روپے) آیا۔ اتنے کم خرچ میں شاید ہی کسی اور ملک کی سیاحت کرنا ممکن ہو۔ پاکستان زندہ باد۔

آزادی کا ترجمان

لاہور کے منٹو پارک میں منظور ہونے والی
قرارداد کی یاد میں تعمیر کیے جانے والے مینار کی داستان

شمع شریف

مینار

پاکستان عین اسی جگہ پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں 23 مارچ 1940ء کو قرارداد پاکستان منظور کی گئی تھی۔ اس کی تعمیر کا مقصد ہماری آنے والی نسلوں کو یہ بتانا اور یاد دلانا ہے کہ مملکت عظیم "پاکستان" کی اصل بنیاد وہ قرارداد ہے جو آج سے 73 سال قبل اسی مقام پر اسی شہر میں منظور کی گئی تھی جسے ہمارے قومی لیڈروں نے قرار داد پاکستان کا نام دیا تھا۔ چنانچہ ہمارے مخلص لیڈروں نے فیصلہ کیا کہ یہاں ایک ایسی پرشکوہ، شاندار اور خوبصورت عمارت تعمیر کی جائے جو مسلمانانِ ہند کے عزم و ہمت اور احساسات و جذبات کی آئینہ دار ہو۔ قائداعظم کی وفات کے بعد صدر ایوب کی حکومت کے قیام تک اس مطالبے پر کسی حکمران نے مطلق کان نہ دھرے تاہم صدر ایوب کے حکم سے 1960ء میں پاکستان ڈے میموریل کے نام سے لاہور ڈویژن کے کمشنر مسٹر عجم خاں کی زیرِ نگرانی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس کے تحت ذیلی کمیٹیوں کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ تعمیری کمیٹی کے چیئرمین مسٹر نصیر الدین مرات خاں تھے۔ دوسری کمیٹی میاں محمد شفیع ایڈیشنل سیکرٹری پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ پر مشتمل تھی اور اس میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، میاں محمد بشیر، نواب زادہ رشید علی خاں، مسٹر ولی اللہ خاں اور علامہ علاؤالدین صدیقی بھی شامل تھے۔

1963ء کے اوائل میں ماہر تعمیرات نصیر الدین مرات خاں نے صدر پاکستان کو اس کا ماڈل دکھایا۔ لیکن اس ماڈل کو صدرِ پاکستان نے پسند نہ فرمایا۔ چنانچہ ان کی ہدایت پر نیا نقشہ بنایا گیا جسے منظور کر لیا گیا۔ میاں عبدالخالق اینڈ کمپنی کو اس نئے نقشے کے مطابق مینار پاکستان کی تعمیر کا فریضہ سونپا گیا۔

مینار پاکستان کی تکمیل 31 اکتوبر 1968ء کو پانچ سال کی مدت میں ہوئی۔ تعمیری اخراجات پورے کرنے کے لیے حکومت نے سینما کی ٹکٹوں پر دس پیسے اور گھڑ دوڑ کی ٹکٹوں پر پچاس پیسے ٹیکس لگایا اور یوں دو کروڑ سات لاکھ روپے جمع کیے۔ مینار پاکستان کی تعمیر پر کل 75 لاکھ روپے خرچ ہوئے۔

مینار پاکستان کا ماڈل اعجاز حسین کاظمی اور مستری نذیر احمد نے بنایا۔ اس کی تعمیر میں جن باکمال انجینیئرز نے حصہ لیا ان کے اسمائے گرامی ہیں: جمال الدین (سابق چیف انجینئر) ہائی وے، عبدالرحمٰن خاں نیازی، مرات خاں کے سینئر سلیم گل، بجلی کے ڈیزائن میں مدد دی اعجاز حسین آرک اسسٹنٹ اقبال علی، اسماعیل سینئر آرک اسسٹنٹ اور عبدالخالق ٹھیکیدار وغیرہ۔

مینار کی بلندی ایک سو چھیانوے فٹ چھ انچ ہے۔ ایک سو اسی فٹ تک لوہا اور کنکریٹ استعمال کیا گیا ہے جبکہ باقی بالائی ساڑھے سولہ فٹ حصے کی تعمیر میں سٹین لیس سٹیل استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا شیشہ تیرہ فٹ بلند ہے۔ مینار کے نچلے حصے میں سنگ مرمر کے کھردرے پتھر اور اوپر کے حصے میں نرم اور ملائم پتھر استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے فواروں میں قریباً دو دو فٹ چوڑی سنگ مرمر کی دس عدد سلیں نصب کی گئی ہیں۔ جن پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام کندہ ہیں۔

ایک سل پر مفکرِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کی ایک مشہور نظم کندہ کی گئی ہے جس کا ایک مشہور شعر درج ذیل ہے:

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

اس کے علاوہ تین سلوں پر تحریک پاکستان کے عنوان سے حضرت قائداعظم کی نظریہ پاکستان سے متعلق کی جانے والی تقاریر کے اقتباسات، قرارداد لاہور، قرارداد دہلی (اردو، بنگلہ اور انگریزی) قومی ترانہ (بنگلہ اور اردو) کندہ ہے۔ 30 اکتوبر 1947ء کو قائداعظم نے جو تقریر کی تھی اس سے ایک اقتباس درج کیا گیا ہے۔ مینار پر سورہ بقرہ، سورۃ آل عمران، سورۃ مائدہ، سورہ الرعد کی آیات بھی کندہ ہیں۔ مینار کے صدر دروازے پر اللہ اکبر اور دوسری سل پر مینار پاکستان کے الفاظ کندہ ہیں۔

مینار پر چڑھنے کے لیے 324 سیڑھیاں اور ایک لفٹ بھی ہے۔ مینار کی پہلی بالکونی سطح زمین سے تین فٹ اور دوسری بیس فٹ بلند ہے مینار سے کچھ فاصلے پر ایک چبوترہ بھی ہے جو سطح زمین سے بارہ فٹ بلند ہے اس پر قرآن پاک کی یہ آیت کندہ ہے۔ اللہ المشرق والمغرب۔ اس زمانے کے معروف خطاط حافظ محمد یوسف سدیدی، صوفی خورشید عالم، محمد صدیق الماس رقم، ابن پروین رقم اور محمد اقبال نے مینار پاکستان کی سلوں پر کندہ کاری کے کام میں حصہ لیا۔

دوسرے تختے پر ہلال نما تالاب بنے ہوئے ہیں جو کونوں کے قریب چاند کی شکل میں ملتے ہیں۔ اس کے اگلے تختے پر ایک بہت بڑا پانچ کونی ستارہ بھی بنا ہوا ہے۔ اس ستارے کے وسط میں مینار پاکستان کو کنول کی شکل میں اوپر ابھرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ایل ڈی اے نے جون 1982ء میں مینارِ پاکستان کو اپنی تحویل میں لے لیا اور وہاں ایک خوبصورت جھیل اور آبشار تعمیر کی جو دیکھنے والوں کو دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔

مینار پاکستان کے قریب ہی قومی ترانے کے خالق ابوالاثر حفیظ جالندھری مدفون ہیں۔

روزانہ ہزاروں پاکستانی دور و نزدیک سے مینار پاکستان کو دیکھنے آتے ہیں۔ ان کے علاوہ غیر ملکی سیاحوں کی ایک کثیر تعداد بھی ہماری قومی یادگار کو دیکھنے کے لیے آتی ہے۔ پاکستان کا ہر بڑا لیڈر مینارِ پاکستان کے سائے میں جلسہ کرنا باعثِ فخر سمجھتا ہے۔

تحریک پاکستان

کا مقدمہ لڑنے والا کامیاب وکیل!

ایک سچے اور کھرے وکیل کا ماجرا

جس نے اپنا کیس لڑنے کے لیے بھرپور تیاری کی تھی

رضی الدین سید

1947ء میں قائداعظم نے دو مضبوط دشمن قوتوں سے ایک ساتھ جنگ کر کے مسلمانوں کو اس کرۂ ارض پر ایک نہیں بلکہ دو پاکستان عطا کیے مشرقی اور مغربی۔

تحریک پاکستان بہت طویل، کٹھن اور سازشوں سے
تھی جس میں کامیابی حاصل کر لینا ہرگز آسان
لیکن خدائے بزرگ و برتر کا احسان ہے کہ اس
مسلمانانِ ہند کو اس مرحلے پر قائداعظم محمد علی جناح
نام سے ایک خصوصی شخصیت عطا کی۔ قائداعظم کو
پُراعتماد اور بے خوف زبان ملی تھی، مسلمانان
ٹھوس اتحاد بھی دراصل اس کا ایک اہم
تھا۔ یہ وہ ناقابلِ شکست اتحاد تھا
آزادی حاصل کر لینے کے بعد برادر
وطن نے اب ہمیشہ کے لیے فراموش
کر دیا ہے۔

قائداعظم کی خصوصیات ان گنت تھیں
وہ ایک کھرے اور سچے انسان تھے جنھیں
جھوٹ اور منافقت سے کراہت تھی۔
وسیع المطالعہ تھے۔ کسی کو کیا معلوم کہ تحریک
پاکستان کے مقدمے کی خاطر انھوں
اسلامی فقہ، سیرتِ حضرت عمر فاروقؓ اور
دوک پکتھال کے انگریزی ترجمہ قرآن کا باضابطہ

علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ اسلامی نظام کی موجودگی میں ہمیں اب کوئی دوسرا ''ازم'' نہیں چاہیے۔

مطالعہ کیا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر بکنے والے فرد نہ تھے۔ ورنہ تحریکِ پاکستان کے عروج کے دور میں اپنی قوم کو فروخت کر کے قیمت کھری کر لینے میں آخر انھیں کیا رکاوٹ درپیش تھی؟ سرزمینِ وطن کے قائدین تو اب اس ''کاروبار'' کو صبح و شام اپنائے ہوئے ہیں۔ اسلام سے انھیں کوئی شرمندگی یا خفت بھی محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ برملا اس سے محبت کا اظہار کرتے تھے۔ علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ اسلامی نظام کی موجودگی میں ہمیں اب کوئی دوسرا ''ازم'' نہیں چاہیے۔ کسی کو بھی اندازہ نہیں ہے کہ اس دور کے تحریکِ آزادی کے دیگر مسلم رہنماؤں میں قائداعظم ہی وہ واحد ہستی تھے جنھوں نے اسلام کے ساتھ کھل کر اپنی وابستگی کا اظہار کیا تھا۔ عورتوں کے پردے پر بھی انھوں نے کبھی اعتراض نہیں کیا جیسا کہ آج کل فیشن بنالیا گیا ہے۔ بلکہ ایک بار خواتین کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے خود کہا تھا کہ ''تحریکِ پاکستان کی جدوجہد آپ پردے کے اندر رہ کر بھی کر سکتی ہیں۔''

قائداعظم بہت دوراندیش اور صاحبِ بصیرت رہنما تھے۔ کسی بھی معاملے پر رائے دیتے ہوئے وہ اس کے دوررس اثرات کو بھی سامنے رکھتے تھے۔ ان کے دل میں صرف مسلمانانِ ہند ہی نہیں بلکہ عالمِ مغرب کے مسلمانوں کا بھی بہت گہرا درد پایا جاتا تھا۔ ان کا دامن ہر قسم کے اسکینڈلز سے بالکل پاک تھا کیونکہ وہ اس قسم کے مزاج میں ڈھلنے کے لیے تخلیق ہی نہیں کیے گئے تھے۔ مہاتما گاندھی کا نوجوان لڑکیوں کے ساتھ اور جواہر لال نہرو کا لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ اسکینڈل کس کو معلوم نہیں ہے؟ قوم نے بھی اگر اپنی رہنمائی کے لیے ان کا انتخاب کیا تھا تو ان کی انہی بے مثال صفات کو اپنے سامنے رکھا تھا۔

ایک موقع پر جب لارڈ پیتھک لارنس نے زور دے کر کہا تھا کہ ''مسلمانوں کی نمائندگی کی اجارہ داری مسٹر جناح کو نہیں دی جاسکتی'' تو قائداعظم نے پلٹ کر بے باکی سے جواب دیا تھا، آخر کیوں؟ ''میں کوئی تاجر نہیں ہوں اور نہ میں کسی بنیے کی طرح سودے بازی اور حجت و تکرار سے کام لے رہا ہوں۔'' (اسٹینلے والپرٹ)

لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اپنی پہلی ملاقات کے موقع پر قائداعظم نے جب گفتگو کا آغاز یہ کہہ کر کیا کہ ''میں صرف ایک شرط پر گفتگو میں حصہ لوں گا'' تو ماؤنٹ بیٹن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ''مسٹر جناح، میں کوئی شرط سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ سب سے پہلے آپ اپنا مکمل تعارف کرائیں۔'' تاہم جناح نے اپنی ذاتی زندگی کا تعارف کروانے سے انکار کر دیا۔ ''فریڈم ایٹ مِڈنائٹ'' کا مصنف Larry Collins لکھتا ہے کہ ملاقات کے اختتام پر ماؤنٹ بیٹن نے انتہائی بے بسی کے ساتھ اپنے سیکرٹری سے کہا کہ ''اف میرے خدا! جناح تو برف کی طرح سرد تھے۔ میرا زیادہ وقت تو اسی برف کو پگھلانے میں صرف ہو گیا۔''

برطانوی حکومت نے ایک بار قائداعظم کو رام کرنے کے لیے انھیں کسی صوبے کی گورنری کی پیشکش کی اور دوسری بار ان کے لیے ''سر'' کا خطاب تجویز کیا تو قائداعظم نے اپنے روایتی سپاٹ لہجے میں جواب دیا کہ ''مسٹر پرائم منسٹر میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں۔''

مہربانی کر کے گروپوں اور فرقوں میں بٹنے کی بجائے آپ اپنے اندر اسلام اور قوم کی محبت پیدا کریں۔

(India's Fight for Freedom۔ از داور کا داس)

قرار دادِ لاہور 23 مارچ 1940ء کے موقع پر گاندھی نے یہ کہہ کر طوفان اُٹھا دیا کہ ''یہ تو مادرِ ہند کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے برابر ہے۔'' ایک اور متعصب لیڈر راج گوپال اچاریہ نے تبصرہ کیا کہ یہ قرار داد تو ایک روگی ذہن کی پیداوار ہے۔ قائداعظم نے دونوں تبصروں کا جواب یہ کہہ کر دیا کہ ''کہاں ہے وہ ملک جس کے حصے بخرے کیے جائیں گے؟ جن علاقوں پر ہمارا دعویٰ ہے، وہ تو پہلے ہی سے ہمارے علاقے ہیں کیونکہ وہاں ہماری اکثریت ہے۔ جب کہ راج گوپال اچاریہ کی گفتگو سے لگتا ہے کہ ان کی کھوپڑی میں دماغ نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔'' (یعنی انھوں نے قرار داد کو سنجیدگی سے پڑھا ہی نہیں ہے!)

ایک بار قائداعظم نے پنڈت نہرو کی منافقت کا پردہ یہ کہہ کر کھلے عام چاک کیا کہ ''پنڈت نہرو بنارس اور ماسکو کے درمیان بٹے ہوئے ہیں۔ وہ بیک وقت دو کشتیوں میں سواری کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ایک طرف ہندوازم سے بھی واسطہ رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف اشتراکیت سے بھی! دراصل وہ ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں''

''جناح۔ دی کری ایٹر آف پاکستان'' کا انگریز مصنف ہیکٹر بولیتھو لکھتا ہے ''ان کے اعتماد و یقین کی قوت، ان کی خطابت کو ایک نئی طاقت عطا کرتی تھی۔'' مثلاً مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے ایک بار قائداعظم نے کہا تھا ''10 کروڑ مسلمان ہمارے ساتھ ہیں اور جب میں 10 کروڑ کہتا ہوں تو اس سے میری مراد یہ ہوتی ہے کہ ایک فیصد غداروں، مراقیوں، دیوانوں اور مافوق البشروں کو چھوڑ کر 99 فیصد مسلمان ہمارے ساتھ ہیں۔ مہربانی کر کے گروپوں اور فرقوں میں بٹنے کی بجائے آپ اپنے اندر اسلام اور قوم کی محبت پیدا کریں۔''

برطانوی حکومت سے مخاطب ہو کر انھوں نے کھری کھری سنائی تھی اور کہا تھا ''میں انھیں اس پلیٹ فارم سے متنبہ کرتا ہوں کہ ہماری مایوسی اور تلخی کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ آپ مسلم ہند کے ساتھ جو نازیبا برتاؤ رکھ رہے ہیں، وہ خود آپ کے لیے بھی خطرہ ہے۔ میں اب اس سے زیادہ سخت زبان استعمال نہیں کرنا چاہتا۔'' ایک اور موقعہ پر بانی پاکستان نے انگریزوں اور ہندوؤں دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ ''سوال یہ نہیں ہے کہ یہ ہمیں پاکستان دیں گے یا نہیں؟ ہم اسے لیں گے'' اور یہ کہہ کر انھوں نے ''لیں گے'' کے الفاظ کو بہت دیر تک کھینچے رکھا تاکہ ان کے موقف کی سختی دونوں پر نمایاں ہو سکے۔

مسلمانوں کو جوش و جذبے سے بھرا ہوا دیکھ کر ایک بار انھوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''سات سال قبل مسلم انڈیا کی حالت مردے کی سی تھی۔ مگر آج اسی مردے کی حالت دیکھیے کہ وہ اپنے پورے ہوش و حواس میں ہے بلکہ چل پھر بھی سکتا ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مسلم ہندوستان اب بیدار ہو چکا ہے۔'' (سید شریف الدین پیرزادہ۔ کتاب فاؤنڈیشنز آف پاکستان)

گاندھی نے جب آزادی ہند کا مطالبہ کیا تو نعرہ لگایا کہ Quit India (بھارت سے نکل جاؤ)۔ جواب میں قائداعظم نے بھی برجستہ کہا کہ Divide

''ایک قوم کا ہیرو اکثر دوسری قوم کا وِلن قرار پاتا ہے۔''

N Quit India (بھارت کو تقسیم کرو اور پھر بھارت سے نکل جاؤ۔) اسی طرح ایک موقعہ پر پنڈت جواہر لال نہرو نے بلند بانگ دعویٰ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہی موجود ہیں۔ ایک کانگریس اور دوسری حکومت برطانیہ۔ بقیہ سب یا تو اس کیمپ میں آجائیں یا اُس کیمپ میں چلے جائیں اُن کے لیے علیحدہ وجود کا کوئی جواز نہیں ہے۔'' پنڈت نہرو کا یہ ایک متکبرانہ اعلان تھا جس کے جواب میں محمد علی جناح نے کلکتہ سے برملا اس کا جواب دیا۔ ''میں نے پنڈت نہرو سے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان میں ایک تیسری طاقت بھی موجود ہے اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طاقت ہے۔ ہم کسی کے بھی اشارۂ چشم و ابرو پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور نہ ہم کسی پارٹی کے خیمہ بردار بن سکتے ہیں۔'' اس کے چند دن بعد انھوں نے ایک جلسہ عام میں نہرو سے زور دے کر کہا ''براہِ کرم۔ وہ مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ان سے تعرض نہ کریں۔''

تقسیم ہند کے خلاف کانگریس کے دلائل کو رد کرنے کے لیے قائداعظم نے کہا کہ ''ہندوستان فی الحقیقت ایک ملک نہیں بلکہ ایک برصغیر ہے۔'' کتاب گائم اینڈ ٹائیڈ۔ از سر آرتھر۔ (یعنی جس طرح کسی برصغیر میں بہت ساری قومیں بستی ہیں، اسی طرح بھارت میں بھی کئی قومیں آباد ہیں)۔ دوسری جانب مارچ 1939ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کے سامنے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا ''مسلمان ایک اقلیت نہیں ایک قوم ہیں۔''

منٹو پارک لاہور میں قراردادِ پاکستان کے موقع پر مارچ 1940ء میں قائداعظم نے قرارداد پیش ہونے سے پہلے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''ایک قوم کا ہیرو اکثر دوسری قوم کا وِلن قرار پاتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کی دو (متضاد) قوموں کے کندھوں پر ایک ہی واحد مملکت کا بوجھ ڈال دینا، اس طرح کہ ان میں ایک دائمی عددی اقلیت ہو اور دوسری دائمی عددی اکثریت، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قسم کی حکومت کا شیرازہ (بالآخر) بکھر جائے گا۔''

آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک تاریخی اجلاس آرٹلری میدان کراچی میں 24 تا 26 دسمبر 1943ء کو منعقد ہوا۔

نواب صاحب کا انتقال بھی ہو گیا

(افسوس کہ پاکستان کی کسی بھی حکومت کو آرٹلری میدان کی تاریخی حیثیت کو سنبھالنے اور سنوارنے کی توفیق نہیں ہوئی)۔ اس اجلاس میں نواب بہادر یار جنگ نے جوشیلی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''ہمارے پنڈال سے ایسے لوگ اٹھ جائیں جو اپنے اقتصادی نظام کو انکارِ خدا (سوشلزم) پر استوار کرنا چاہتے ہیں۔'' پھر انھوں نے کہا ''ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ وہاں قرآن کا نظام حیات قائم ہو۔ یہ ایک انقلاب ہوگا۔ ایک نشأۃ الثانیہ ہوگی۔ ایک حیاتِ نو ہوگی جس میں خوابیدہ اسلامی تصورات ایک بار پھر جاگ اٹھیں گے۔'' انھوں نے قائداعظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''قائداعظم! ہم نے پاکستان کو اسی طرح سمجھا ہے۔ اگر آپ کا پاکستان ایسا نہیں ہے تو ہمیں بھی یہ منظور نہیں ہے۔''

صدارتی تقریر میں محمد علی جناح نے جواباً کہا ''ہم

نے ایک قوم کی حیثیت سے حکومت اور نوکر شاہی کی جانب سے کی گئی ابتدائی مخالفت کا کامیابی سے مقابلہ کیا ہے۔ بعد میں کانگریس نے ہم پر حملہ کیا تو ہم نے اسے بھی پسپا کردیا۔ اب مسلمانانِ ہند کسی مزاحمت، نعرے، یا ڈھونگ سے متاثر نہیں ہوں گے۔ ہمارے ساتھ لاکھوں مسلمان ہیں، ہمارا اپنا پرچم ہے۔ ہمارا اپنا پلیٹ فارم اور ایک واضح نصب العین ہے۔ حصولِ پاکستان کے لیے ہمارے پاس فوج، سمندری بیڑے یا ہوائی جہازوں کی کھیپ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے، وہ اتحاد اور اپنے نصب العین پر پختہ یقین ہے۔'' چنانچہ اسی کے بعد نواب بہادر یار جنگ نے بھرے جلسے میں کہا تھا کہ'' خدا کرے کہ میری زندگی بھی قائداعظم کو لگ جائے۔'' تھوڑے ہی عرصے کے بعد 9 ستمبر تا 27 ستمبر 1944ء کے درمیان تقسیم ہند کے سوال پر گاندھی اور قائداعظم کے درمیان ایک براہِ راست ملاقات مالابار ہل پر ہوئی۔ کئی بے مقصد نشستوں کے بعد قائداعظم نے تنگ آکر گاندھی سے کہا'' آپ نے قرار دادِ لاہور کے بنیادی اصولوں کو پہلے ہی ٹھکرادیا ہے۔ آپ یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک قوم ہیں۔ آپ یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ پاکستان دو منطقوں پر مشتمل ہے۔ تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کی تقسیم، ہندوستان اور پاکستان کی حیثیت سے محض آپ کی زبان پر ہے اور یہ آپ کے دل سے نہیں نکل رہی ہے۔'' اس کے بعد ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ'' گاندھی جی کا بار بار کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے قرار دادِ لاہور کی روح کو پورا کردیا ہے، محض زمانہ سازی، فریب آمیزی اور پُر پیچ بات ہے۔ اگر ہم ان شرائط کو قبول کرلیں تو اس کا مطلب پاکستان کو دفن کردینے کے برابر ہے۔ میں نے تین ہفتے تک گاندھی جی کو قائل کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ مگر ان کا مرض اتنا پیچیدہ اور اتنا پرانا ہے کہ وہ کسی بھی معالج کے بس سے باہر ہے۔''

اوپر ہم نے تحریکِ پاکستان میں قوم کے بلند آہنگ اور ناقابلِ شکست وکیل قائداعظم کے کردار کی محض چند جھلکیاں پیش کی ہیں۔ ورنہ ان کی پوری تحریکی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے مزید حیرت انگیز کارنامے ہمارے سامنے آئیں گے۔ (تفصیلی مطالعے کے لیے ان کی زندگی پر لکھی گئی کوئی سی مستند کتاب، خصوصاً صدارتی ایوارڈ یافتہ کتاب ''میر کارواں، محمد علی جناح'' از قاضی عبدالحنان مرحوم کراچی، کا مطالعہ کریں)۔

برصغیر ہندو پاک کے اُس نازک موڑ پر اگر مسلم قوم کو قائداعظم محمد علی جناح جیسا چٹانی صفات کا حامل رہنما میسر نہ آتا تو اس قوم کو آج محض وہ آزادی حاصل ہوتی جو آزادی ہندوستان میں بھارتی ہندوؤں کی ماتحتی میں اس کے لیے مقدر ہے۔ اس عظیم قائد کے مقابلے میں ہماری آج کی بونی اور نفس پرست سیاسی شخصیات ہیں جن کے اندر ہر دشمنِ وطن سے مصالحت کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہے اور جو تقسیم ہند کو محض ایک مجنونانہ کوشش گردانتی ہیں۔ آج کی مسلم لیگ کی ہر وہ قسم (A,B,C,D) جو خود کو قائداعظم کی وارث سمجھتی ہے، وہ مفاد پرستوں اور اپنا اقتدار دائمی رکھنے والوں کے ایک غیر منظم ہجوم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ چہ نسبت لیگ را با محمد علی جناح؟

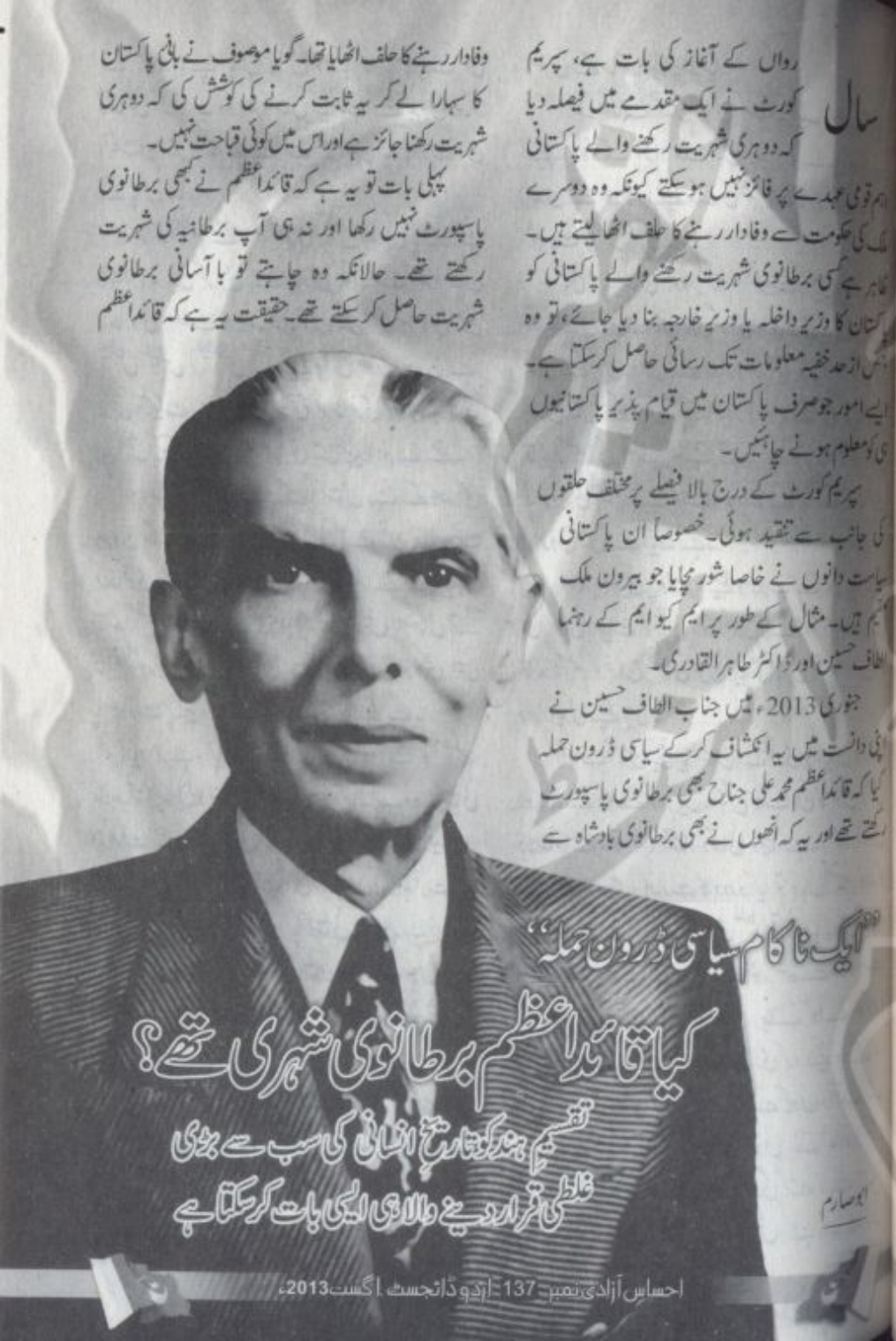

''ایک ناکام سیاسی ڈرون حملہ''

کیا قائداعظم برطانوی شہری تھے؟

تقسیم ہند کو تاریخ انسانی کی سب سے بڑی غلطی قرار دینے والا ہی ایسی بات کرسکتا ہے

ابوصارم

سال رواں کے آغاز کی بات ہے، سپریم کورٹ نے ایک مقدمے میں فیصلہ دیا کہ دوہری شہریت رکھنے والے پاکستانی اہم قومی عہدے پر فائز نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ دوسرے ملک کی حکومت سے وفادار رہنے کا حلف اٹھالیتے ہیں۔ ظاہر ہے کسی برطانوی شہریت رکھنے والے پاکستانی کو پاکستان کا وزیر داخلہ یا وزیر خارجہ بنا دیا جائے، تو وہ بہت ازحد خفیہ معلومات تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ ایسے امور جو صرف پاکستان میں قیام پذیر پاکستانیوں ہی کو معلوم ہونے چاہئیں۔

سپریم کورٹ کے درج بالا فیصلے پر مختلف حلقوں کی جانب سے تنقید ہوئی۔ خصوصاً ان پاکستانی سیاست دانوں نے خاصا شور مچایا جو بیرون ملک مقیم ہیں۔ مثال کے طور پر ایم کیو ایم کے رہنما الطاف حسین اور ڈاکٹر طاہر القادری۔

جنوری 2013ء میں جناب الطاف حسین نے اپنی دانست میں یہ انکشاف کرکے سیاسی ڈرون حملہ کیا کہ قائداعظم محمد علی جناح بھی برطانوی پاسپورٹ رکھتے تھے اور یہ کہ انھوں نے بھی برطانوی بادشاہ سے وفادار رہنے کا حلف اٹھایا تھا۔ گویا موصوف نے بانیٔ پاکستان کا سہارا لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دوہری شہریت رکھنا جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ قائداعظم نے کبھی برطانوی پاسپورٹ نہیں رکھا اور نہ ہی آپ برطانیہ کی شہریت رکھتے تھے۔ حالانکہ وہ چاہتے تو باآسانی برطانوی شہریت حاصل کرسکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم

نے ہمیشہ اپنے پاس برٹش انڈیا کا پاسپورٹ ہی رکھا حتیٰ کہ جب وہ ہندوستانی سیاست سے بددل ہو کر انگلستان میں مقیم ہوئے تب بھی یہی پاسپورٹ ان کے پاس رہا۔

قائداعظم کے نام آخری برٹش انڈین پاسپورٹ 1946ء میں کراچی سے جاری ہوا۔ تب ہندوستان برطانوی سلطنت کا حصہ تھا۔ اس میں صفحہ نمبر 1 بی میں نیشنل سٹیٹس / نیشنلٹی کے نیچے واضح طور پر درج ہے: برٹش سبجیکٹ بائی برتھ۔ یعنی برطانوی شہری بذریعہ پیدائش کیونکہ قائداعظم کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی بیرون ملک جانے والے پاکستانی اگلے تین سال تک برطانوی ہند کا پاسپورٹ ہی استعمال کرتے رہے۔ خود قائداعظم کا پاسپورٹ 1951ء تک قابل استعمال تھا۔ تاہم گورنر جنرل پاکستان بننے کے بعد وہ کبھی اس پاسپورٹ پر بیرون ملک تشریف نہیں لے گئے۔

یاد رہے، پاکستان کا پہلا پاسپورٹ نو مسلم، علامہ محمد اسد (لیوپولڈ) کو جاری کیا گیا۔ تب وہ پاکستانی وزارت خارجہ میں ڈپٹی سیکرٹری کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی ہدایت پر علامہ محمد اسد کو 1951ء میں پاکستانی پاسپورٹ دیا گیا تاکہ وہ مشرق وسطیٰ جا کر پاکستان کا اثر و رسوخ بڑھا سکیں۔ اس پاسپورٹ میں ''پاکستان کے شہری'' واضح طور پر درج تھا۔

تیسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ قائداعظم کو برطانیہ کی شہریت لینے کے بارہا مواقع ملے، لیکن انھوں نے اس ملک کو کبھی اپنا وطن نہیں بنایا۔ حالانکہ وہ ایک غلام مملکت میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر انھوں نے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ رہنا پسند کیا۔

جبکہ الطاف حسین کا اپنا معاملہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ وہ ایک آزاد ملک میں پیدا ہوئے۔ وہ لندن گئے اور پھر اپنے ملک کی شہریت چھوڑ کر برطانوی شہریت حاصل کر لی۔

بانی پاکستان وہ عظیم شخصیت ہیں جن کی تعریف و توصیف میں نامی گرامی برطانوی مدبروں کے قول ملتے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا پذیرائی ہوگی کہ لندن میں لنکنز ان کے صدر دروازے کی دیوار پر قائداعظم کی تصویر نصب ہے۔ یاد رہے، لنکنز ان قانون کی تعلیم دینے والے چار بڑے بڑے برطانوی اداروں میں سے ایک ہے۔

ممتاز امریکی پروفیسر، سٹینلے والپرٹ نے بانی پاکستان کی سوانح حیات تحریر کی، تو انھوں نے منفرد انداز میں قائداعظم کو خراج تحسین پیش کیا: ''کم ہی افراد تاریخ کا دھارا بدل چکے ہیں۔''

الطاف حسین بانی پاکستان کے فکری و سیاسی وارث ہونے کے دعوے دار ہیں۔ لیکن جب ان کا قول و فعل دیکھا جائے، تو کھلا تضاد دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً انھوں نے 2011ء میں بھارت کا دورہ کیا تو وہاں تقسیم ہند کو تاریخ انسانی کی سب سے بڑی غلطی قرار دیا۔ یہی نہیں انھوں نے بھارت کے وزیر خارجہ نٹور سنگھ سے درخواست کی کہ ہندوستان سے پاکستان جانے والے لوگوں (مہاجرین) کو بھارتی پاسپورٹ جاری کر دیئے جائیں۔

الطاف حسین اس تلخ سچائی سے کیوں واقف نہیں کہ بھارت میں مٹھی بھر مسلمانوں کے علاوہ تمام مسلمان بے بسی اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہندو اکثریت کی تو بھرپور کوشش ہے کہ بھارتی

قائداعظم کے نام آخری پاسپورٹ بھی برٹش انڈین پاسپورٹ تھا۔ جو 1946ء میں کراچی سے جاری ہوا تب ہندوستان برطانیہ کا حصہ تھا۔

مسلمان اپنی مذہبی رسوم ترک کر کے ہندوانہ تہذیب و ثقافت میں جذب ہو جائیں۔ اسی طرح مسلمانوں کو اعلیٰ نوکریاں نہیں ملتیں اور تعلیم یافتہ مسلمان بھی معمولی ملازمتیں کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کی نسبت ہجرت کر کے پاکستان آنے والے مہاجرین کہیں زیادہ خوشحال اور خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بلکہ پاکستانی معاشرے میں کئی ہندو منفرد رتبہ رکھتے ہیں۔

محمد افضل حکمران جماعت نیشنل کانگریس کے ترجمان اور اقلیتی سیل کے سربراہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ''پاکستانی مہاجرین کی نئی نسل بھارت نہیں جانا چاہتی۔ اسی طرح بھارت میں موجود ان کے قریبی یا دور پار کے رشتے دار بھی یہ نہیں چاہتے کہ وہ آئیں۔ اگلے چند برسوں میں جب پاکستانی مہاجرین کی پہلی و دوسری نسلیں دنیا میں نہیں ہوں گی، تو ماضی کی یادیں بھی نہیں رہیں گی۔''

یقیناً الطاف حسین اور ان کے نائبین تاریخ سے نابلد ہیں۔ ورنہ وہ قائداعظم محمد علی جناح کو برطانوی شہری کہنے کی جرأت نہ کرتے۔ مزید برآں کچھ عرصہ قبل الطاف حسین نے یہ نئی درفطنی چھوڑی کہ ''اسٹیبلشمنٹ'' کو اگر کراچی میں ایم کیو ایم کی حکومت قبول نہیں تو اُسے پاکستان سے الگ کر دیا جائے۔ یہ اعلان بھی تاریخ سے ان کی ناواقفیت کی دلیل ہے اور اس بات کا عکاس کہ انھیں پاکستان سے کسی قسم کی جذباتی محبت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان میں مہاجرین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں مثلاً یوپی، سی پی، راجستھان، مہاراشٹر، کیرالہ وغیرہ میں مقیم مسلمانوں کو اچھی طرح علم تھا کہ ان کے علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے۔ اس کے باوجود الیکشن 1946ء میں انھوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دے کر قیام پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔

بعدازاں جب پاکستان تخلیق ہوا، تو مذکورہ علاقوں کے مسلمان ہی آگ اور خون کے دریا پار کر کے اس خداداد مملکت میں پہنچے۔ یوں انھوں نے پاکستان قائم کرنے کی خاطر عظیم قربانیاں دیں۔ لیکن اب الطاف حسین اپنے ذاتی مفادات کی خاطر اسی مملکت کو توڑنا چاہتے ہیں جسے مہاجرین نے ناقابل فراموش قربانیاں دے کر تخلیق کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان بھر میں پھیلے مہاجرین کی پہلی، دوسری اور تیسری نسلیں بھی یہی چاہتی ہیں؟ اور کیا مہاجرین صرف کراچی میں ہی آباد ہیں۔ پنجاب میں کروڑوں کی تعداد میں مہاجرین آباد ہیں۔ اگر الطاف حسین صرف اردو بولنے والوں کو مہاجر سمجھتے ہیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ پنجاب اور پاکستان کے دوسرے صوبوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اب لسانی عصبیت پھیلانے سے کسی کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ایسے نعروں اور لوگوں کا کا سحر ٹوٹ چکا ہے اور منطقی انجام سامنے نظر آ رہا ہے۔ انھیں جان لینا چاہیے کہ:

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

(وہ ساغر ٹوٹ گیا اور وہ ساقی بھی نہ رہا)

بلکہ اب تو ساقی کا اپنا ستارہ بھی گردش میں ہے۔

انسان اور آزادی

نوید اسلام صدیقی

آج دنیا بھر میں ہر زبان پر ایک ہی نعرہ ہے آزادی، آزادی، آزادی۔ ہر انسان مانگ رہا ہے آزادی۔ لیکن کسی بھی انسان کے ذہن میں آزادی کا واضح تصور موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے انسان نے آزادی کے نام پر بہت دھوکے کھائے ہیں۔ آج دنیا کی غریب اقوام کو اُلّو بنانے کے لیے، ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے سامراجی طاقتیں ہزاروں میل سے آکر ان پر حملہ آور ہو جاتی ہیں، ان کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ ہم مظلوموں کو آمریت اور جہالت سے آزادی دلانے آئے ہیں۔ آزادی سے کیا مراد ہے، انسان کو دنیا میں کس قدر آزادی دی گئی ہے، اس مضمون میں مختصراً چند اہم نکات کتاب اللہ کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

☆ انسان کو اللہ نے خلیفہ کا منصب دیا، انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی۔ اللہ تعالیٰ نے جو ساری کائنات کا خالق، مالک اور فرمانروا ہے، اپنی بے پایاں مملکت کے اس حصے میں، جسے زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا، اُسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں۔ بھلائی اور برائی کی تمیز دی۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی۔ تصرف کے اختیارات بخشے۔ اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری (Autonomy) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔ خلیفہ کے منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوند عالم نے اچھی طرح اس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمہارا اور تمام جہان کا مالک، معبود اور حاکم میں ہوں۔ میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو نہ کسی دوسرے کے بندے ہو، اور نہ

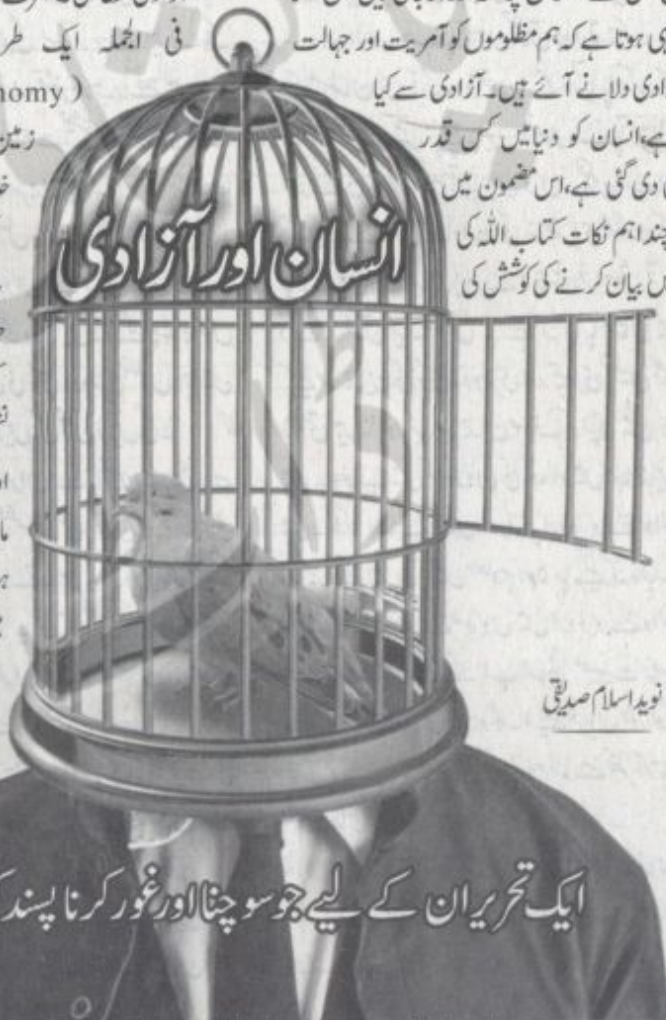

ایک تحریر ان کے لیے جو سوچنا اور غور کرنا پسند کرتے ہیں

میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمہیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے دراصل تمہارے لیے ایک امتحان کی مدت ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس واپس آنا ہوگا اور میں تمہارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمہارے لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبود اور حاکم تسلیم کرو۔ جو ہدایت میں بھیجوں اس کے مطابق دنیا میں کام کرو اور دنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمہارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمہارے لیے ہر وہ رویہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رویہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمہیں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہوگا اور جب میرے پاس لوٹ کر آؤ گے تو میں تمہیں ابدی راحت و مسرت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنت ہے۔ اور اگر دوسرے کسی راستہ پر چلو گے (جس پر چلنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے) تو دنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزا چکھنا ہوگا اور دنیا سے گزر کر عالم آخرت میں جب آؤ گے تو ابدی رنج و مصیبت کے اُس گڑھے میں پھینک دیے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔

☆ شرک کر کے انسان اپنی آزادی ختم کر لیتا ہے

انسان کو اللہ نے آزاد پیدا کیا ہے وہ اس کو کسی دوسرے کا غلام نہیں دیکھنا چاہتا۔ لیکن انسان ایسا نادان ہے کہ اللہ کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی شریک بنا لیتا ہے، اور اپنے آپ کو بلاوجہ کئی مصیبتوں میں گرفتار کر لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدائی پوری کی پوری بلا شرکتِ غیرے اس غیر فانی ذات کی ہے، جو کسی کی بخشی ہوئی زندگی سے نہیں، بلکہ آپ اپنی ہی حیات سے زندہ ہے اور جس کے بل بوتے ہی پر کائنات کا یہ سارا نظام قائم ہے۔ اپنی سلطنت میں خداوندی کے جملہ اختیارات کا مالک وہ خود ہی ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کی صفات میں اُس کا شریک ہے، نہ اس کے اختیارات میں اور نہ اس کے حقوق میں۔ یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اُسی کو مقتدر اعلیٰ مانیں، اُسی سے امیدیں وابستہ کریں اور اسی سے ظاہر و باطن میں ڈریں۔ اسی طرح مالک الملک ہونے کی حیثیت سے یہ منصب بھی اللہ ہی کا ہے کہ اپنی رعیت کے حلال و حرام کے حدود مقرر کرے، ان کے فرائض و حقوق معیّن کرے، ان کو امر و نہی کے احکام دے، اور انہیں یہ بتائے کہ اس کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے وسائل کو وہ کس طرح کن کاموں میں کن مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ اور یہ صرف اللہ کا حق ہے کہ بندے اس کی حاکمیت تسلیم کریں، اس کے حکم کو منبعِ قانون مانیں، اسی کو امر و نہی کا مختار سمجھیں، اپنی زندگی کے معاملات میں اس کے فرمان کو فیصلہ کن قرار دیں، اور ہدایت و رہنمائی کے لیے اسی کی طرف رجوع کریں۔

☆ آزادی کا غلط مطلب

آزادی کا غلط مطلب لینا یہ بھی ہے کہ انسان کسی چیز سے وہ کام لے جس کے لیے خدا نے اُسے پیدا نہیں کیا ہے، اور کسی چیز سے وہ کام نہ لے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ تمام افعال جو انسان اپنی اور اشیا کی فطرت کے خلاف کرتا ہے، اور وہ تمام صورتیں جو وہ منشائے فطرت سے گریز کے لیے اختیار کرتا ہے، اس میں شامل

ہیں۔ (سورہ النساء آیت 119)

یہ سب افعال آزادی کا غلط استعمال ہیں، مثلاً عمل قومِ لوطؑ، ضبطِ ولادت، رہبانیت، مردوں اور عورتوں کو بانجھ بنانا، مردوں کو خواجہ سرا بنانا، عورتوں کو ان خدمات سے منحرف کرنا جو فطرت نے ان کے سپرد کی ہیں اور انہیں تمدن کے اُن شعبوں میں گھسیٹ لانا جن کے لیے مرد پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے بے شمار افعال جو آزادی کا غلط مطلب سمجھنے والے دنیا میں کر رہے ہیں، دراصل یہ لوگ خالقِ کائنات کی بتائی ہوئی پابندیوں کو تسلیم نہیں کرتے اور ایک ایسی آزادی کے طالب ہیں جو خدا نے ان کو نہیں دی ہے۔

☆ **انسان کی آزادی کا پہلا دشمن: شیطان**

شیطان، انسان کے سامنے نت نئی جھوٹی ترغیبات کا سدا بہار سبز باغ پیش کرتا ہے، انسان اس کے جھانسے میں آکر اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکامات بھول جاتا ہے اور اپنے نفس کی باگیں شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور جدھر جدھر وہ چلاتا ہے اُدھر چلتا ہے، گویا کہ یہ اس کا بندہ ہے اور وہ اس کا خدا۔ یاد رہے شیطان نے اللہ سے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں سے ایک مقررہ حصّہ لے کر رہوں گا، میں انہیں بہکاؤں گا، میں انہیں آرزوؤں میں الجھاؤں گا۔ (سورہ النساء آیت 119)

قرآن مجید کے پہلے پارے میں انسان کی آزادی کے بارے میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ سورہ البقرہ (آیت 30) میں بتایا گیا ہے: پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ ''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔'' انہوں نے عرض کیا: ''کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔'' فرمایا: ''میں جانتا ہوں، جو کچھ تم نہیں جانتے''۔

فرشتوں کو یہ حقیقت معلوم نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی مخلوق وجود میں لانا چاہتا ہے جس کو فیصلہ کرنے کی آزادی دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ صحیح راستے کی نشاندہی کرنے کے بعد انسان کو اختیار دے دے گا کہ وہ خود فیصلہ کرے وہ خدا کا حکم ماننا چاہتا ہے یا اُس کے خلاف چلنا چاہتا ہے۔

سورہ البقرہ (آیت 35) میں فرمایا جا رہا ہے: پھر ہم نے آدم سے کہا کہ ''تم اور تمہاری بیوی، دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ، مگر اس درخت کا رُخ نہ کرنا، ورنہ ظالموں میں شمار ہوگے۔'' آخرکار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انہیں اُس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔

☆ **انسان کی آزادی کا دوسرا دشمن: نفسِ انسانی**

نفسِ انسانی کو طاغوت کہا گیا ہے، جو اسے جذبات و خواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے سیدھے راستوں میں کھینچے کھینچے لیے پھرتا ہے۔

قرآن پاک میں حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس قصہ کو بیان کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان کو معلوم ہو کہ اُس کو آزادی تو دی گئی ہے لیکن جب وہ حضرت آدمؑ کی طرح شیطان کے بہکاوے میں آکر یا قابیل کی طرح نفس کے جال میں پھنس کر آزادی کا مطلب شتر بے مہار آزادی سمجھ لیتا ہے تو اس کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔

سورہ المائدہ (آیات 27-32) میں یہ قصہ بیان

قصہ بھی بے کم و کاست سنا دو۔ جب اُن دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی۔ اُس نے کہا ''میں تجھے مار ڈالوں گا۔'' اس نے جواب دیا ''اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا، میں اللہ ربّ العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے۔'' آخرکار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر اُن لوگوں میں شامل ہوگیا جو نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اُسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا افسوس مجھ پر! میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہوسکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا۔ اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔

☆ **انسان کی آزادی کا تیسرا دشمن: انسانی معاشرہ**

انسان کے بیوی اور بچے، اعزہ و اقربا، برادری اور خاندان دوست اور آشنا، سوسائٹی اور قوم، پیشوا اور رہنما، حکومت اور حکام، یہ سب انسان کو آزادی کی حدود توڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں، ان میں سے ہر ایک اس سے اپنی اغراض کی بندگی کراتا ہے اور بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اسی چکر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضی مول لے۔

قرآن میں اولاد کو فتنہ یعنی آزمائش اسی معنوں میں کہا گیا ہے کہ انسان اولاد کی خوشنودی کی خاطر اپنی آزادی کی حدود کو بھول جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔

☆ ایک فرد واحد کی طرح قومیں آزادی کا غلط مطلب لے لیتی ہیں اور تباہ ہوجاتی ہیں۔

قرآن میں بہت سی قوموں کی مثالیں دی گئی ہیں، جنھوں نے خدا کی دی ہوئی آزادی کا غلط فائدہ اٹھایا، شیطان اور اپنے نفس کی پیروی کی اور دونوں جہانوں میں برباد اور خوار ہوئے۔

سب سے زیادہ ذکر قرآن پاک میں بنی اسرائیل کا آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دے کر آزادی بخشی تاکہ یہ اپنی عاقبت سنوار سکیں، لیکن اس بدبخت قوم نے ہر وہ کام کیا جس سے انھیں منع کیا گیا تھا۔ نبی اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو مذاق میں اُڑا دیا۔

بنی اسرائیل جب مصر سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے فلسطین کی سرزمین کو ان کے لیے نامزد فرمایا، یہ وہ مقدس سرزمین تھی جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا مسکن رہ چکی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے اُن سے صحرائے سینا کے قیام کے دوران کہا کہ اے برادرانِ قوم! فلسطین کی مقدس سرزمین میں داخل ہوجاؤ، جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے، پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے۔ انہوں نے آگے سے حجت بازی شروع کر دی اور اللہ کی دی ہوئی آزادی کی آڑ میں کہا ''اے موسیٰ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہاں زبردست لوگ موجود ہیں، بس تم اور تمہارا رب، دونوں جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

☆ آزادی کا غلط مطلب سمجھ کر آدمی (یا قوم) بھٹک جائے تو معافی کا دروازہ کھلا ہے۔

سب سے پہلی مثال قرآن پاک میں حضرت آدمؑ کی بیان کی گئی ہے کہ جب ان کو احساس ہوا کہ انہوں نے غلطی کی ہے، اُن کو اپنے آپ جس معاملے میں

فیصلہ کرنے کی آزادی نہ تھی وہ غلط فیصلہ انہوں نے کر کے خدا کی ناراضی مول لی ہے، انھیں خیال آیا کہ ان کو اپنے رب سے معافی مانگنا چاہیے، لیکن ان کو الفاظ نہ ملتے تھے جن کے ساتھ وہ خطا بخشی کے لیے دعا کر سکتے۔ اللہ نے ان کے حال پر رحم فرما کر وہ الفاظ خود انہیں بتائے۔ توبہ کے معنی ہی رجوع کرنے اور پلٹنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان اللہ کی اطاعت کے دائرے سے باہر نکل گیا تھا، وہ اس دائرے میں واپس آ گیا۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ آزادی کی حدود سے باہر نکل گیا تھا، وہ واپس اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی آزادی کی حدود کے اندر آ گیا۔ اُس نے تسلیم کر لیا ہے کہ انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں ہے، بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دو گونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامور ہے کہ اس راستے کی پیروی کرے جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے۔

یہ تو تھی افراد کی مثال، قوموں کی ایک واحد مثال یونسؑ کی قوم کی ہے، جس کے عذاب کا فیصلہ ہو چکا تھا لیکن قوم نے عذاب کے آثار دیکھے تو حضرت یونس کو تلاش کیا لیکن وہ نہ ملے، اس پر وہ سب اپنے بال بچوں اور جانوروں کو لے کر صحرا میں نکل آئے، نزول عذاب اُن سے قریب تھا، جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور زاری کی اور معافی مانگی، ایمان و توبہ کا اظہار کیا..... پس اللہ نے ان پر رحم کیا اور ان کی دعا قبول کی۔

حضرت یونسؑ کو بھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ نبی ہونے کے باوجود اپنے فیصلے کرنے میں آزاد نہیں ہیں۔ اُن کو خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم آنے کے بعد ہی اپنی بستی کو چھوڑنا چاہیے تھا۔

اسی طرح جاپانی قوم نے امریکہ کی فرمانبرداری کی اب یہ صورت احوال ہے کہ بوڑھے معاشرہ میں بڑھتے جا رہے ہیں، گھریلو زندگی تباہ ہو چکی ہے، نوجوان لڑکے لڑکیاں گھروں کو چھوڑ کر شتر بے مہار کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ ماضی میں جاپان میں کسی غیر ملکی کے لیے ملازمت کا ویزہ حاصل کرنا بہت مشکل تھا، لیکن حالات نے جاپانی حکومت کو اتنا مجبور کر دیا ہے کہ وہ انہیں مجبوراً غیر ملکیوں کو ویزے جاری کرنے پڑ رہے ہیں۔ ایک اور دلچسپ مثال چین کی ہے، انھوں نے سوچا ہمیں مکمل آزادی ہے ہم خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہم نے کتنے بچے پیدا کرنے ہیں۔ حکومت نے اعلان کر دیا کہ ہر فیملی ایک بچہ پیدا کر سکتی ہے، چاہے لڑکا ہو یا لڑکی۔ اس احمقانہ فیصلے کے نتائج آہستہ آہستہ اثرات دکھانے لگے ہیں۔ سب سے خطرناک چیز سامنے آئی ہے کہ فیملی لائف کا Concept تیزی سے ختم ہو رہا ہے اور نئی نسل نے سوچا کہ کون ایک بچے کو بھی سنبھالتا پھرے، نہ کرو شادی اور نہ درد سر مول لو۔

☆ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ جاننے کی کوشش کرے کہ اللہ کی دی ہوئی آزادی کا مطلب کیا ہے۔

جن لوگوں کو اس بات کی کوئی فکر نہیں ہے کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اس چار روزہ زندگی میں وہ کس قدر آزاد ہیں، وہ اپنے کون کون سے فیصلے اپنی مرضی سے کر سکتے ہیں، ہر کام کرنے میں کن حدود و قیود کا خیال رکھنا ہے، جو اس کے طالب نہیں ہیں، اور جنھوں نے اپنے دلوں پر تعصب اور ہٹ دھرمی کے قفل لگائے ہوئے ہیں، وہ دنیا کے عشق میں مدہوش اور عاقبت سے بے فکر ہو چکے ہیں انھیں ایمان کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔

(مضمون ہذا تحریر کرنے کے لیے مختلف تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے، خصوصاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفہیم القرآن سے)

پاکستان کی ابتدائی صنعتی و معاشی سرگرمیاں

انتخاب: شمع شریف

العباس پاکستان کی صنعت اور اس کی تیز رفتار ترقی کی ایک عظیم علامت سمجھا جاتا ہے اس لیے ایشیائی ممالک میں جاپان کے علاوہ پاکستان ہی کو اتنے بڑے جہاز تعمیر کرنے کا فخر حاصل ہے۔

پاکستان نے پہلا مسافر بردار جہاز 2 کروڑ روپے میں جاپان سے خریدا

پہلا پنج سالہ منصوبہ

برصغیر کی تقسیم کے فوراً بعد شدید مالی دشواریوں کے باوجود حکومت پاکستان نے ترقیاتی کاموں کے لیے 1948ء میں ایک ترقیاتی بورڈ قائم کیا جو ترقیاتی منصوبے مرتب کرنے، اس امر کی سفارش کرنے کہ کس منصوبے پر پہلے کام شروع کیا جائے اور کس پر بعد میں، کا فیصلہ کرتا۔ بورڈ کو ترقیاتی منصوبوں پر کام کی رفتار کا جائزہ لینے اور کام کے متعلق کابینہ کے سامنے رپورٹ پیش کرنے کا مجاز کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی حکومت نے منصوبہ بندی کا ایک مشاورتی بورڈ بھی قائم کیا جس میں سرکاری حکام کے علاوہ نجی شعبے کے نمائندے بھی شامل کیے گئے۔ اس بورڈ کے فرائض میں منصوبہ بندی اور ترقیاتی کاموں کے متعلق حکومت کو مشورہ دینا، منصوبوں پر عمل درآمد کی رفتار کا جائزہ لینا، منصوبوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنا، ان کے فوائد سے آگاہ کرنا اور ان کا تعاون حاصل کرنا شامل تھا۔ منصوبہ بندی کے مشاورتی بورڈ کے لیے مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے کئی صنعتی بورڈ اور کمیٹیاں بنائیں۔ کولمبو کانفرنس میں شریک ملکوں کے مابین اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا۔ چنانچہ 1951ء کے وسط میں مربوط منصوبہ بنایا گیا۔ بعدازاں منصوبہ بندی کمیشن تشکیل دیا گیا۔ یہ چوبیس ارکان پر مشتمل تھا کمیشن نے پہلا پنج سالہ منصوبہ (1955-1960) تیار کیا۔

پہلے انعامی بانڈ کا اجرا

حکومت پاکستان نے یکم اکتوبر 1961ء کو پہلی بار دس روپے کے انعامی بانڈ اسکیم کا اجرا کیا بعدازاں پانچ روپے اور گیارہ روپے کے انعامی بانڈ اور دفاعی بانڈ جاری کیے گئے۔ یکم جنوری 1981ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے انعامی بانڈز کی کئی سیریل جاری کر دیں جن کی مالیت 50 روپے سے 1500 روپے اور ایک ہزار روپے تک ہے۔ یہ بانڈ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے علاوہ شیڈول بینکوں اور نیشنل سیونگز سنٹرز سے مل سکتے ہیں۔ ابتدا میں عوام نے دس روپے کی مالیت والے انعامی بانڈز کی خریداری میں سب سے زیادہ دلچسپی لی ہے۔

پاکستان کا جوہری توانائی کا پہلا بجلی گھر

28 نومبر 1972ء کو پاکستان کی جوہری توانائی

کے پہلے مرکز نے کراچی میں کام شروع کر دیا۔ یہ ایک لاکھ پچیس ہزار کلو واٹ بجلی پیدا کر رہا ہے۔ کراچی سے یہ اسٹیشن 15 میل دور واقع ہے۔ اس کی تعمیر کا منصوبہ 1964ء میں تیار ہوا۔ حکومت کینیڈا نے اس منصوبے پر اٹھنے والے غیر ملکی زرمبادلہ کی ضرورت پورا کرنے کے لیے ساٹھ ملین ڈالر قرض دیا اور ایٹمی بجلی گھر کی تکمیل کے لیے مئی 1965ء میں کینیڈا کی جنرل الیکٹرک کمپنی کو ٹھیکہ دیا گیا۔ جولائی 1966ء میں اس منصوبہ پر عمل شروع ہوا اور جولائی 1970ء میں تعمیرات اور آلات کی تنصیب کا کام ختم ہو گیا اور اس کے بعد ایٹمی بجلی پیدا کرنے کی کارروائی شروع ہوئی۔ اس سے یکم اگست 1971ء کو پہلی دفعہ ایٹمی بجلی حاصل کی گئی اور صرف ایک سال بعد یعنی 4 اکتوبر 1972ء کو یہ بجلی گھر 137 ڈبلیو ایم بجلی پیدا کرنے لگا۔ 28 نومبر 1972ء کو اس کا افتتاح ہوا۔

پہلا مسافر بردار جہاز

ایم وی شمس پاکستان کا پہلا مسافر برادر جہاز ہے۔ اس نے جنوری 1961ء میں کراچی اور چاٹگام کے درمیان سفر کیا۔ یہ جہاز 2 کروڑ روپے میں جاپان سے خریدا گیا تھا۔

پہلا تیار کردہ بحری جہاز

پاکستان میں تیار کیا جانے والا پہلا بحری جہاز العباس ہے۔ یہ 1286 ٹن وزنی ہے۔ اسے محمدی سٹیم شپ کمپنی کے لیے یوگوسلاویہ کے اسپلٹ شپ یارڈ کے تعاون سے تیار کیا گیا۔ صدر ایوب خان نے 4 مئی 1966ء کو اسے سمندر میں اتارنے کی رسم ادا کی تھی۔ جدید ترین ڈیزائن کے مطابق تیار ہونے والا یہ پہلا جہاز پانچ سو فٹ ایک انچ لمبا 24 فٹ چوڑا اور 30 تا 39 فٹ گہرا ہے۔ اس کی رفتار 17 بحری میل فی گھنٹہ ہے اس میں 64 افراد سفر کر سکتے ہیں۔ اس میں غلہ کی بار برادری کے لیے 6 لاکھ 80 ہزار مکعب فٹ اور گانٹھیں لے جانے کے لیے 6 لاکھ دس ہزار مکعب فٹ جگہ موجود ہے۔ جہاز تمام جدید مشینری اور ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ یہ جہاز تکمیل کے بعد گورنر مشرقی پاکستان جنرل (ریٹائرڈ) محمد موسیٰ کے ہاتھوں فرمائش کرنے والی کمپنی کے حوالے کیا گیا۔

العباس پاکستان کی صنعت اور اس کی تیز رفتار ترقی کی ایک عظیم علامت سمجھا جاتا ہے اس لیے ایشیائی ممالک میں جاپان کے علاوہ پاکستان ہی کو اتنے بڑے جہاز تعمیر کرنے کا فخر حاصل ہے۔ صدر ایوب نے جہاز کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم دس سال سے اس دن کے منتظر تھے۔

بحری جہازوں کی مرمت کرنے والا پہلا بحری جہاز

مومن پاکستان نیوی کا پہلا جہاز ہے جس میں سمندر میں سفر کرنے والے جہازوں کے پرزوں اور مشینری میں پیدا ہونے والے نقائص دور کرنے کے لیے ممکن نظام موجود ہے۔ اس میں کئی ورکشاپیں ہیں جس میں ایک ہیوی میٹل شاپ اور پائپ فٹنگ شاپ قابل ذکر ہیں۔

اس نئے پاکستانی بحری جہاز کا معائنہ جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین مسٹر افتخار احمد سروہی نے 17 مئی 1990ء کو کیا۔

پہلی مچھلی بندر (فش ہاربر)

پاکستان کی پہلی مچھلی بندر کا قیام 1960ء میں عمل میں آیا۔ اس پر ڈیڑھ کروڑ روپے لاگت آئی تھی۔ یہ کراچی کے ویسٹ وہارف پر واقع ہے۔ اس کے قیام کے بعد اسے ایک غیر سرکاری ادارے فشرمین کوآپریٹو سوسائٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ 1974ء میں اسے حکومت سندھ کی تحویل میں دے دیا گیا۔

اس کے قیام کے وقت یہاں چار سو لانچوں کی گنجائش رکھی گئی تھی لیکن یہاں تین ہزار سے زائد لانچیں چل رہی ہیں جب کہ 11 ہزار سے زائد لانچوں کی رجسٹریشن ہو چکی ہے۔

یکم جولائی 1983ء کو اس میں توسیع کا پروگرام بنایا گیا جسے 30 جنوری 1988ء تک مکمل ہونا تھا مگر یہ کام کھٹائی میں پڑ گیا اور 1989ء میں پھر سے کام شروع کیا گیا۔ اب اس کا انتظام فش ہاربر اتھارٹی کے سپرد ہے جس کا قیام کراچی فش ہاربر اتھارٹی آرڈی نینس مجریہ 1984ء کے تحت عمل میں آیا۔

کراچی فش ہاربر پر اس وقت تین ادارے سرگرم عمل ہیں 1۔ فش ہاربر اتھارٹی، 2۔ فشرمین کوآپریٹو سوسائٹی، 3۔ کسٹمز فشرمین کوآپریٹو سوسائٹی۔

فش ہاربر کے چار دروازے ہیں۔ اتھارٹی کی آمدنی کا واحد اور موثر ذریعہ پروسیسنگ پلانٹ کی زمین کا کرایہ ہے۔ بعدازاں 2 اپریل 1989ء کو وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے پسنی میں فش پورٹ کا افتتاح کیا اس پر 56,30,00000 روپے لاگت آئی۔ تیسری فش ہاربر کا سنگ بنیاد 14 دسمبر 1989ء کو سابق وزیر اعظم بھٹو نے رکھا تھا۔

پہلی خشک بندرگاہ

قیام پاکستان کے وقت پاکستان کو درآمدات اور برآمدات کے لیے مکمل طور پر کراچی کی بندرگاہ پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے نہ صرف لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا بلکہ تجارت کے شعبے سے منسلک افراد کو زائد اخراجات بھی برداشت کرنا پڑتے تھے۔ کراچی کے علاوہ دیگر شہروں کے افراد کی سہولت کے لیے 1970ء کی دہائی میں ڈرائی پورٹس کے قیام کا تصور پیش کیا گیا اور اس ضمن میں وزیراعظم پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اپریل 1974ء میں ملک کی پہلی خشک بندرگاہ کا لاہور میں افتتاح کیا تاکہ اس علاقے کے عوام کی ضرورت براہ راست سہولتیں فراہم کر کے پوری کی جا سکے۔ اس طرح لاہور ڈرائی پورٹ نے اپنے قیام سے لے کر اب تک قابل قدر ترقی کی ہے۔ 89-1988ء کے دوران ڈرائی پورٹ نے 29 ہزار ٹن درآمدی اور 27 ہزار ٹن برآمدی مال مختلف علاقوں کو بھیجا جس سے ریلوے کو سالانہ 13 کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی۔ اب ایک جدید قسم کا ان لینڈ کنٹینر اسٹیشن بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ جولائی 1989ء میں پاکستان ریلوے نے امریکی پریذیڈنٹ لائن کے تعاون سے ہفتہ وار کنٹینر ایکسپریس ٹرین چلائی جو لاہور سے کراچی 30 گھنٹوں میں پہنچتی ہے۔ جنوری 1990ء میں ہفتہ میں اس کی تعداد دو کر دی گئی۔ پاکستان ریلوے نے پشاور، کوئٹہ، ملتان، سمبڑیال (سیالکوٹ) اور راولپنڈی میں بھی ڈرائی پورٹس قائم کیں۔

پہلا بینک (عمومی)

قیام پاکستان کے بعد پہلا کاروباری بینک مسلم کمرشل بینک ہے جس کا قیام 9 جولائی 1947ء کو کلکتہ میں عمل میں آیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اسے 17 اگست 1948ء کو ڈھاکہ منتقل کر دیا گیا۔ اس اعتبار سے پاکستان میں قائم ہونے والا یہ پہلا بینک ہے۔ 23 اگست 1956ء کو اس کا مرکزی دفتر کراچی میں قائم کیا گیا۔ یکم جنوری 1974ء کو وفاقی حکومت نے بینکوں کو قومی تحویل میں لینے کا اعلان کیا تو یہ بینک بھی حکومتی تحویل میں آ گیا۔ نیز اس میں پریمیئر بینک لیمٹڈ کو بھی ضم کر دیا گیا۔

بینک نے نفع نقصان کی بنیاد پر یکم جنوری 1981ء کو کاروبار کا آغاز کیا اور اس کو دوبارہ سود کی لعنت سے پاک کر دیا گیا۔ یہ بینک طلبا کو قرض حسنہ بھی دیتا ہے۔

بابر اقبال مائیکروسافٹ میں چار عالمی اعزازات حاصل کرنے والا پہلا کمسن بچہ ہے۔

پاکستان اور بچے

13 سالہ شہید کاشف اقبال تمغہ شجاعت حاصل کرنے والا پہلا بچہ تھا۔

انتخاب: عائشہ انعام

پہلا ایس او ایس ویلج

حکومت پاکستان نے بے سہارا عورتوں اور لاوارث بچوں کو معاشرہ میں اہم مقام دلانے کے لیے متعدد اقدامات کیے ہیں جن میں لاہور میں گلاب دیوی ہسپتال کے قریب لاچار بچوں کے گاؤں کی تعمیر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کی تعمیر کا کام 1977ء میں مکمل ہوا اور صدر پاکستان مسٹر فضل الٰہی چودھری نے 2 جنوری 1978ء کو اس گاؤں کا افتتاح کیا۔

یہ گاؤں پچاس کنال اراضی پر مشتمل ہے۔ اس میں 15 گھر ہیں جن میں 125 لڑکے مقیم ہیں ہر گھر میں آٹھ سے لے کر نو بچے رہائش رکھتے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال اور کھانے پینے کے لیے ایک ہاؤس مدر مقرر کی گئی ہے۔ اس میں بچے گھر کی طرح رہتے ہیں۔

یہاں اسنیک بار، مسجد، آڈیٹوریم، انتظامیہ کے دفاتر کے علاوہ لائبریری بھی ہے اس گاؤں کے بچے شہر کے اعلیٰ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بچوں کے اس گاؤں کا بجٹ آٹھ تا دس لاکھ روپے سالانہ ہے۔ بچوں کی تفریح وغیرہ کے لیے ایک گاڑی بھی ہے۔ یہاں ایک یوتھ ہاؤس بھی قائم کیا گیا ہے جہاں بالغ افراد کو رکھا جاتا ہے۔ اس قسم کے دوسرے گاؤں ڈھیال ضلع مانسہرہ کے بعد راولپنڈی، سرگودھا، فیصل آباد، کوئٹہ، پشاور اور کراچی میں تعمیر کیے گئے ہیں۔

پہلا چلڈرن کمپلیکس

پاکستان میں پہلا چلڈرن کمپلیکس 1983ء میں لاہور میں قائم کیا گیا۔ اس کا تصور سابق گورنر پنجاب غلام جیلانی نے پیش کیا تھا۔ 75 کنال اراضی پر مشتمل اس کمپلیکس کا افتتاح 14 نومبر 1988ء کو وزیر اعلیٰ پنجاب جناب نواز شریف نے کیا تھا۔ اس پراجیکٹ پر 3 کروڑ روپے لاگت آئی ہے۔ چلڈرن کمپلیکس کی سالانہ فیس 24 روپے ہے جب کہ مختلف شعبوں میں بچوں کے لیے شروع کیے جانے والے خصوصی کورسز کے لیے 50 روپے ماہانہ فیس لی جاتی ہے۔

بچے اسکول سے فارغ ہونے کے بعد یہاں آتے ہیں دو تین گھنٹے گزارنے کے بعد گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں۔ ان کی عمر چار سے چودہ سال تک ہوتی ہے۔ یہاں ایک کمپیوٹر سیکشن بھی ہے۔ اس کے دیگر شعبوں میں جمنازیم، ٹوائے سیکشن۔ لائبریری، سمعی و بصری سیکشن۔ آڈیٹوریم اور آرٹ اینڈ کرافٹس سیکشن شامل ہیں۔ آڈیٹوریم میں بچوں کو انگریزی، جرمن، پاکستانی اور فرانسیسی زبانوں کی تفریحی اور کارٹون فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ لائبریری میں کتابوں کی تعداد بارہ ہزار کے لگ بھگ ہے۔

مائیکروسافٹ میں چار عالمی اعزاز حاصل کرنے والا بچہ

2009ء میں پاکستان کے بابر اقبال نے مائیکروسافٹ میں چار عالمی اعزازات حاصل کیے۔ اس اعتبار سے وہ پاکستان کا پہلا کمسن بچہ ہے جس نے یہ اعزاز حاصل کیے۔

تمغہ شجاعت حاصل کرنے والا پہلا بچہ

ماسٹر ثاقب جنجوعہ پہلا پاکستانی بچہ (عمر 13 سال) ہے جس نے 1982ء میں ریاض (سعودی عرب) میں مقیم، تالاب میں ڈوبتے ہوئے دو بچوں (عمر اڑھائی سال اور عمر ساڑھے چار سال) کی جان بچائی۔ وہ لیفٹیننٹ کرنل خالد جاوید کا بیٹا ہے۔ حکومت پاکستان نے ثاقب کی حوصلہ افزائی کے لیے اسے تمغۂ شجاعت عطا کیا۔ اس طرح وہ پہلا پاکستانی بچہ ہے جس نے یہ اعزاز حاصل کیا۔

ستارہ امتیاز حاصل کرنے والا پہلا کم عمر فرد

14 اگست 2004ء کو پاکستان میں نجی طور پر ملک میں سب سے زیادہ ٹیکس دینے والے 36 سالہ شہری غوث اکبر "ستارہ امتیاز 2004ء" حاصل کر کے ملک کی کم عمر ترین ستارہ امتیاز حاصل کرنے والی شخصیت بن گئے۔

13 سالہ شہید کو پہلی مرتبہ تمغہ شجاعت دیا گیا

23 مارچ 2006ء کو صدر جنرل پرویز مشرف نے یوم پاکستان کے موقع پر پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک تیرہ سالہ کم عمر لڑکے شہید کاشف اقبال کو تمغہ شجاعت دیا۔ کاشف اقبال ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ایک دن تین ڈاکو ان کے اٹک میں واقع گھر میں آگئے اور ان کے اہل خانہ کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا جس پر کاشف اقبال نے گھر کی گھنٹی بجا دی جس سے ڈاکو بوکھلا گئے اور فرار ہونے لگے۔ مگر کاشف اقبال نے ان کا بے خوف و خطر پیچھا کیا تو ڈاکوؤں نے انھیں گولی مار دی جس پر وہ شہید ہو گئے۔ صدر مملکت جنرل پرویز مشرف نے شہید کاشف کے والد کو اعزاز دیتے ہوئے کہا کہ قوم اس شیر دل بچے کو سلام پیش کرتی ہے۔

بابر اقبال

تحریک پاکستان کے نعرے

رانا محمد شاہد

مارچ 1940ء کو ایک مملکت کے حصول کے لیے ایک منظم و مربوط طریقے سے جدوجہد کا آغاز ہوا۔ جس کے نتیجے میں دنیا کے نقشے پر قائداعظم کی زیر قیادت مملکت خداداد پاکستان، نمودار ہوئی۔ اس ملک کے لیے لاکھوں انسانوں نے پانی کی طرح اپنا خون بہایا۔ تحریک پاکستان کے دوران لگائے گئے پُرجوش نعرے یہاں تحریر کیے جارہے ہیں۔

1۔ مسلم لیگ کے اجلاس کی ابتدا تلاوت کلام پاک سے ہوتی۔ اس کے بعد اجلاس کی کارروائی شروع ہوتے ہی نعرے لگتا ''نعرہ تکبیر..... اللہ اکبر''

2۔ نعرۂ رسالت..... یارسول اللہ ﷺ

3۔ اسلام زندہ باد، پاکستان زندہ باد، مسلم لیگ زندہ باد، قائداعظم زندہ باد۔

4۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔

5۔ دینا ہی ہوگا پاکستان

پھر جوش ولولے سے بھرپور نعرہ سنائی دیتا:

6۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہے گا پاکستان

اس کے بعد نعرے میں اعتماد و یقین کی کیفیت نمایاں نظر آتی۔

7۔ سینے پہ گولی کھائیں گے، پاکستان بنائیں گے۔

اس کے بعد نیلے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر نعرہ لگایا جاتا:

8۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ جواب آتا۔ لا الٰہ الا اللہ

اس کے بعد جوش و ولولے سے اُچھل اُچھل کر نعرہ لگایا جاتا۔

9۔ کٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہے گا پاکستان۔

نوجوانوں کا ایک طبقہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ نعرہ لگاتا:

10۔ کیسے لوگے پاکستان، جیسے لیا تھا ہندوستان۔

11۔ دل کی دھڑکن، پاکستان آنکھوں کا نور پاکستان..... دل کا سرور پاکستان

12۔ زندہ باد، پاکستان پاکستان۔

13۔ زندہ باد، زندہ باد..... مسلم لیگ، مسلم لیگ

تحریک پاکستان کے کارکن مسلمانوں کے اتحاد و یکجہتی کا نعرہ بلند کرتے۔

14۔ ایک ہی صورت، ایک ہی آن..... پاکستان، پاکستان

15۔ قائداعظم کا فرمان: لے کے رہیں گے پاکستان

جذبوں سے بھرا نعرہ گونجتا:

16۔ خون کی ندیاں بہا دیں گے، پاکستان بنا دیں گے۔

مسلم لیگ نے اپنی تنظیم میں شمولیت کی دعوت یوں دی:

17۔ مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!

تحریک پاکستان کے مخالفین نعرہ لگاتے:

18۔ جو مانگے گا پاکستان، اسے ملے گا قبرستان

جوشیلے لہجے میں اس کا جواب کچھ یوں آتا:

19۔ تیرے کرم سے یارحمان، بن کے رہے گا پاکستان

مسلم لیگ کی ولولہ انگیز جدوجہد نے تحریک پاکستان کی منازل طے کرنا آسان کردیں۔ جب مسلم لیگ کی تحریک سے خضر حکومت کا خاتمہ ہوا (خضر انگریز کا پٹھو اور پنجاب کا آخری وزیراعلیٰ تھا) تو نعرہ بلند ہوا:

20۔ تازہ خبر آئی اے، خضر ساڈا بھائی اے

بعض کانگریسی اور احراری یہ نعرہ لگاتے نظر آتے:

21۔ ہتھ وچ سگریٹ منہ وچ پان، اجے وی لینا پاکستان

اس کے کانگریسی نعرہ لگاتے:

22۔ مسلم لیگ نوں مار مار کے کردیو ٹھیک

اور اُدھر سے مسلم لیگ نعرہ بلند کرتی:

23۔ پنج نعرے پنجتنی تے اک نعرہ حیدر، یا علیؑ

کانگریسیوں کا ایک اور نعرہ تھا:

24۔ جاگ اٹھے جاگ اٹھے، دھرتی ماتا جاگ اٹھے

سکھوں کا گروپ اپنا نعرہ لگاتا:

25۔ جو بولے سونہال، ست سری اکال

پاکستان کے حق میں لگائے گئے پُرجوش نعروں کے مقابلہ میں مخالفین کے نعروں کی کوئی وقعت اور حیثیت نہ تھی۔ ان پُرجوش نعروں کی بدولت زمین ہل جاتی۔ پورے ہندوستان کے گلی کوچوں اور بازاروں میں گونجنے والے ان پُرجوش نعروں نے مسلمانوں کو یکجا کردیا اور یہی وہ اتحاد تھا جس کی بدولت پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور ہندوؤں کو منہ کی کھانی پڑی۔

یہاں اس بات کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی اُن شاعروں کے ساتھ، جن کی نظموں نے تحریک پاکستان کے نوجوانوں اور کارکنوں میں ایک نیا جوش و ولولہ اور حیات نو پیدا کی۔ تحریک پاکستان کے ان شاعروں کے اکثر اشعار قوالی اور نعروں کا روپ دھار گئے۔ اسی دور کے ایک بڑے شاعر کیف حسین بنارسی تھے۔ ان کی نظم تھی ''لے کے رہیں گے پاکستان''۔ اس نظم کے چند اشعار ہیں۔

منزل کو سر کرنا ہے، مشکل سے کیا ڈرنا ہے
آزادی کے شعلہ کو، دل میں روشن کرنا ہے
پاکستان کی اُلفت میں، اپنا جینا مرنا ہے

لے کے رہیں گے پاکستان
بٹ کے رہے گا ہندوستان

کیف بنارسی کی اس طویل نظم کا درج بالا آخری شعر تحریک پاکستان کا سب سے بڑا نعرہ بن گیا۔

"مفہومِ آزادی"

جاوید احمد صدیقی

مہاجروں کے ساتھ ساتھ انصار بھی جعل سازی کی گنگا میں ہاتھ دھوتے بلکہ نہاتے رہے

کچھ دنوں سے بڑے ابا مجھے ہجرت کے واقعات، ان کا پسِ منظر اور مسلمانوں کی چلائی ہوئی تمام تحاریک سے وقتاً فوقتاً آگاہ کررہے تھے۔ اس دن ذرا فارغ تھا تو یکدم سوچ نے رخ بدلا کہ بھئی یہ تو یومِ آزادی کے قریب آنے پر بڑے ابا اپنی ہجرت کے واقعات کو سوچ کے پردے سے ہونے تک منتقل کرتے جارہے ہیں۔ ان کے ہر واقعہ کے بعد حلال رزق اور ایمانداری و دیانت داری سے کمائی ہوئی دولت اور جائز طریقے سے ملی ہوئی جائیداد پر انحصار پر بڑا زور تھا۔ خاص طور پر حلال رزق کی تو تاکیدِ خاص کی جاتی تھی۔

میں اس وقت ڈاکٹری کے تھرڈ ائیر میں اور بڑے ابا کا سب سے لاڈلا پوتا تھا۔ میرا گھر میں اوڑھنا بچھونا ہی بڑے ابا کا کمرہ تھا۔ میرے ابو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں مارکیٹنگ ہیڈ تھے اور انتہائی تگ و دو اور محنت سے یہ پوسٹ حاصل کی تھی۔ حلال رزق ہی ہمارے گھرانے کا رزق تھا۔

اسی لیے گھر میں برکت بھی تھی۔ اس دن بڑے ابا نے چھٹی ہونے کے ناطے مجھے خاص طور پر بلا کر تحریکِ پاکستان کی تاریخ سے آگاہ کیا اور ہجرت کے بڑے انوکھے اور عبرت انگیز واقعات بھی سنائے۔

اسی دن بڑے ابا کے قریبی دوست تشریف فرما تھے اور یہ قصہ چل رہا تھا اور ضیاء صاحب نے بڑے اچھے پیرائے میں بڑے ابا سے اجازت لیکر ایک واقعہ سنایا۔

1947ء کا سال جہاں ہندوستان کو دو حصوں میں بانٹ گیا وہیں پر برسوں سے ایک ساتھ بسنے والے لوگوں کو بھی دو حصوں میں بانٹ گیا۔ انڈیا میں جہاں اخوت و بھائی چارے کے مظاہرے عام ہوا کرتے تھے۔ وہاں لوگوں کے دلوں میں تعصب کی آگ بھڑکنے لگی۔

تقسیم کے بعد چند ہفتوں میں ہی سب کچھ الگ الگ ہو کر رہ گیا۔ لوگوں کو الگ مذہب اور قوم کا فرق نظر آنے لگا اور یہ فرق انسانیت پر حاوی ہوگیا۔ ہندو مسلمان دونوں طرف لاکھوں کروڑوں کی جائیدادیں چھوڑ کر اپنے اپنے نئے وطن میں ہجرت کرکے جا پہنچے ایسے میں بے ایمان اور لالچی لوگوں کی طرف سے لوٹ مار کا وہ میدانِ کارزار سجا کہ الاماں الحفیظ۔

بڑے ابا اور میں اپنے خاندانوں کے ساتھ ہجرت کرکے اللہ کے کرم سے صحیح سلامت ادھر لاہور آ بسے۔ چونکہ ہماری جائیدادوں کے کاغذات اور فیکٹریوں کی تفصیلات کے کاغذات ہم ساتھ لے آئے تھے۔

ہمارے خاندان کے ساتھ کچھ ہمارے جاننے والے بھی سلامتی سے آگئے تھے ان میں ایک ہمارے جاننے والے میاں اللہ یار بھی تھے۔ وہ کارخانے میں سُپر وائزر تھے، لاہور میں ہمارے ساتھ ہی ان کو بھی عارضی طور پر جگہ مل گئی۔ چند روز میں ہی میں، تمھارے بڑے ابا اور میاں اللہ یار اپنے ایک دوست کے ساتھ والٹن پہنچے۔ مجسٹریٹ صاحبان اور اسسٹنٹ کمشنر کے آفس بنے ہوئے تھے جو آنے والے لوگوں کو دستاویزات وغیرہ کی صحیح طریقے سے جانچ پڑتال کرکے پاکستان میں جائیدادیں، کارخانے، فیکٹریاں پلاٹ وغیرہ الاٹ کرتے تھے۔ کاغذات وغیرہ مجسٹریٹ صاحب نے ہم دونوں کے دیکھ بھال لیے اور ایک ہفتہ کے بعد آنے کی تاریخ دے دی۔ مگر بیٹا! میں نے اور تمھارے بڑے ابا نے تعجب سے یہ معاملہ دیکھا کہ میاں اللہ یار نے ہفتہ بھر میں ہم سے بھی دوگنی جائیداد وغیرہ کے کاغذات بنوائے ہوئے تھے۔ اگلے ہفتہ جب ہم لوگ الاٹ منٹ کے سلسلہ میں حاضر ہوئے۔ ہم نے اللہ یار سے اتنا کہا کہ بھئی وہاں تو چھوٹی کوڑی کے آپ مالک نہ تھے اور ادھر آپ کا اتنا بڑا کلیم ہے! میاں صاحب بولے "میں نے سب کچھ پکا کرالیا ہے۔ یہی تو موقع ہے کہ پشتوں کو بٹھا کر کھلانے کا۔ مہاجروں کو تو چھوڑیں انصار نے اس بہتی گنگا میں نہ صرف ہاتھ دھوئے بلکہ باقاعدہ نہائے دھوئے ہیں۔

> **بولتے یہی تو موقع ہے پشتوں کو بٹھا کر کھلانے کا، مہاجروں کو چھوڑیئے الغرض انصار نے بھی بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے ہیں**

کچھ نے ہمارے جیسے لوگوں کی کاغذات وغیرہ بنوانے میں مدد کی اور خوب دھن دولت کو سمیٹا۔" اگلے ایک ماہ میں ہمیں ایک فیکٹری، پلاٹ، بڑا گھر اور دو مربع زمین الاٹ ہوگئی۔ مزے کی بات کہ ہماری فیکٹری، پلاٹ اور گھر کے متصل یہی کچھ میاں اللہ یار کو بھی مل گیا۔!!! یاد رہے لیتے وقت مجسٹریٹ کے سامنے حلفاً قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر سچائی کی قسم کھانی پڑی تھی۔

زمانہ ہر دور میں نصیحتوں اور عبرت انگیز واقعات سے بھرا ہوتا ہے۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ ہم نے 22,20 سال میں دیکھا کہ نہ تو میاں اللہ یار کے بچے ہی کچھ بنے، نہ کاروبار کی بڑھوتری ہوئی۔ عیاشی میں سب اڑایا جا رہا تھا۔ بچوں کے بچے بھی بگڑے رئیس زادے تھے۔ میاں اللہ یار سے وقتاً فوقتاً ملاقات ہوتی تو دکھی دل سے کہتے میاں! تو ہم کہتے کہ میاں صاحب آخرت خراب کر لی آپ نے.....! مگر میاں اللہ یار نے کبھی ادھر کان نہ دھرے۔ اب احساس ہو رہا تھا کہ بہت کچھ غلط ہو گیا تھا اور ہو رہا تھا۔"

بڑے ابا کے دوست نے یہاں تک سنا کر بات ختم کی، تو میں نے کہا انکل! آگے بھی تو بتائیں کہ اس بے ایمانی سے تمام عمر حرام رزق کھانے کا انجام کیا ہوا.....! بولے "بیٹا چند سال پہلے میاں صاحب کا انتقال ہوا تو میت پر ہر شخص توبہ توبہ کر رہا تھا۔ تدفین کے وقت قبر بھی ان کو قبول نہ کر رہی تھی۔ افسوسناک صورت احوال پیدا ہوئی۔ آخر بڑے بزرگ تھے ہمارے اُن کو بلایا گیا اور پھر تدفین مکمل ہوئی۔ بچے اور رشتہ دار پہلے ہی جائیدادیں تقریباً ہضم کر کے بیٹھے تھے آنے والے دنوں میں کوئی دعا کرنے والا بھی میسر نہ تھا۔ کہ ایک مجسٹریٹ صاحب کے پاس کچھ لوگ کچھ کے کوئی دو ماہ کے بعد آئے اور مجسٹریٹ فاروقی صاحب سے علیحدگی میں بات کرنے لگے کہ جناب آپ کے ہی مبارک ہاتھ سے ہمیں یہاں کوٹھی نما مکان ملا۔ چند دن سے اس کوٹھی کی کھدائی کروا رہے تھے کہ فرش اچھے ڈالے جائیں اور اتفاق سے ہمیں سونے کے تولہ تولہ کے بے شمار سکے ملے ہیں پوری ایک دیگ بھری پڑی ہے۔ آپ اس آدھی دولت کے حق دار ہیں بتائیں کب لائیں۔ فاروقی صاحب نے کہا کہ بھئی کاغذات میں لکھ دیا گیا کہ آپ کی ملکیت ہے اوپر اللہ کے ہاں بھی لکھ دیا گیا تھا۔ میں تو کسی قیمت پر نہ لوں گا۔ ہاں آپ کا اصرار ہے تو میں ایک یتیم خانہ کا پتا دے دیتا ہوں جتنا دینا چاہیں انھیں دے دیں اور وہ اللہ کے بندے بھی سیدھے یتیم خانہ جا پہنچے۔ کاش باقی لوگ بھی سوچتے کہ اپنا وطن ہم نے صرف لوٹ مار کے لیے تو نہیں لیا تھا۔ آپ لوگ یقیناً ایماندار ہیں جو رزقِ حلال کے لیے کوشاں رہتے ہو۔ آزاد وطن لاکھوں قربانیوں کے بعد ملا تھا۔ شکرِ خدا کر کے ہم سب کو ایمانداری، دیانت، امانت اور بے حد تقویٰ کے ساتھ اس کی آبیاری کرنی چاہیے۔

اس کے بعد میں نے یہ سب باتیں لکھ لی تھیں اور میڈیکل کالج اور دوسرے تمام دوستوں کو اس کی فوٹو کاپیاں تقسیم کی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں آزادی کے حوالے سے 14 اگست کو اس سے اچھا اور بڑا تحفہ میں نہیں بانٹ سکتا تھا کہ ہر ایک نے بے حد تعریف کی۔ (آمین)

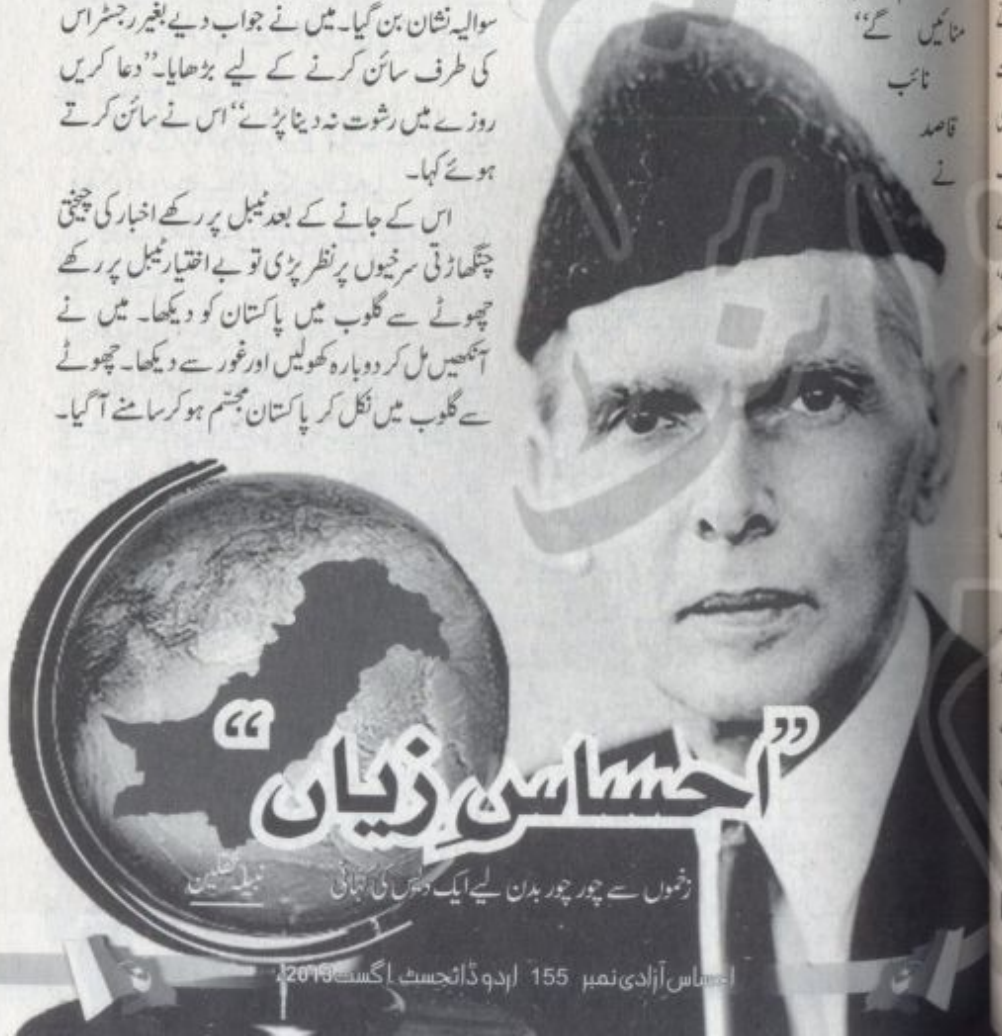

میڈم صاحبہ کل عید ہوگی؟ نائب قاصد نے دفتر میں داخل ہوتے ہی مجھ سے سوال کیا تو میں اپنے خیالوں سے ایک دم چونکی

کیا کہا؟ میں نے دوبارہ جاننا چاہا

کیا کل عید ہوگی؟ اس نے استفسار کیا تو کمپیوٹر ڈیسک پر بیٹھے کلرک نے میرے جواب دینے سے پہلے کہا: "اگر کوئی خیبر پختونخواہ کے ساتھ عید منائے تو کل لازمی عید ہوگی۔"

"ہم تو سرکاری ملازم ہیں سرکار کے ساتھ ہی عید منائیں گے"

نائب قاصد نے جواب دیتے ہوئے میرا بیگ آفس ٹیبل پر رکھا اور باہر نکل گیا۔

"میں نے آج اکاؤنٹس آفس جانا ہے۔" ظفر کلرک نے سوال کیا۔

ہاں چلے جاؤ تاکہ پاس شدہ بجٹ کی کاپی مل جائے، میں جواب دیتے ہوئے موومنٹ رجسٹر میں اس کے جانے کا آرڈر لکھنے لگی۔

میڈم! اگر انھوں نے کوئی عیدی وغیرہ مانگی تو..... میرے دیکھنے پر ظفر بات ادھوری چھوڑ کر خود سوالیہ نشان بن گیا۔ میں نے جواب دیے بغیر رجسٹر اس کی طرف سائن کرنے کے لیے بڑھایا۔ "دعا کریں روزے میں رشوت نہ دینا پڑے" اس نے سائن کرتے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے بعد ٹیبل پر رکھے اخبار کی چیختی چنگھاڑتی سرخیوں پر نظر پڑی تو بے اختیار ٹیبل پر رکھے چھوٹے سے گلوب میں پاکستان کو دیکھا۔ میں نے آنکھیں مل کر دوبارہ کھولیں اور غور سے دیکھا۔ چھوٹے سے گلوب میں نکل کر پاکستان مجسم ہو کر سامنے آ گیا۔

مگر یہ کیا۔ شہ رگ کے گرد کسا ہوا شکنجہ اور زخموں سے چور لہو لہان بدن، ٹوٹے ہوئے بازو سے بیساکھیاں پکڑے بیچارگی و بے بسی کی تصویر، یہ میرا پاکستان ہے۔ میں دکھ کے عالم میں اپنی کرسی سے کھڑی ہو کر رخ موڑنے لگی تو سامنے قائداعظم کی تصویر کے بجائے خود قائداعظم غیض و غضب کی تصویر بنے کھڑے تھے ''تم سے ایک ملک نہیں سنبھالا جا رہا ہے کیسی استاد ہو؟ کیا درس دیتی ہو ان طالبات کو جن کی گودوں میں اس قوم نے پلنا ہے۔''

''سر! اپنی طرف سے تو بہتری کی کوشش کر رہے ہیں'' میں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا:

کیسی بہتری؟ یہی کہ تم لوگوں نے زیارت ریذیڈنسی کو زیارت کے قابل نہیں رہنے دیا۔''

میرے قائد! مجھے تو دیکھیں میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہے۔

لہولہان پاکستان سراپا درد بنا قائد سے مخاطب تھا۔

''یہ دیکھیں ان کے تعصبات اور خود غرضیوں نے مجھ سے میرا دایاں بازو چھین لیا۔ میں نے سوچا باقی جسم اور ایک بازو ہاتھ تو سلامت ہے زندگی اللہ کی ان نعمتوں کے سہارے گزر جائے گی۔ لیکن سر! خودکش حملے، بم دھماکے، ٹارگٹ کلنگ، قومی عصبیت، مذہبی فرقہ واریت، بھتہ خوری اور ڈرون حملوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا، سر یہ دیکھیں میرا بازو، میرا سینہ میرا جسم سب لہولہان ہیں۔ ایک ٹانگیں ہیں جو پنجاب کی صورت کچھ طاقت رکھتی ہیں۔ لیکن فرقہ واریت، لوڈشیڈنگ، دہشت گردی و بھتہ خوری کا عفریت اس کا خون پی رہا ہے۔ چونکہ جسم کٹا پھٹا ہے اس لیے ٹانگوں تک مزید توانائی پہنچنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا

سر! ان کا تو یہ حال ہے کہ جب یہ حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو اپنے ہی ٹیکسوں سے تعمیر شدہ املاک کو برباد کر دیتے ہیں۔ اپنے ہی جیسے مجبوروں اور بے کسوں کو راستہ نہیں دیتے۔ کسی کے روزگار کے واحد ذریعے کار، رکشہ، ٹیکسی اور موٹر سائیکل کو آگ لگا دیتے ہیں۔ کسی اپنے ہی جیسے جاں بلب مریض کی ایمبولینس کو ہسپتال تک جانے کا راستہ نہیں دیتے۔

ہے۔ میں بیساکھیوں کے بغیر کھڑا نہیں ہو سکتا لیکن آپس کی نااتفاقی ان بیساکھیوں کو بھی دیمک لگا رہی ہے۔

سر یہ میری شہ رگ اور اس میں کسا شکنجہ دیکھیں۔ یہ روز بروز سخت ہوتا جا رہا ہے۔ جب ہاتھ، ٹانگیں اور جسم کمزور ہو تو اس شکنجے کو ڈھیلا کیسے کروں۔ میں بہت تکلیف میں ہوں سر۔ لیکن آپ کے بچوں کو میری کوئی پروا نہیں۔ یہ کل عید اور چند دن کے بعد یوم آزادی منانے جا رہے ہیں۔ ایک اللہ، ایک رسول ﷺ اور ایک کتاب کو ماننے والے دو دو عیدیں منائیں گے۔ دن کی ابتدا ایک دوسرے کو نیچا دکھانے سے ہوگی تو دن کا اختتام کسی بم بلاسٹ پر۔ جن کے پاس پیسہ ہے انھیں عید مناتے اپنے مجبور و بے کس بہن بھائیوں کا خیال نہیں آئے گا۔

سر! ان کا تو یہ حال ہے کہ جب یہ حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو اپنے ہی ٹیکسوں سے تعمیر شدہ املاک کو برباد کر دیتے ہیں۔ اپنے ہی جیسے

مجبوروں اور بے کسوں کو راستہ نہیں دیتے۔ کسی کے روزگار کے واحد ذریعے کار، رکشہ، ٹیکسی اور موٹر سائیکل کو آگ لگا دیتے ہیں۔ کسی اپنے ہی جیسے جاں بلب مریض کی ایمبولینس کو ہسپتال تک جانے کا راستہ نہیں دیتے۔

اے قائد تیرے دیس کا کیا حال سناؤں

لہولہان پاکستان روتے روتے سکڑتا گلوب میں واپس سماتا جا رہا تھا۔ میں نے رخ قائداعظم کی طرف موڑا تو وہ غمناک حالت میں تصویر میں سمٹ چکے تھے اندر آسکتے ہیں؟ کی آواز نے مجھے چونکنے اور دروازے کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اسکول کی اساتذہ آفس میں داخل ہو رہی تھیں۔ میں آنکھوں میں آئی نمی پونچھتے انھیں دیکھنے لگی۔ وہ چینی، سویاں، سوجی، کپڑے اور دیگر سامان میرے سامنے میز پر رکھتی جا رہی تھیں۔ یہ کیا ہے؟ میں نے حیرانی سے انھیں دیکھتے ہوئے پوچھا: ''یہ سب ان کے لیے ہے جو عید کی خوشیاں نہیں خرید سکتے۔ مسز کوثر نے جواب دیا۔

یہ کپڑے ان طالبات کے لیے ہیں جو عید پر نئے کپڑے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتیں، مسز ولایت نے مزید وضاحت کی۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر السلام علیکم ہی کہا تھا کہ دوسری طرف ظفر خوشی سے بولا میڈم کمال ہو گیا پاس شدہ بجٹ بغیر مٹھائی کے مل گیا۔

کیا واقعی؟ میں نے دوبارہ یقین دہانی چاہی۔

جی ہاں واقعی۔ اس نے جواب دیا۔

میرے ریسیور رکھتے ہی مسز شکیلہ اخبار پر نظریں جمائے بولنے لگیں واہ! پاکستان ڈرون حملوں کے خلاف سلامتی کونسل میں معاملہ اٹھانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔''

اور یہ دیکھیں تو مسز رقیہ نے ایک اور سرخی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا حکومت کا کہنا ہے لوڈشیڈنگ کا دورانیہ ماہ رمضان سے زیادہ بڑھنے نہ دیں گے۔

اللہ ہم سب کو اپنے اپنے حصے کے کام ایثار و قربانی کے ساتھ مکمل کرنے کی توفیق دے۔ خصوصاً ہم اساتذہ کو کہ ہم اپنی طالبات کی ایسی تربیت کریں کہ وہ کل کو ایک بہترین قوم تشکیل دے سکیں۔ ایک ایسی قوم جس میں صبر و تحمل ہو، رواداری ہو اور وہ ایثار کر کے دوسروں کے ساتھ بھلائی کر سکیں، مسز شبنم نے نم آنکھوں سے دعا کرتے ہوئے کہا:

''آمین کہتے ہی میں نے بے اختیار گلوب میں سمٹے پاکستان کو دیکھا مجھے یوں لگا اس کے لہو کی سرخی لہلہاتے سبزے میں تحلیل ہو رہی ہے۔''

اور یہ کتنی خوشی کی خبر ہے ناں! مسز ام کلثوم کی پرجوش آواز خیال کی وادی سے حقیقی دنیا میں کھینچ لائی، وزیر داخلہ نے کہا ہے عید کے بعد سب سیاسی جماعتوں کے سربراہ مل کر زیارت ریذیڈنسی کی دوبارہ تعمیر کا سنگ بنیاد رکھیں گے، مجھے یوں لگا جیسے قائداعظم تصویر سے نکل کر میرے قریب آئے ہیں میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا:

''اگر یہ جذبہ سلامت رہے تو یہ وطن بھی سلامت رہے گا۔ میرے بچو! اگر کسی قوم کے اساتذہ کو ان کے فرائض یاد ہوں اور ان کی ادائی کے لیے اپنے حقوق تک قربان کرنے کو تیار ہوں تو اس قوم کو کوئی تباہ نہیں کر سکتا۔ جس قوم کو ایمان، اتحاد، تنظیم کا سبق یاد دلانے کے لیے اساتذہ جاگ رہے ہوں اس قوم کے مقدر سو نہیں سکتے۔''

پاکستان میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کا قیام

پاکستان کے پہلے اردو کالج میں آج بھی خصوصی طور پر پاکستانیات کا درس دیا جاتا ہے۔

ایجوکیشن یونیورسٹی ملک بھر میں پی ایچ ڈی ان ایجوکیشن کی ڈگری ایوارڈ کرنے والی پہلی یونیورسٹی ہے۔

انتخاب: اُم حبیبہ

پہلا اردو کالج

پاکستان کا پہلا اردو کالج ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے 1949ء میں قائم کیا۔ جو یکم ستمبر 1972ء تک انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام چلتا رہا۔ 1972ء میں اسے سندھ حکومت کی تحویل میں دے دیا گیا۔ یکم مئی 1975ء کو وفاقی حکومت نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ ایک وفاقی بورڈ آف گورنرز کی تشکیل کی گئی۔ یہاں آٹھ ہزار طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کالج میں تین مجالس ہوتی ہیں۔ صبح 9 بجے سے رات 9 تک، مسلسل بارہ گھنٹے تدریس ہوتی ہے اس وقت کالج میں انٹر فنون، بی اے فنون، انٹر کام، بی کام، ایم اے، ایل ایل ایم کی تدریس اردو میں ہوتی ہے۔ اس کالج میں خصوصی طور پر پاکستانیات کا درس دیا جاتا ہے۔ اساتذہ کی تعداد 150 ہے۔ قومی زبان میں ذریعہ تعلیم کا یہ سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس کالج کا اپنا شعبہ تصنیف و تالیف ہے جس نے قومی موضوعات پر کتابیں شائع کیں۔ 1978ء میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اردو کالج میں ایل ایل ایم کی تدریس کا آغاز کیا گیا۔

پہلی فاصلاتی یونیورسٹی کا قیام

پاکستان کی پہلی فاصلاتی یونیورسٹی کا قیام 1974ء میں پارلیمنٹ کے ایکٹ xxxix کے ذریعے عمل میں آیا۔ اس کا مقصد لوگوں کو گھر بیٹھے تعلیم کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ اس پیش کش سے وہ لوگ خاص طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو کسی وجہ سے اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکے

لیکن وہ اپنی تعلیمی استعداد کو بڑھانے کے خواہش مند ضرور ہیں۔ یونیورسٹی کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس کا تعلق کسی خاص علاقے سے نہیں۔ اس کے دائرہ کار میں پورا پاکستان آجاتا ہے۔ اس وفاقی یونیورسٹی میں پاکستان کے کسی بھی خطے میں رہنے والا شخص داخلہ لے سکتا ہے بشرطیکہ وہ مطلوبہ معیار پر پورا اترتا ہو۔

یونیورسٹی اپنا تعلیمی پروگرام مندرذیل چار شعبوں میں پیش کرتی ہے۔ 1۔عمومی تعلیم، 2۔عملی و فنی تعلیم، 3۔تربیت اساتذہ، 4۔اعلیٰ تعلیم و تحقیق۔

زرعی، عملی، فنی اور عمومی تعلیم کے مختلف سطح کے کورس سال میں دو مرتبہ بہار، خزاں سمسٹر میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک سمسٹر کا وقت مطالعہ اٹھارہ ہفتے ہوتا ہے۔ آخری امتحان اس کے بعد لیا جاتا ہے۔ بغیر کریڈٹ کے زرعی کورس امتحان سے مستثنیٰ ہیں۔ انٹرمیڈیٹ، بی اے، بی ایڈ اور ایم فل کے کورس کرائے جاتے ہیں۔ انٹر اور بی اے کی سطح کے آٹھ مکمل کورس یا اس کے مساوی کورسوں کی کامیاب تکمیل لازمی ہے۔ کل چار سمسٹر ہوتے ہیں۔ ایک سمسٹر میں زیادہ سے زیادہ دو مکمل کورسوں یا اس کے مساوی کورسوں میں داخلہ لیا جا سکتا ہے۔ نصف کورس ایک مکمل کورس کے برابر تصور کیے جاتے ہیں۔ انٹر، بی اے (عمومی) اور ایم فل کے علاوہ بی کام، انٹرنیشنل مارکیٹنگ، پاپولیشن سٹڈیز، بی اے، ہوم اکنامکس کے کورس بھی مکمل کرائے جاتے ہیں۔

ماڈرن لینگویجز کی پہلی قومی یونیورسٹی

29 مئی 2000ء کو صدر پاکستان محمد رفیق تارڑ نے اسلام آباد میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز کے قیام کا آرڈیننس جاری کیا۔ اس یونیورسٹی میں تعلیم کے علاوہ تحقیقی سہولت بھی مہیا کی گئی ہے۔ صدر پاکستان اس یونیورسٹی کے چانسلر ہوتا ہے، ملک اور بیرون ملک متعدد کیمپس کالج اور ادارے قائم کرنا بھی اس کے منشور کا حصہ ہے۔

پہلی بحریہ یونیورسٹی کا قیام

7 فروری 2000ء کو صدر پاکستان محمد رفیق تارڑ نے بحریہ یونیورسٹی کے قیام کا آرڈیننس جاری کیا۔ صدر پاکستان اس کے چانسلر مقرر ہوئے۔ بحریہ یونیورسٹی کے تحت اسلام آباد اور کراچی میں بحریہ انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ اینڈ کمپیوٹر سائنسز، کراچی میں نیول اکیڈمی، لاہور میں نیول وار کالج، کراچی میں انسٹی ٹیوٹ آف پروفیشنل سائیکالوجی، اسلام آباد اور کراچی میں بحریہ کالج قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ یونیورسٹی کا صدر مقام اسلام آباد قرار پایا۔ بحریہ یونیورسٹی ایک خود مختار ادارہ ہے اور اس کا بورڈ مذکورہ اداروں کے علاوہ ملک میں کسی بھی مقام پر کوئی اور انسٹی ٹیوٹ یا کالج قائم کرنے کا مجاز ہے۔

حیوانیات کی پہلی یونیورسٹی کا قیام

12 جون 2002ء کو لاہور میں پاکستان کی پہلی وٹرنری اور اینمل سائنس یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا افتتاح گورنر پنجاب خالد مقبول نے کیا اور اس کی استعداد کار میں اضافہ کے لیے 20 کروڑ روپے کی خصوصی گرانٹ دی۔

جب کہ اگلے مالی سال کے دوران وٹرنری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اپ گریڈیشن، پالتو جانوروں کے سنٹر کے قیام اور طلبا کے لیے بسوں کی فراہمی کی خاطر ساڑھے 6 کروڑ روپے کے فنڈز مختص کیے گئے تھے۔ گورنر پنجاب خالد مقبول نے ڈاکٹر منظور احمد قریشی کو لاہور یونیورسٹی آف وٹرنری اینڈ اینمل سائنسز کا پہلا وائس چانسلر مقرر کیا۔ انھوں نے واشنگٹن اسٹیٹ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اور لاہور کے ویٹرنری کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں وہ کئی برسوں سے محکمہ لائیو اسٹاک کی بہتری کے لیے نصاب اور پالیسی مرتب کرنے میں معاونت کرتے رہے ہیں۔

لاہور میں پہلی ایجوکیشن یونیورسٹی کا قیام

12 جولائی 2002 کو پنجاب کابینہ نے لاہور میں پاکستان کی پہلی ایجوکیشن یونیورسٹی کے قیام کے مسودہ قانون کی منظوری دی۔ گورنر پنجاب خالد مقبول کی صدارت میں پنجاب کابینہ کے اجلاس کے دوران صوبے کے تمام اضلاع میں موجود 36 ایلیمینٹری ٹیچرز ٹریننگ کالجوں، 6 کالجز آف ایجوکیشن اور پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف ٹیچرز ایجوکیشن کے علاوہ پروفیشنل ایجوکیشن اسسمنٹ سنٹرز کو اپنی نوعیت کی اس واحد یونیورسٹی کے ساتھ منسلک کرنے کا فیصلہ کیا۔ یونیورسٹی آف ایجوکیشن پنجاب کے مین کیمپس کے طور پر ڈائریکٹوریٹ آف اسٹاف ڈویلپمنٹ، وحدت روڈ لاہور کی عمارت کا انتخاب کیا گیا ہے جب کہ جدید تدریسی طریقوں کے مطابق مختلف پراجیکٹ پر تجرباتی نوعیت کے تدریسی ذرائع پر تحقیق کے سلسلے میں ایک سو مینوئلز تیار کر لیے گئے ہیں۔ یونیورسٹی ملک بھر میں پی ایچ ڈی ان ایجوکیشن کی ڈگری ایوارڈ کرنے والی پہلی یونیورسٹی ہوگی جہاں صوبہ بھر کے چار لاکھ سرکاری اساتذہ کو اکیڈمک سپورٹ فراہم کرنے کے علاوہ نجی تعلیمی اداروں سے منسلک ایسے اساتذہ کو بھی تحقیقی سہولتیں دستیاب ہوں گی جو پہلے سے ایجوکیشن کے مضمون میں پوسٹ گریجوایشن ڈگری کے حامل ہیں۔ یونیورسٹی آف ایجوکیشن پنجاب میں تدریس کے شعبے سے منسلک ہونے کے خواہش مند عام لوگوں کو ملازمت سے پہلے اور تمام تعلیمی اداروں کے اساتذہ کو ملازمت کے دوران سپیشلائزڈ ٹریننگ کی سہولت دینے کی پابند ہے۔

پاکستان کی کسی یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر کا تقرر

ڈاکٹر عمر حیات ملک پاکستان کے پہلے وائس چانسلر تھے جن کا تقرر 9 ستمبر 1947ء کو جامعہ پنجاب لاہور میں ہوا۔ ڈاکٹر عمر حیات ملک 16 نومبر 1894ء کو سگھاں والی ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ وہ 1940ء میں اسلامیہ کالج پشاور اور 48-1943ء اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے اس کے علاوہ رکن مرکزی اسمبلی ہند (1946) اور نائب صدر پاکستان دستور ساز اسمبلی 1947ء بھی رہے۔ جب کہ انڈونیشیا، جرمنی، جاپان اور بھارت میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔ انھوں نے تحریک پاکستان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حکومت نے تحریک پاکستان میں ان کی خدمات کے اعتراف میں 1988ء میں انھیں گولڈ میڈل عطا کیا اس کے علاوہ حکومت پاکستان نے انھیں ستارہ پاکستان کے اعزاز سے نوازا۔ انہوں نے 28 مئی 1982ء کو پشاور میں وفات پائی۔

بھانبھڑ

ایک نمانی ماں کی آنکھوں کے گہرے گڑھوں میں بہتے آنسوؤں کی داستان
اس کا جگر آری چڑھا تھا اور دوسری بار جدائی کی کٹاری پھر گئی تھی

نجمہ ثاقب

جب مشکی گھوڑی نے ڈھوک نواں لوک کے آر پار بہتے راج بہا کے تنگ موگے کو پار کرنے کے لیے اپنے ٹھوس وجود کو تولا۔ تو دونوں وقت مل رہے تھے اور کچے نیم پکے گھروں سے نکلتا دھواں جھٹپٹے میں مدغم ہوگیا تھا۔

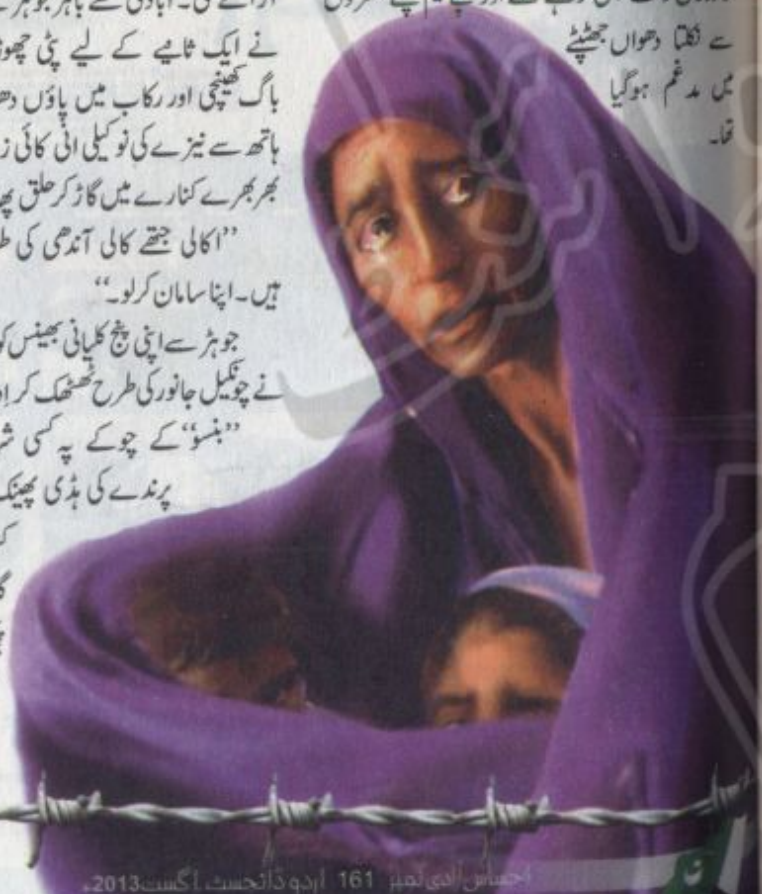

گھوڑی نے کنوتیاں دبائیں اور اگلے سموں کو اوپر اٹھا کر فضا میں تیری۔ ایک ہی چھلانگ میں موگا عبور کرتی ''وڈے لوک'' کی سیدھی سطیر سڑک پہ گرد اُڑانے لگی۔ آبادی سے باہر جوہڑ کے کنارے گھوڑ سوار نے ایک ثانیے کے لیے پٹی چھوڑی۔ پھر جھٹکے سے باگ کھینچی اور رکاب میں پاؤں دھرے دھرے بائیں ہاتھ سے نیزے کی نوکیلی انی کائی زدہ اتھلے پانیوں کے بھر بھرے کنارے میں گاڑ کر حلق پھاڑ کے بولا:

''اکالی جتھے کالی آندھی کی طرح چڑھے آرہے ہیں۔ اپنا سامان کرلو۔''

جوہڑ سے اپنی پنج کلیانی بھینس کو باہر ہانکتے کرم دین نے چونکیل جانور کی طرح ٹھٹھک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''بنسو'' کے چوکے پہ کسی شریر بچے نے مردہ پرندے کی ہڈی پھینک دی تھی۔ وہ جوہڑ کنارے چلتی پھرتی گایوں کے پیچھے پیچھے زمین سے اُن کا گوبر سمیٹتی پھر رہی تھی۔ جب ''دھرم شالہ'' کے مہا

پنڈت نے گھوڑ سوار کی بات سن کر پانی سے بھری گڑوی اور دودھ کا تاملوٹ جوہڑ کے داہنی جانب اشنان گھاٹ کے پتھروں پہ رکھ دیا۔ اور بولا:

"رام۔ رام۔ سنو گھر بھاگ جا۔ چولہا چکلا پوتنے کی فکر چھوڑ۔ سرداروں کی منڈلی میں "لپاڈگی" ہونے کو ہے جب یہ بات فاطمہ اور محسن کے کانوں میں پڑی۔ تو وہ خوفزدہ ہو کر بڑی گلی میں لٹو کی طرح گھومنے لگے۔

فاطمہ بس اتنی سیانی تھی کہ اُسے گھر کا راستہ آتا تھا اور وہ بہن بھائیوں کو پکڑ کر اندر باہر لا سکتی تھی۔ محمد حسین اتنا چھوٹا، کہ پاؤں پاؤں چلتا تھا اور عام رواج کے مطابق اس کی ماں لمبی قمیض کے نیچے ابھی اسے کچھا نہ پہناتی تھی۔

آناً فاناً پوری گلی آوازوں کے شور سے بھر گئی۔

سِکھ آ گئے۔ سِکھ آ گئے۔

گھوڑی والے نے چند قدم آگے جا کے باگ دوبارہ کھینچی۔

اور پیچھے منہ کر کے بولا:

ڈنگہ شہر سارا جلا دیا گیا۔ چیلیا نوالہ سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔

بیچ کے سارے گاؤں کٹ گئے ہیں۔ اُدھر بیلہ لاشوں سے اٹا پڑا ہے۔

جس کے ہاتھ میں جو آیا۔ لاٹھی، ڈنڈا، بلم، کرپان، کلہاڑا اٹھا کر میاں جی کے گھر کی طرف دوڑے۔ فاطمہ اور محمد حسین پھوپھی جی کو مراثیوں کے گھر چارپائی تلے چھپے ملے۔ وہ انھیں بغل میں داب گھر پہنچیں۔ تو صحن عورتوں اور مردوں سے اٹا اٹ تھا۔

اُدھر "دھرم شالہ" میں غیر مسلموں کا خفیہ اجلاس بلایا گیا۔ گھنٹہ آدھ اندر جانے کیا کھد بُد ہوتی رہی۔

بالآخر دروازہ کھلا اور سب سے پہلے پنڈت بھجن لعل باہر نکلے۔ کھچڑی بالوں والی چتکبری چٹیا ان کی پشت پر مرے سانپ کی طرح ڈھیلی پڑی تھی۔ پیچھے چلتے "پریتما" کے بوسیدہ گالوں پر آنسوؤں کا تار سا ٹوٹ رہا تھا۔ پریتما کے پیچھے "جگت رام" اُس کے پیچھے "لبھو" پھر "ہری سنگھ" اور اس کے پیچھے ہندو، سِکھ جاتی کے مردوں عورتوں کا ٹھٹ جلوس کی شکل میں چلتا مرکزی جامع مسجد کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔

پنڈت بھجن لعل نے مسجد کی دہلیز پہ ایک پاؤں اندر اور دوسرا باہر رکھا اور نعرہ مار کے بولا:

مولوی صاحب۔ کلمہ پڑھائیے۔ ہم پاک ہونے آئے ہیں۔

"بنسو" کے ہاتھ ابھی تک گوبر سے سَنے ہوئے تھے۔ وہ موت کے گلیارے میں بھی چوکا پوت کے پاک کر آتی تھی۔

پھر عشاء کی نماز پہ بھرے صحن کی مسجد میں مولوی صاحب نے کلمہ پڑھایا اور سب سے پہلے کلمہ پنڈت جی نے پڑھا۔ پھر سب سے عمر رسیدہ جگت رام نے پڑھا۔ پھر ملگجی آنکھوں اور کالے کیسوں والے کرتار سنگھ نے پڑھا۔ پھر سکھے نے پھر پرنیم نے زیر لب کلمہ دُہرایا۔ اس کے بعد جب بجن سنگھ کی باری آئی اور مولوی صاحب بولے۔ کہو۔ "میں گواہی دیتا ہوں۔ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔" تو بجن نے تن کر پھریری لی۔

اور اپنے تھن متھے ہاتھوں سے مسجد کے دروازے کو پکڑ کر لمحہ بھر کے لیے چپ کھڑا رہا۔ پھر اپنے خشک لبوں پہ زبان پھیرنے لگا۔ نمازیوں میں وزیر علی سجنے کا سنگی تھا۔ گرمیوں کی شاموں میں اُس کے ساتھ گنگا کھیلتا

اور سردیوں میں شیر گرم پہ شرطیں بدتا۔ اس نے اپنے ساتھی نمازی کے کندھے پہ ہاتھ مارا اور ٹھٹھا لگا کے بولا۔ بجن کا کلمہ پڑھنا ایسا ہی ہے۔ جیسے عربی فارسی میں بھاشا کا ٹانکا۔

بجن سنگھ نے منہ میں جمع کڑوا پانی باہر تھوکنے کی بجائے ایک گھونٹ میں اندر اتارا اور اپنی گیرو رنگی پگڑی سے چہرہ پونچھ کے کڑک کے بولا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

مولوی صاحب نے باقی لوگوں کی طرح انھیں بھی میاں جی کے گھر کی طرف دھکیل دیا۔ اس رات کوئی نہ سویا۔ مرد لمبی لمبی چھڑیوں پہ جلتی شمعیں لے کر گلیوں میں پہرہ دیتے رہے اور عورتیں اینٹیں، روڑے جمع کر کے چھت پہ بیٹھی بنسو، تارو اور ''کلونت کور'' جیسی نو مسلمات کو نماز، روزے کے مسائل بتاتی رہیں۔

یہ رات آنکھوں میں کٹی اور اکالی جتھہ شاید راستہ بھول بیٹھا کہ ممکنہ خون ریزی رک گئی۔ لوگ بکھر نکھر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے تو شیدے ماچھی، موجو نائی اور لوہاروں کے دو تین لڑکوں نے مانگے تانگے کی نیزوں کو ایڑ لگائی اور براستہ چیلیانوالہ ڈنگہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے ویران اور خاموش پڑے تھے۔ پگڈنڈیاں اور کچی سڑکیں چپ چاپ لیٹی تھیں اور کناروں پہ اُگے چھوٹے موٹے خود رو پودے اُچک اُچک کر مسافروں کی راہ تکتے تھے۔ کبھی آہستہ، کبھی تیز، کبھی دُلکی چال چلتے وہ چیلیانوالہ پہنچے۔ شیر سنگھ جرنیل اور انگریزی فوج کے تاریخی مرن گھاٹ پہ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکے۔ شیدے ماچھی نے چوڑے خاکستری پتھروں سے بنی چوکھنڈی کے دروازے پہ کھڑی پرانی ''بوڑھ'' کی شاخ سے گھوڑی کی رسی اٹکائی اور زمین پہ گری لال لال ''گولوں'' کو پاؤں سے روندتے ہوئے یادگاری مینار کی پانچویں سیڑھی پہ چڑھ کے جنوب مشرق کی جانب نظر دوڑائی۔ اور بڑھک مار کے بولا ''دیکھ یارو! ڈنگہ بھانبھڑ بنا ہوا ہے۔ آگ کے شعلے یہاں تک نظر آرہے ہیں۔

تینوں، چاروں دوستوں نے اس کی تقلید میں سیڑھیوں کی جانب زقند بھری۔ پھر اُچک کر دوبارہ گھوڑوں کی پشتیں آباد کرتے ہوئے آسمان سے باتیں کرتے شعلوں کی جانب جانوروں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔

ڈنگہ جیسا بڑا اور تاریخی قصبہ فتح ہوئے تیسرا دن تھا۔ جب گاؤں میں پہلا مہاجر داخل ہوا۔ شیدا ماچھی ڈنگہ سے غنیمت میں دو بچے لایا تھا۔ دونوں شیر بچے تھے۔ مگر سہمی کبوتری کی طرح غٹرغوں تھے۔ اس کی ماں نے انھیں دائیں بائیں ٹھونک بجا کے دیکھا اور ناک بھوں چڑھا کے بولی ''لو جی اور دیکھو! دوسرے تو سونے کی پوٹلیاں اور چاندی کے توڑے لائے۔ بیل، گائے، بھینسیں ہنکاتے آئے اور نہیں تو برتن بھانڈے اور چارپائیاں ہی اٹھا لائے اور یہ کیا لے کے آیا ہے۔ ایسی سوغاتیں تو ادھر بھی بہت تھیں۔''

شیدا صحن میں آسمان تلے لیٹا دو روز پہلے کی مہم کا مزہ لے رہا تھا۔ آنکھیں موندے موندے بولا ''اینٹ، پتھر، لوہا، فولاد بندے کا بدل نہیں ہے۔ بات تو تب بنتی ہے جب جگر آوی چڑھے۔ پھر اس پہ جدائی کی کٹاری پھرے۔ ہم یاروں کے یار اور دشمنوں سے دشمنی نبھانے والے ہیں۔''

تو دشمنیاں نبھاتا رہ اور میں ادھر ان کا گوہ موت اٹھاتی رہوں گی۔ اس کی بوڑھی ہڈی بیٹھے بیٹھے چٹخی تو شیدا تلخ ہو کے اٹھا اور دونوں کو آگے لگا کے میاں جی کی

دہلیز پہ چھوڑ گیا۔ رات کو بے جی نے فاطمہ اور محمد حسین کے سامنے سالن کی کٹوری رکھی تو دوسری ان دونوں بہن بھائیوں کے سامنے رکھ کے بولیں: ''لو بسم اللہ کرو! اللہ کا نام لے کر کھاؤ۔''

لڑکا بمشکل تین سال کا ہوگا۔ بھوکا تھا یا سالن کی مہک نے اس کی اشتہا کو انگیز کیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے بوٹی اٹھائی اور منہ میں ڈال کر اسے کچلنے لگا۔

لڑکی نے کہنی سے اسے ٹہوکا مارا اور کسمسی آواز میں بولی ''ہم باہمن ہیں پریتو! ہم ماس نہیں کھاتے۔ کل جگت بے جی نے تھالی پرے سرکائی اور آلو کی بھجیا کو تڑکا لگا کے باہر کا دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ جہاں سے پہلا مہاجر خاندان اندر داخل ہوا۔ یہ غلام محمد روہتکی عرف گاما تھا۔ اس نے کھدر کا مٹی مٹی تہبند اور پرچونسی کا اٹنگا کرتا پہن رکھا تھا۔ اور سر پہ کالے رنگ کا لوہے کا ٹرنک اٹھا رکھا تھا۔ جو زمین پہ دھرنے سے بجا تو اندازہ ہوا کہ اندر بالکل خالی ہے۔ اس کے پیچھے عین اس کے قدموں پہ چلتی ''بیگماں'' تھی۔ جس کے پہلو میں تن کے دو جوڑے گٹھڑی کی صورت بندھے لٹک رہے تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں ڈھیلے بن میں دہشت زدہ ہرنی کی طرح ناچ رہے تھے۔ ان کے عین نیچے ناک کے متوازی اندر کو دھنستے گوشت نے دو کھائیاں سی بنا دی تھیں۔ جن میں آنسویوں رواں تھے۔ جیسے راج بہاسے پانی نکل نکل کر موگے میں رواں ہو جاتا ہے۔

اس نے محمد حسین اور فاطمہ کو دیکھا۔ پھر پریتو اور اس کی پنج سالہ آپا پہ نظر کی۔ جو آلو کی بھجیا میں لقمے بنا بنا کر بھائی کے منہ میں رکھ رہی تھی۔ اور چیخ مار کے گٹھڑی ٹرنک پہ دے ماری۔ خالی ٹرنک پھٹے ڈھول کی طرح بج اٹھا۔

''بیگماں'' چیل کی طرح جھپٹی اور دونوں بچوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کے انھیں گود میں بھر لیا۔ محلے ٹولی کے لوگ مہاجرین کی آمد کا سُن کر صحن میں جمع ہو رہے تھے۔ وہ اپنے تئیں انصار کی رسم اخوت نبھاتے کچھ نہ کچھ گھروں سے اٹھاتے آئے تھے۔

کسی نے تھالی میں گڑ کی بھیلی دھری تھی، کوئی اچار کی چار پھانکیں تندوری روٹی سمیت لایا، کسی نے مکئی کے بھنے بھٹے اور کوئی رسیلے گنوں کی ٹیاں۔

بے جی نے ''جی آیاں نوں'' کہہ کے چادر زمین پر بچھا دی، لانے والے سوغاتیں وہاں رکھنے لگے۔

میاں جی نے سب کو مخاطب کر کے کہا ''اللہ خیر رکھے! تو مہاجر بھائیوں کا آنا جانا اب لگا رہے گا۔ یہ نہ ہو کہ شروع کا جوش بعد میں بالکل ٹھنڈا پڑ جائے۔ ہتھ ہولا رکھو بھائیو! پانچ دس بندوں کا رزق تو میرے گھر سے نکل ہی آئے گا۔''

''سنا ہے بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ ٹرینوں کی ٹرینیں کٹی پڑی ہیں۔'' الہ دین نے حقے کے منہنال میاں جی طرف پھیر کے کہا۔

''اللہ سب کا مالک ہے۔ جو ڈالتا ہے، وہ سہارتا بھی ہے۔''

پر جی! بدلہ تو شرع شریعت میں بھی ہے۔ پھر ہمارے ہاتھ کیوں بندھے ہوئے ہیں۔ ہندو سکھ تو ابھی ادھر بھی بہت ہیں۔ وزیر علی نے کسی ممکنہ خیال کے پیش نظر کہا ''چل اوئے! انھوں نے کلمہ پڑھا ہے۔ اپنی ہی بہنوں کے سالو'' لال رنگنے کی بات کرتے ہوئے بے غیرت۔

الہ دین ڈپٹ کے بولا ''تو وزیر علی'' بڑ بڑ کرتا چپ ہو گیا۔

ہوا ہے، ہوا ہے، ایسا بھی ہوا ہے۔ بدلہ لینے

والوں نے بھی اپنی پوری ہمت مار لی ہے۔ شیدا بتا نہیں رہا تھا۔ ڈنگہ بازار لوٹا گیا۔ سکھ، کھتری سب نکل گئے۔ ایک آدھا مارا بھی گیا۔ گھروں میں بھی لوٹ مار ہوتی رہی۔ اسی لوٹ مار کے مال کو بیگماں نے کسی گمشدہ متاع کی طرح سینے سے لگا رکھا تھا اور غلام محمد شیرے پہ گرتی مکھیوں کی طرح بڑھتے ہجوم کے بیچوں بیچ بیٹھا تاسف سے سر ہلا ہلا کے بتا رہا تھا۔

بڑا جلم ہوا ہے جی! بیگماں بھرے بجار، میں ترکاری سبزی خریدتی پھر رہی تھی۔ جب مشکی گھوڑی والا نیزہ لہراتا ناپوناپ بیچ بازار سے گجرا۔ اس نے بتایا بلوہ ہو گیا۔ آگ لگ گئی، مسلمانوں کے محلے بھانبھڑ بن گئے ہیں۔

حاضرین کے کان کھڑے ہو گئے۔ مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔ بھن بھن چہ مگوئیوں میں بدلی اور اونچی آواز میں تبصرے شروع ہو گئے۔

مشکی گھوڑے والا؟

جن تھا یا چھلاوا!

ہر جگہ بلوے کی، ہلہ بولے جانے کی خبریں ہر شخص کی زبان پہ اس کا قصہ۔ یہ ضرور کوئی شیطان کا چیلا تھا جو افواہیں اڑا کر افراتفری پیدا کرنا چاہتا تھا۔ میاں جی نے کہا۔

"افواہ کہاں جی! گاما بولا۔ "سچ تھا، سب سچ تھا۔ بیگماں گرتی پڑتی روتی پیٹتی گھر پہنچی۔ تو گھر کی جگہ راکھ کا ڈھیر تھا اور بچوں کی وہاں جلی ہوئی ہڈیاں بھی نہ تھیں۔

تب سے..... گامے نے تہبند کی ڈب لمبی کھینچ کے آنکھیں پونچھیں۔ اور انگلی سے بیگماں کی طرف اشارہ کر کے بولا "تب سے یہ جھلی بنی ہوئی ہے۔ ہر بچے پہ اپنے بچوں کا گمان کرتی ہے۔

مجمع میں ٹھنڈی سانسیں جھیلی ہوا کی طرح سرسرائیں اور ہاتھ دیدہ و نادیدہ آنسوؤں کو صاف کرنے کے لیے چہروں کا طواف کرنے لگے۔

ادھر ہندوؤں کے محلے پہ راتوں رات جھاڑو پھر گئی۔ فجر کی نماز میں نو مسلموں کی گنتی کی گئی تو آدھے سے زیادہ غائب تھے۔ دن چڑھے عورتیں کھتری بازار سے دال، سبزی اور چھوٹی موٹی روزینہ ضرورت کی لینے گئیں۔ تو کئی گھروں کے دروازے کھلے پڑے تھے۔ اور اندر خالی ڈھنڈار کمرے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔

دوپہر تک خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ کہ کھتری ہم سے ہاتھ کر گئے ہیں۔

دو چار بڈھوں، ایک آدھ غریب غربا گھرانوں کے سوا سب نکل لیے تھے۔

اجی انھیں بھی نکال باہر کریں۔ بلکہ یہیں شمشان گھاٹ بناتے ہیں۔ وید جی کو لہو کا اشنان کرواتے ہیں۔

شیدے، وزیرے اور موجو جیسے جوشیلے نوجوان تو ڈنڈے اٹھا کر تیار ہو گئے۔

کیوں بے بس نہتے لوگوں کا اجاڑ مانگتے ہو۔ میاں جی نے انھیں کہا۔

سہ پہر ڈھلے مہاجروں کے دوسرے قافلے کی آمد نے ہوا کا رخ اس طور بدلا کہ سب لٹے پٹے بے خانماں لوگوں کو انھیں بے آباد گھروں میں لا کے بٹھایا گیا اور انصار ہتھ پنکھیوں سے غم سے نڈھال لہو نچڑتی آنکھوں اور اجڑے پجڑے بدنوں کو ہوا دیتے کوئی چھوٹا موٹا تسلی دلاسہ ہاتھ میں تھماتے کف افسوس ملتے رہے۔

اگر پہلے سے اندازہ ہوتا کہ ہندو ہمارے ساتھ دھوکہ کرنے جا رہے ہیں۔ تو سامان سمیت بیچ کھیت کے دھر لیتے۔ وزیرا منہ سے کف اڑاتا بار بار بازو اوپر چڑھاتا تھا۔ وہ اپنی رگوں میں ابلتی توانائی کے یوں

ضائع ہونے پہ سخت بد دل تھا اور کئی مرتبہ ٹوکا ہاتھوں میں تول کے دیکھ چکا تھا۔

بنیا مر کے بھی ساہوکار ہی رہتا ہے۔ مجال ہے جو ایک جنکا بھی چھوڑ کے گئے ہوں۔ دہائی خدا کی یہ بھی کوئی انصاف ہے۔ ہمارے بھائی اپنی آدھی سانسیں بھی ادھر چھوڑ آئیں اور..... اس کی بات بیچ میں ہی رہ گئی اور لوگوں کی توجہ ایک مرتبہ پھر ہٹ کر اس جانب ہو گئی جہاں دروازے سے روتی پیٹتی خاتون، نڈھال مرد اور دو چار لڑکوں کے سہارے اندر داخل ہو رہی تھی۔

سب کی متاسف نظریں اُن پر جم گئیں۔ موجو بھاگ کر سلور کے کٹورے میں دودھ لے آیا۔

دارے نے پانی کی بالٹی آگے کھسکائی، سرور روٹیوں کی چنگیر کھسکا لایا۔

کہانی وہی گزشتہ سے پیوستہ تھی۔ خاتون کے بچے جلے تو نہیں تھے، بلوائیوں کے ہاتھوں نیزے کی انیوں پہ بھی نہ چڑھے تھے۔ وہ اس کے ہاتھوں سے کھینچے گئے تھے۔

میری بیٹی..... اس کی ہچکی بندھ گئی..... میری جوان مذرا وہ یکدم رک کے بین کرنے لگی۔ انھوں نے اسے میرے ہاتھوں سے، اپنے بھائیوں کے بازوؤں کے درمیان سے کھینچ لیا اور ہمیں نہر پار دھکیل دیا۔

لڑکے آبدیدہ ہو کے ماں کو سنبھالنے لگے۔

بیگماں نے دلدوز چیخ ماری۔ اور دونوں برہمن بچوں کو مرغی کی طرح پروں میں سمیٹ لیا۔

کسی نے ہاتھ پکڑ کر انھیں دھکیلنا چاہا۔ نکالو ان سپولیوں کو، سانپ کے بچے کو سو سال تک دودھ پلاؤ گے، پھر بھی وہ اپنا نہ بنے گا۔

نہیں، نہیں! بیگماں کا استخوانی وجود التجا بن گیا۔ بچے خوفزدہ ہو کر اس کے گلے کا ہار ہونے لگے۔

گاماں، بیگماں اور لوگوں کے درمیان کود پڑا۔ رہنے دو نمانی کو..... جھلی تو پہلے ہی ہوئی پڑی ہے۔ اب کیا جان سے بھی جائے۔

لڑکے جزبز ہو کے پیچھے ہٹے۔ مگر بیگماں کی سسکیاں اس وقت اور تیز ہو گئیں جب شام ڈھلنے لگی اور دو فوجی ٹرک دھرم شالہ سے باہر آ کے رکنے لگے۔ نیچے اترتے فوجی سب مسلمان تھے، ضلع کچہری میں ہندو برادری کی درخواست پہنچی ہے۔ انھیں یہاں حبس بے جا میں رکھا گیا ہے۔ شکر کریں، مسلمان ملٹری آئی ہے، ہندو سپاہی آتے تو ہو سکتا کوئی چھوٹا موٹا فساد ہو جاتا۔

آہستہ روی سے رینگتا ٹرک میاں جی کی ڈیوڑھی پہ پہنچا تو پچھلے حصے میں ننگے فرش پر بیٹھے جٹا دھاری لبھو رام نے دونوں ہاتھ ماتھے پہ رکھ کے سپاہی سے کہا۔

ادھر ہمارے دو بچے ہیں سرکار۔ ایک لڑکا اور لڑکی دونوں برہمن زادے ہیں۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد جب پاک فوج کے جوان دونوں بچوں کو بازیاب کرا کے ٹرک میں سوار کروا رہے تھے۔ تو بیگماں بے پتوار ڈولتی کشتی کی طرح دروازے سے باہر لپکی۔ اس کا بایاں بازو گامے کے ہاتھ میں تھا اور بکھرے بالوں والے سر سے گرتی چادر پیچھے جھاڑو پھیر رہی تھی۔ جب وہ چلتے ٹرک کے پیچھے دوڑی تو چادر اس کے ہوا میں لہراتے بازوؤں سے جھٹکا کھا کر نیچے جا گری اور اس کی ناک کے متوازی اندر کو دھنسے گوشت میں کھائیوں کی طرح گہرے گڑھوں میں آنسوؤں بہنے لگے۔ جیسے نالے سے پانی نکل نکل کے موگے میں رواں ہو جاتا ہے۔

چراغ

اپنی ہی روشنی کے لیے لرزاں و ترساں ایک چراغ کی داستان اسے اندھیروں سے بار بار واسطہ پڑتا ہے

نذیر انبالوی

اندھیرا

آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ بہت جلد یہ اندھیرا مجھ پر غالب آجائے گا۔ یہ اندھیرا میری روشنی کو نگل جائے گا..... مجھے بے نور کردے گا۔ کوئی ہے جو مجھے اس اندھیرے سے بچائے۔ کوئی ہے جو مجھے روشن رکھے..... یہاں کوئی بھی تو نہیں..... سب اپنی ذات کے حصار میں گم ہیں..... کوئی بھی تو نہیں جو میری طرف آئے اور مجھے بجھنے سے بچائے..... میں لمحہ بہ لمحہ بجھ رہا ہوں..... میری روشنی کم ہوتی جارہی ہے..... میرے شناسا چہرے مجھ سے دور ہوتے جارہے ہیں..... تاج وتخت والے اپنے اقتدار کو بچانے کی کوششوں میں مصروف ہیں..... دیس سے آئے ہوئے میری جان کے درپے ہیں۔ مدتوں سے مجھے اندھیروں کے حوالے کرنے کی سرتوڑ کوششیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ اپنے لوگ غدار بنے اور غیروں کے ساتھ مل کر اندھیرے کو اپنے ساتھ لیے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب میرا بچنا بہت مشکل ہے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ تاج وتخت والے بے بس ہوگئے۔ کچھ قید ہوئے، کچھ سولی چڑھا دیئے گئے اور کچھ فرار ہوگئے۔ غدار اور غیر ملکی اپنی کامیابی پر نازاں ہیں۔

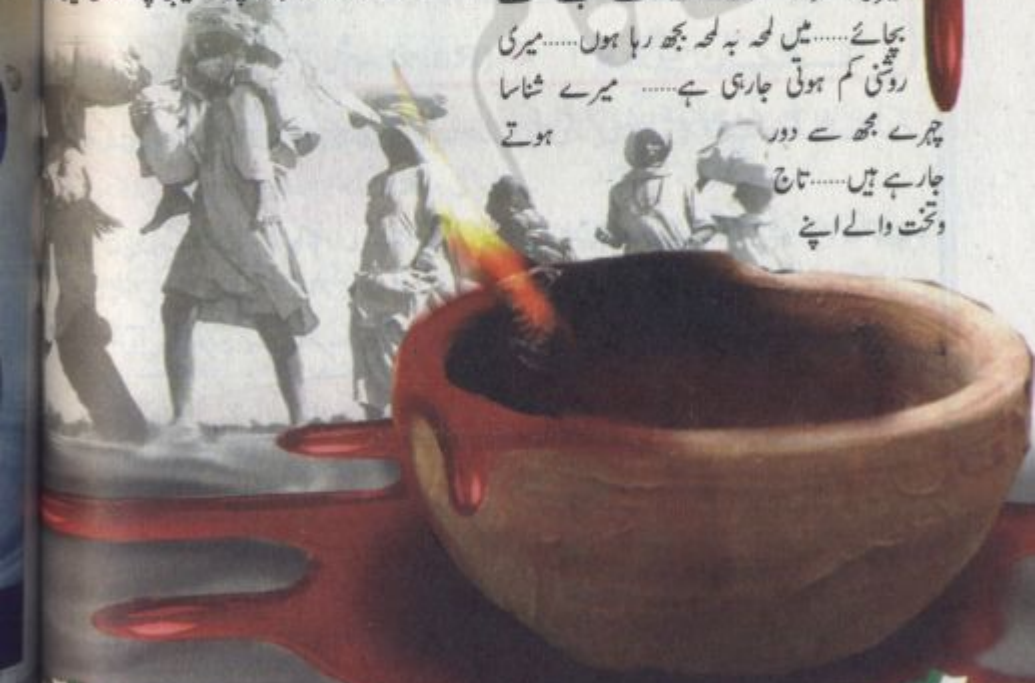

تیز رفتاری کے ساتھ اپنے راستے کی ہر رکاوٹ دور کرتے چلے جارہے تھے اور وہ دن بھی آگیا جب میری روشنی مجھ سے چھین لی گئی۔ مجھے بے نور کردیا گیا۔ اب میرے چہار سو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ گھپ اندھیرا۔ پھر یہ اندھیرا تقریباً ایک صدی تک مجھ پر چھایا رہا۔ اس عرصہ میں میرے مردہ جسم میں جان ڈالنے کی کئی افراد نے کوشش کی، کئی محبت کرنے والے میری جانب بڑھے کہ میرا اندھیرا، اُجالے میں بدل جائے۔ میرے لبوں پر ان کے لیے دُعائیں ہی دُعائیں تھیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ مجھے روشن کرنے کی باتیں ہونے لگیں۔ مجھے روشنی اپنی طرف بڑھتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ گھپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن ہی کافی ہوتی ہے۔ نا اُمیدی کے اندھیرے میں مجھے اُمید کی روشن کرن اُس وقت دکھائی دی تھی جب امرتسر میں دھوبیاں والی گلی میں ماسٹر رب نواز لاہور جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بیگم کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا تھا۔

''مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور جارہا ہوں۔ محمد علی جناح اور دوسرے مسلمان لیڈر اس میں خطاب کریں گے۔ میرے ساتھ اور بھی کئی لوگ جارہے ہیں۔

''جلسہ کب ہے؟'' بیگم نے سوال کیا۔

''پرسوں 23 مارچ کو منٹو پارک میں جلسہ ہوگا، میں اُسی دن شام کے وقت واپس آنے کی کوشش کروں گا، ریاض کا تار آیا تھا کہ وہ بھی کشمیر سے لاہور آئے گا۔

''ریاض بھائی کو امرتسر لے آئیے گا۔''

''اُس کے پاس چھٹی کم ہے، اُس نے لکھا ہے کہ گرمیوں میں وہ بچوں کے ساتھ امرتسر آئے گا، میں لاہور جانے کی تیاریوں کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے صوفی سراج الحق کی طرف جارہا ہوں، مغرب سے پہلے واپس آجاؤں گا۔'' یہ کہہ کر ماسٹر رب نواز گھر سے باہر نکلے تو راجو اور دیا رام ایک دُکان کے تھڑے پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ جب وہ ان کے قریب گئے تو راجو نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''ماسٹر جی! کیا لاہور جانے کی تیاریاں مکمل ہیں؟''

''ہاں..... ہاں..... تم کیوں یہ پوچھ رہے ہو؟'' ماسٹر اس غیر متوقع سوال پر گھبرا سے گئے تھے۔ ''گھر میں ماسٹرنی کو اکیلے چھوڑ کر جاؤ گے؟'' دیا رام نے ماسٹر رب نواز کو معنی خیز انداز میں گھورتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

مطلب یہ ہے کہ حالات خراب ہیں، ماسٹرنی کا اکیلے رہنا درست نہیں، تم جلسہ جلسہ کھیلو، آزادی کے گیت گاؤ..... موج میلہ کرو اور ماسٹرنی اکیلی رہیں..... کتنی بُری بات ہے۔'' دیا رام نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

ماسٹر رب نواز کو ان پر غصہ آرہا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے چل دیے۔ راستے بھر انھیں راجو اور دیا رام کی باتوں کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ صوفی سراج الحق نے انھیں مشورہ دیا کہ بھابھی کو ہمارے گھر چھوڑ دیں یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، یہاں مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اگلے دن ماسٹر رب نواز، صوفی سراج الحق اور مقبول احمد لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ ایک رات انھوں نے شاہ عالمی میں اپنے ایک دوست منظور الٰہی کے ہاں بسر کی۔ 23 مارچ کو وہ جب منٹو پارک پہنچے تو تاحدِ نظر انسانی سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے۔ لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ مجھے گھپ اندھیرے میں اُجالا دکھائی دینے لگا تھا۔ اس جلسے کے صدر قائداعظم محمد علی جناح نے

جب یہ فرمایا کہ ہم ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے ان صوبوں کو ملا کر ایک نیا اسلامی ملک بنانا چاہتے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ہمیں یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ ہم ان صوبوں میں اسلامی حکومت قائم کریں۔ اس فرمان نے تو گویا میرے مردہ جسم میں زندگی کی روح پھونک دی۔ اس جگہ سے روشنی کا سفر شروع ہوا۔ اندھیرا آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ آزادی کی تحریک روز بروز زور پکڑتی چلی گئی۔ لدھیانہ کے ایک گاؤں میں برگد تلے بزرگ بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

''رحمت! کیا دھرتی ماتا تقسیم ہوجائے گی؟ تو شہر رہتا ہے تجھے زیادہ خبر ہے۔'' پنڈت شنکر نے حقے کا کش لیتے ہوئے پوچھا۔

''پنڈت جی! لگتا تو ایسا ہی ہے کہ تقسیم ضرور ہوگی، پچھلے سات سالوں سے مسلمان آزادی کی تحریک چلا رہے ہیں، اب تو گورے بھی قائداعظم محمد علی جناح سے بات کرنے پر راضی ہوگئے ہیں۔'' رحمت نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''کیا تم لوگ بھی چلے جاؤ گے؟'' پنڈت کے بولنے سے قبل بشن سنگھ بولا۔ ہم حالات دیکھ کر فیصلہ کریں گے۔'' رحمت نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''ہم تمھیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے، ہمارے بڑے صدیوں سے اس گاؤں میں اکٹھے رہتے آئے ہیں، ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں، ہمارے درمیان دھرم کی کوئی دیوار نہیں ہے، ہولی، دیوالی پر تم لوگ ہمارے ساتھ ہوتے ہو، عید، شب برات پر ہم آپ لوگوں کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں، یہاں امن ہے، پیار ہے، پھر جدا کیوں ہونا۔'' پنڈت شنکر ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

کافی دیر تک حقے کا دور چلتا رہا۔ رحمت کا بیٹا سجاد اور پنڈت شنکر کا بیٹا دیپک برگد کے پاس ہی آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ سجاد کنویں کے ساتھ کھڑی فصل میں ایسا چھپا تھا کہ دیپک اُس کو تلاش نہ کرپایا تھا۔ وہ مسلسل آواز لگا رہا تھا۔

''سجاد کہاں ہو؟ باہر آجاؤ، میں نے ہار مان لی..... سجاد..... میرے دوست..... میرے سامنے آجاؤ..... مجھے اور تنگ نہ کرو۔''

دیپک کے بار بار پکارنے پر سجاد فصل سے باہر نہ آیا تو دیپک کے ساتھ ساتھ برگد تلے بیٹھے بزرگوں کو بھی تشویش لاحق ہوئی۔ سب نے سجاد کو تلاش کرنا شروع کیا۔ ''رحمت، بشن سنگھ اِدھر آؤ..... سجاد یہاں بے ہوش پڑا ہے۔'' پنڈت شنکر کی آواز مشرقی سمت سے آئی تھی۔ سب لوگ فصل میں گھس گئے۔

''ہائے میرا بیٹا۔ میرا پیارا۔'' رحمت نے بے ہوش سجاد کو اُٹھا لیا۔

برگد نیچے لٹانے کے بعد پتہ چلا کہ سجاد کو پنڈلی کے قریب سانپ نے ڈسا ہے۔ سبھی سجاد کو لیے حکیم انور کے مطب پہنچے۔ مطب کا وقت ختم ہوچکا تھا۔ حکیم صاحب کے گھر کے صحن میں چارپائی پر سجاد بے ہوش پڑا تھا۔ حکیم صاحب نے پوری طرح تسلی کرنے کے بعد کہا۔

''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آپ اسے بروقت میرے پاس لے آئے ہیں، سانپ کا زہر جسم پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوا، میں دوا دے رہا ہوں صبح تک یہ ٹھیک ہوجائے گا۔''

''حکیم صاحب! اس کی بے ہوشی کب ختم ہوگی؟'' بشن سنگھ نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

''سانپ کے زہر کے باعث اس پر غنودگی طاری

ہے، جیسے ہی زہر کا اثر کم ہوا غنودگی کم ہو جائے گی۔'' حکیم صاحب کی باتیں سبھی نہایت توجہ سے سن رہے تھے۔

رحمت کے ساتھ ساری رات پنڈت شنکر، بشن سنگھ اور دیپک بھی پریشان رہے۔ صبح کے وقت سجاد ہوش میں آیا تو سبھی کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

ایک ہفتہ بعد رحمت چھٹی ختم ہونے پر لاہور کے لیے روانہ ہوا تو بشن سنگھ اور پنڈت شنکر اسے پکی سڑک تک چھوڑنے آئے تھے۔

''سجاد کا خیال رکھنا۔''

''پگلے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے، جیسا دیپک میرا بیٹا ہے ویسا ہی سجاد بھی میرا بیٹا ہے۔'' پنڈت شنکر نے رحمت کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

رحمت جب لاہور پہنچا تو آزادی کے حصول کے لیے جلسے جلوس جاری تھے۔ جب آزادی کے متوالے ''لے کے رہیں گے پاکستان،'' ''بن کے رہے گا پاکستان،'' ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' کے نعرے بلند کرتے تو مجھے اپنے جسم میں زندگی کی رمق محسوس ہوتی۔ مجھے ایسا لگتا کہ بس اب روشنی پھیلنے ہی والی ہے۔ اندھیرا ختم ہونے والا ہے۔ آخر وہ تاریخی لمحہ بھی آگیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کو آزادی کی نعمت نصیب ہوگئی۔ میرے اندھیرے ماضی کا حصہ بن گئے۔ اب اُجالا ہی اُجالا میرا مقدر تھا۔ مسلمان بہت خوش تھے۔ آزادی کا اعلان ہوتے ہی ہندوؤں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ مشرقی پنجاب کے شہروں میں ہندوؤں اور سکھوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کردیا۔ ماسٹر رب نواز اور اُن کی بیگم رات کے وقت کچھ ضروری سامان لے کر گھر کی پچھلی سمت سے صوفی سراج الحق کے ہاں جانے لگے تو گلی میں ہُو کا عالم تھا۔ ماسٹر رب نواز آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اُن کی بیگم کلثوم برقع میں تھیں۔ جب وہ گلی سے گزر کر چوک تک پہنچے تو راجو اور دیا رام اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ اُن کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

''کہاں بھاگے جا رہے ہو ماسٹر جی؟'' دیا رام نے خنجر لہراتے ہوئے کہا۔

''وہ ..... وہ..... ہماری تمھاری کوئی دشمنی نہیں ہے..... ہمیں جانے دو..... ہٹ جاؤ ہمارے راستے سے۔'' ماسٹر رب نواز نے جرأت مندی سے کہا۔

''لو بھئی سنو..... ماسٹر کہتا ہے، اس کی ہمارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں، بڑا بھولا ہے ماسٹر، بڑے ڈنڈے مارے ہیں تم نے میری کمر پر، آج ایک ایک ڈنڈے کا بدلہ لوں گا۔ دھرتی ماتا کی تقسیم کا بدلہ بھی لوں گا..... نہیں چھوڑوں گا آج تمھیں.....'' دیا رام نے چلاتے ہوئے کہا۔

''ہمیں جانے دو۔'' کلثوم بولی۔

''ہم تمھیں یہاں سے زندہ نہیں جانے دیں گے، ہم اِس تقسیم کو نہیں مانتے، نہیں مانتے، مار ڈالو ان مُسلوں کو۔'' دیا رام کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ ہندو غنڈے ماسٹر رب نواز اور کلثوم پر پل پڑے۔ چند ساعتوں ہی میں سڑک اُن کے لہو سے سُرخ ہوگئی۔ اُن کی آنکھیں بند ہوتے ہی میری روشنی میں اضافہ ہوگیا۔ بہت دُور تک روشنی ہی روشنی پھیلتی چلی گئی۔

رحمت لاہور میں اپنے بیٹے سجاد اور بیگم رضیہ کے لیے پریشان تھا۔ فسادات کے باعث اُس کے لیے گاؤں جانا ممکن نہ تھا۔ پنڈت شنکر ان کو بشن سنگھ کی حویلی میں لے آیا تھا۔

''بھابھی! تم اپنے بھائی کے گھر میں ہو، یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' بشن سنگھ نے رضیہ کو تسلی دی تھی۔

''جب بھی حالات تھوڑے سے بہتر ہوئے ہم تم دونوں کو ٹرین میں سوار کروا دیں گے، میں نے رحمت کو

تار بھیج دیا ہے، میں نے لکھ دیا ہے کہ تم دونوں بشن سنگھ کی حویلی میں ہو۔'' پنڈت شنکر نے کہا۔

رضیہ نے بشن سنگھ کی بیگم گوری کو بتا دیا تھا کہ اُس نے روزہ رکھنا ہے۔ سحری کے وقت گوری نے رضیہ کے لیے روٹی پکا دی تھی۔ سحری کے بعد نمازِ فجر پڑھ کر رضیہ ابھی لیٹی ہی تھی کہ اُسے لگا کر کوئی دیوار پھاند کر حویلی میں کودا ہے۔ رضیہ کی چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ خیریت نہیں ہے۔ رضیہ نے اُٹھ کر دروازے کی کنڈی چڑھائی تھی۔ سجاد بے خبر سو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ساتھ والے کمرے سے اُسے بشن سنگھ کے بولنے کی آواز آئی۔

''دفع ہو جا یہاں سے۔''

''چاچا! تُو ٹھیک نہیں کر رہا، ایک مُسلے کی بیوی اور بچے کو پناہ دے کر تم نے اچھا نہیں کیا، میرے اتھرے ساتھی حویلی کے باہر کھڑے ہیں، میں نے آواز ماری تو سب حویلی میں اندر آجائیں گے، ہمارے شکار ہمارے حوالے کردے۔'' بشن سنگھ کا بھتیجا تارا سنگھ کرپان لہراتے ہوئے بولا۔

''چلا جا یہاں سے ورنہ کاٹ کے رکھ دوں گا، کوئی لحاظ نہیں کروں گا، جیسے آئے ہو ویسے ہی چلے جاؤ۔'' بشن سنگھ نے چلّا کر کہا۔

یہ گفتگو سن کر رضیہ کا دل خوف کے مارے تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے سجاد پر ایک نگاہ ڈالی اور کھڑکی کی اُوٹ میں ہو کر باہر دیکھنے لگی۔ تارا سنگھ ہاتھ میں کرپان لیے اپنے چچا کو للکار رہا تھا۔ جب بشن سنگھ نے دیکھا کہ تارا سنگھ کسی طرح اس کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تو اُس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دیوار سے لٹکتی ہوئی تلوار کو پکڑ لیا۔ تارا سنگھ بھی مقابلے کے لیے تیار تھا۔ بشن سنگھ نے تلوار لہرائی تو تارا سنگھ غصیلے انداز میں بولا۔

''چاچا! تیرا تو خون سفید ہوگیا ہے، سگے بھتیجے پر تلوار تان لی ہے، میں کمزور نہیں ہوں، میں تمھارا مقابلہ کروں گا، آ کروار..... مار مجھے..... آ..... رک کیوں گئے ہو۔'' یہ کہہ کر تارا سنگھ رضیہ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو بشن سنگھ اُس کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑا ہوگیا۔ رضیہ کو اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ پھر رضیہ کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جو ناقابلِ یقین تھا۔ بشن سنگھ کی تلوار نے تارا سنگھ کو ٹھنڈا کردیا تھا۔ تارا سنگھ کے زمین پر گرتے ہی بشن سنگھ نے رضیہ کو کمرے سے باہر آنے کے لیے کہا۔ گھر کے افراد بھی اب اٹھ گئے تھے۔ گوری نے تارا سنگھ کی لاش دیکھ کر کہا۔

''یہ تو تارا سنگھ ہے۔''

''یہ تارا سنگھ نہیں، ہمارا دشمن ہے، چلو رضیہ تمھارا اب یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں، تارا سنگھ کے ساتھی کسی وقت بھی حویلی میں داخل ہو سکتے ہیں۔ میں تمھیں اسٹیشن تک لے جاتا ہوں، سجاد پتر کو بھی ساتھ لے لو۔'' بشن سنگھ نے رضیہ کو مخاطب کیا۔

کچھ دیر بعد بشن سنگھ اُن کو لے کر اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ سورج نکل آیا تھا۔ جہاں کہیں خطرہ ہوتا وہ فصلوں میں چھپ جاتے۔ آخر وہ اسٹیشن تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ جب تک ٹرین نہ چلی بشن سنگھ وہاں رہا۔

''رحمت کو میری طرف سے دُعا سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ اگر زندگی رہی تو کبھی نہ کبھی ملاقات ضرور ہوگی۔'' پھر اُس نے سجاد کو پیار کیا اور ڈبے سے اُتر آیا۔ میں بھی اُسی ڈبے میں سوار تھا۔ جب سجاد نے آنکھ کھولی تو ٹرین کافی دور جا چکی تھی۔

''امی جان! ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' سجاد نے

آنکھیں ملتے سوال کیا۔

"ہم اپنے وطن جارہے ہیں، پیارے وطن پاکستان۔" "پاکستان کب آئے گا؟"

"بہت جلد ہم اپنے وطن میں ہوں گے۔" رضیہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ٹرین کے رکنے کی دیر تھی کہ سکھوں کے جتھوں نے حملہ کردیا۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ اس حملے سے بہت سے مسلمان مرد اور عورتیں شہید ہوئیں۔ سکھ نہتے مسلمانوں کو خون میں نہلا کر قہقہے لگا کر اپنی خوشی کا اظہار کررہے تھے۔ سجاد کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کو شہید کردیا گیا تھا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک سکھ کی اُس پر نگاہ پڑی تھی۔ وہ سکھ اُس کی طرف بڑھا۔ اُس کو ہوا میں اُچھالا اور نیزے کو نیچے رکھ دیا۔ ایک دل خراش چیخ فضا میں ابھری۔ سجاد کا معصوم جسم نیزے میں پرویا جاچکا تھا۔ جب یہ ٹرین لاہور پہنچی تو رحمت، رضیہ اور سجاد کی خون میں لت پت لاشوں کو دیکھ کر حواس کھو بیٹھا۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ بے گناہ مسلمانوں کا خون، اپنی جان کی قربانی دینے والا ہر مسلمان میری روشنی میں اضافہ کررہا تھا۔ سب چاہتے تھے کہ میں روشن رہوں۔ میری روشنی کو برقرار رکھنے کے لیے سب اپنی جانوں کے نذرانے پیش کررہے تھے۔ آہستہ آہستہ میری روشنی پھیلنے لگی۔ ابتدائی چند سال خاصے مشکل تھے۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ایک بڑھیا مدتوں تک ہر آنے والی گاڑی میں اپنی بیٹی کو تلاش کرتی رہی۔ اُس کی بیٹی صائمہ کو سکھ اٹھا کر لے گئے تھے۔ جو لڑکی بھی ٹرین سے اترتی وہ بڑھیا آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا کر کہتی۔

"میری صائمہ آگئی..... میری صائمہ آگئی، میں اب اپنی صائمہ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔"

یہ بڑھیا ایک دن پلیٹ فارم نمبر 5 پر مردہ پائی گئی۔ وقت اپنی مقررہ رفتار سے چلتا رہا۔ میری روشنی کو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی شکل میں تقسیم کردیا گیا۔ میں بہت رویا، چلایا مگر کسی نے میری بات نہ سنی۔ یہ زخم میرے جسم کی بجائے روح پر لگا تھا۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ میرا یہ زخم تو بھر گیا، مگر اس کا نشان اب تک میرے جسم پر ہے۔ میں جگہ جگہ جاتا ہوں۔ لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ ہر کوئی مجھے بجھانے کے درپے ہے۔ لمحہ بہ لمحہ تاریکی میری طرف بڑھ رہی ہے۔ ویسی ہی تاریکی جو اس سے پہلے بھی مجھے اپنا شکار بنا چکی تھی۔ میں نے ایک جگہ لوگوں کا رش دیکھا تو اُن کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ ایک امتحانی مرکز تھا۔ طالب علم امتحانی پرچہ حل کررہے تھے۔ طالب علموں کے ساتھی ان کی مدد کے لیے باہر کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے ایک کتاب سے صفحہ پھاڑ کر نگران کے ذریعے اپنے دوست تک پہنچایا، میں حیرت میں گم یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سرعام پیسے لیے جارہے تھے۔ مجھے اپنی روشنی کم ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ میں چلتے چلتے اب ایک چوک میں تھا۔ کچھ دیر پہلے وہاں ایک خودکش حملہ ہوا تھا جس کے نتیجہ میں ایک سیاست دان اور دس دیگر لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ حادثے کی جگہ پر کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سڑک کنارے خون میں لت پت لوگ پڑے تھے۔ ایک معصوم بچہ زارو قطار رو رہا تھا۔ اُسے اپنی ماں کی تلاش تھی۔ اُس کی ماں فٹ پاتھ پر مردہ پڑی تھی۔ تاریکی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں گھبرا گیا تھا۔ میں تاریکی سے دور بھاگنا چاہتا ہوں۔ میں نے تیز تیز چلتے ہوئے ایک مسجد میں پناہ لی۔ مسجد میں جمعہ کی نماز ہونے والی تھی۔ مسجد کے گیٹ پر ہر نمازی کی تلاشی لی جارہی تھی۔ اس مسجد میں ایک ماہ قبل بم دھماکہ ہوا تھا جس

سے پچاس نمازی شہید ہوئے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کوئی میرا تعاقب کررہا ہے۔ مجھ سے میری روشنی چھیننے والی ہے۔ میں بے نور ہونے والا ہوں۔ اب میں ایک وسیع میدان میں ہوں۔ جنازے کے لیے صف بندی کی جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد ان چھ لوگوں کی نماز جنازہ پڑھائی جانی تھی جن کو کل شام نامعلوم دہشت گردوں نے اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ امام نے ابھی اللہ اکبر ہی کہا تھا کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ بیس لوگ اپنی جان سے گئے۔ میرے لیے اب وہاں رکنا ممکن نہ تھا۔ میں بھاگتے ہوئے بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ کوئی تھا جو میرا تعاقب کررہا تھا۔ وہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا مگر مجھے اُس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ میں پناہ کے لیے ایک عمارت میں گھس گیا۔ کھڑکی سے کمرے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ دو آدمی ایک فائل پر جھکے ہوئے تھے۔ ایک آدمی نے پین سے ایک لائن کھینچتے ہوئے کہا۔ "لو بھئی سڑک بن گئی ہے۔"

"ہاں سڑک تو کب کی بن چکی ہے۔" دوسرے آدمی نے مسکرا کر کہا۔ "ایسی ہم کئی سڑکیں کاغذوں پر بنا چکے ہیں، اس کام میں تو ہم ماہر ہیں، روپیہ دو، سڑک بنواؤ مگر کاغذ پر، اب اس سڑک کا معاوضہ جلد از جلد مل جانا چاہیے۔"

"اتنی بھی کیا جلدی ہے۔"

"یار! بیوی بچے دبئی شاپنگ کرنے کے لیے جانا چاہتے ہیں، دو ماہ ہوئے وہ وہاں نہیں جاسکے، ہمارے بڑے بھائی کی سنو، وہ اور اُس کی فیملی ہر مہینے دبئی شاپنگ کے لیے جاتی ہے۔" "پندرہ دنوں میں رقم تمھارے اکاؤنٹ میں ہوگی، ابھی ایک پرائمری اسکول بھی بنانا ہے مگر....." "مگر کاغذوں پر۔" یہ کہہ کر دونوں قہقہے لگانے لگے۔ میں غلط جگہ آگیا تھا۔ یہاں بھی تاریکی تھی۔ روشنی کو کھانے والی تاریکی۔ میں اب جاؤں تو کہاں جاؤں۔ کس کو اپنا حالِ دل سناؤں؟ رات کا وقت تھا۔ ایک گارڈ کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ اِسی سناٹے میں دہشت گرد آئے اور راکٹوں سے عمارت پر حملہ کردیا۔ گارڈ نے مزاحمت کی مگر بے سود۔ کچھ ہی دیر میں عمارت کو آگ لگ گئی۔ رات کی تاریکی میں تاریخی عمارت راکھ کا ڈھیر ہوگئی۔ میں بھی قائداعظم محمد علی جناحؒ کی آخری قیام گاہ "زیارت" کی زیارت کے لیے موجود تھا۔ مجھے روشنی سے تاریکی میں لے جانے والے مسلسل میرا تعاقب کررہے ہیں، میری روشنی پر ڈاکہ مارنے والے تیار بیٹھے ہیں۔ اندھیرا آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا ہے، مجھے لگتا ہے بہت جلد یہ اندھیرا مجھ پر غالب آجائے گا۔ یہ اندھیرا میری روشنی کو نگل جائے گا، مجھے بے نور کردے گا۔ کوئی ہے جو مجھے اِس اندھیرے سے بچائے۔ کوئی ہے جو مجھے روشن رکھے..... یہاں کوئی بھی تو نہیں..... سب اپنی ذات کے حصار میں گم ہیں..... کوئی بھی تو نہیں جو میری طرف آئے اور مجھے بجھنے سے بچائے۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ایک نوجوان کے دو مضبوط ہاتھ میری طرف بڑھے۔ ان مضبوط ہاتھوں نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔ اندھیرا دور کھڑا ان مضبوط ہاتھوں کو تک رہا تھا۔ نوجوان نے مجھے محبت بھرے انداز میں تکتے ہوئے کہا۔ "آزادی کا جو چراغ شہیدوں کے لہو سے روشن ہو، وہ چراغ کبھی بجھا نہیں کرتا..... پاکستان کی آزادی کا چراغ بھی کبھی نہیں بجھے گا کیونکہ اِسے لاکھوں شہیدوں نے اپنے لہو سے روشن کیا ہے..... یہ چراغ روشن رہے گا..... تاقیامت روشن رہے گا۔"

خدا کرے اس کی بات اور جذبہ دونوں سچے ہوں!

کیتھارسس

ایک نرالے اطوار والے اعلیٰ حضرت کی داستاں، کچھ لوگوں نے اُس سے بہت بڑی چوری کی توقع باندھ لی تھی

محمد الیاس

تاریکی بہت گہری ہوچکی تھی۔ خالد ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ چودہ کنال پر بنی ہوئی اس قدیم کوٹھی کی باڑ کے ساتھ کتنی ہی دیر تک چکر لگانے کے بعد ذرا دیر کو لان میں ایک بینچ پر بیٹھا رہا اور پھر میں سرونٹ کوارٹرز کے عقب میں بنے چھوٹے سے دھوبی گھاٹ کی منڈیر سے ٹیک لگائے سوچوں میں گم ہوگیا۔ دس سال قبل میں نے راولپنڈی چھوڑ دیا تھا لیکن گزشتہ ماہ خالد نے متعدد بار ٹیلی فون کرکے اور درجنوں پیغامات بھجوا کر مجھے اس سرحدی قصبے میں بلوالیا۔ خالد یہاں دو سال سے

ایک اہم سرکاری منصب پر تعینات تھا۔ دس برس بعد میں اس سے ملا تو اندازہ ہوا کہ اس میں ابھی تک کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ بظاہر وہی بے پروائی یا تجاہل عارفانہ، غیر سنجیدہ انداز اور زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کے جائز و ناجائز ہتھکنڈے۔ میرا ذہن سوچوں میں ڈوبتا چلا گیا اور گزرے ہوئے برسوں کے تمام واقعات ایک ایک کرکے فلم کی مانند میرے ذہن کی اسکرین پر نمودار ہونے لگے۔

خالد کی ہر بات نرالی تھی۔ طور طریقے اور سوچ میں وہ انفرادیت تھی کہ سنیں تو انگشت بدنداں رہ جائیں۔ ہر معاملے میں جواز گھڑا گھڑایا۔ ایسی الٹی منطق کہ پہلے کبھی سنی نہ پڑھی۔ اسی لیے ہم سب دوست اسے ''اعلیٰ حضرت'' کہا کرتے تھے۔ کالج اور ہوسٹل میں وہ سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ پورے بناؤ سنگھار رکھ رکھاؤ اور سج دھج سے رہتا لیکن پیدائشی طور پر ہائیڈروفوبیا کا مریض تھا۔ موسم سرما میں اس کا یہ مرض زور پکڑ جاتا اور وہ مہینوں پانی کے نزدیک بھی نہ جایا کرتا۔ جب کبھی نہانے کا عزم کرتا تو اس روز سارا وقت اسی مہم کی نذر ہوجاتا۔ خاصی مقدار میں گرم پانی دو اقسام کے صابن، ایک اعلیٰ قسم کا ٹائیلٹ سوپ اور دوسرا لال رنگ کا کوئی سا کاربالک صابن، ڈیٹول اور دیگر آلات سے غسل کا اہتمام ہوتا۔ موصوف اپنے نہانے کے عمل کو ''ڈبل غسل'' کا نام دیا کرتے اور فرماتے کہ وہ رعایتاً یہ نام دیتے ہیں وگرنہ ان کے غسل کے اندر کئی غسل پوشیدہ ہوتے ہیں۔

موسم سرما کا زیادہ حصہ وہ بن نہائے بسر کرتے۔ اپنے جسم اور لباس پر مختلف خوشبوئیں اسپرے کرتے اور ازخود تسلیم کرتے کہ نہ نہانے سے جسم سے جو بدبو اٹھتی ہے اسے باڈی اسپرے سے غیر موثر بنایا جارہا ہے۔ دوست نہانے کا مشورہ دیتے اور استفسار کرتے کہ حضرت نہانے میں آخر قباحت کیا ہے تو فرماتے۔ ''میں انسان ہوں کوئی مچھلی یا مینڈک نہیں کہ پانی میں گھسا رہوں۔ کیوں منصب انسانیت سے دست بردار ہوجاؤں؟''

فارغ التحصیل ہونے کے بعد سارے دوست ادھر ادھر بکھر گئے لیکن میرا اور اعلیٰ حضرت کا ٹھکانا راولپنڈی میں ایک ساتھ رہا ہے۔ وہ محکمہ مال میں عوامی اہمیت کے حامل ایک سرکاری منصب پر فائز ہوگئے۔ تنخواہ کے مقابلے میں اپنے معاشرتی مرتبے اور سرکاری رتبے کو برقرار رکھنے کا دشوار مرحلہ درپیش ہوا لہٰذا بغیر کسی حیل و حجت کے نذرانے قبول کرنے کی راہ اپنالی لیکن بڑے ہی منفرد انداز میں۔ ہم جس مکان میں ایک ساتھ مقیم تھے، کوئی سائل یا ماتحت اہلکار کسی حاجت کے لیے حاضر ہوتا اور کچھ ''خدمت'' کرنے کا عندیہ دیتا تو فرماتے۔

''بھئی آپ کی خوشی، جو بھی دینا ہے ہمیں کوئی عذر نہیں۔ اگر کچھ جنس یا مال اسباب کی شکل میں ہے تو اندر کریم سے مل لیجیے اور نقد ہے تو وہاں سامنے کارنس پر بچھے کپڑے کے نیچے رکھ چھوڑیں۔ حرام ہے لہٰذا ہمیں تو اس جہنم کی آگ کو ہاتھ لگانا نہیں۔'' مخاطب کھسیانے پن سے کوئی جواز گھڑنے کی سعی کرتا تو حضرت فرماتے۔

''حضور آپ رشوت کو کسی بھی نام سے پکاریں۔ شراب کو چائے کے پیالے میں ڈال کر پلائیں یا پی لیں اور سُور کے گوشت کا قیمہ سو پانیوں سے دھو کر کریلوں میں بھر کر پکائیں اور کھائیں یا کھلائیں، کچھ بھی پاک صاف ہونے کا نہیں۔ آپ

لولے لنگڑے عذر پیش کر کے خود عاجز ہوں نہ ہمیں فریب دیں۔ بات کچھ ہے اور آپ کیا فرمائے جارہے ہیں۔"

جب رقم خرچ کرنے کا مرحلہ آتا تو اپنے ملازمِ خاص کریم سے کہتے۔

"جس قدر ضرورت ہے وہاں سے اٹھالو۔ اتنے روپے فلاں کو دے آؤ۔ مکان کا کرایہ ادا کردو، اتنے کا ضروری سودا لے آؤ، اتنے تم اپنے گھر بھجوادو اور بقایا حاجی صاحب کی خدمت اقدس میں بذریعہ منی آرڈر روانہ کرو۔"

اپنے والد صاحب کو ہمیشہ "حاجی صاحب" کے لقب سے یاد کرتے۔ ہم دوستوں میں سے کبھی کوئی پوچھتا کہ چچا جان کو رشوت کی کمائی بھجواتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی تو جواب ملتا۔ "جس ماہ صرف تنخواہ گھر بھجواؤں، حاجی صاحب کھونڈا پکڑے خود آن کر گوشمالی کرتے ہیں۔"

چند ایک واقفانِ حقیقت نے از خود ہی ٹاؤٹ کے فرائض سرانجام دینے شروع کردیے۔ ان میں سے میاں صاحب خاص طور پر زیادہ قابل اعتماد ثابت ہوئے۔ لہٰذا زیادہ تر معاملات ان کے ذریعے سے طے ہونے لگے۔ وہ چوہڑ ہڑپال سے کچھ آگے کوہ نور ملز کے قریب ایک آبادی میں رہائش پذیر تھے۔ گرمیوں کی ایک سہ پہر اعلیٰ حضرت ہمیں اپنے نئے نویلے ویسپا اسکوٹر کی پچھلی نشست پر بٹھائے ان کے ہاں چل دیے۔ فرمایا کہ کوئی "معاملہ" طے ہوچکا ہے لہٰذا انہیں اطلاع دینی ہے۔

میاں صاحب سے میری قطعاً کوئی بے تکلفی نہیں تھی۔ وہ بھی اپنے کام سے کام رکھتے۔ مجھ سے ماسوائے سلام دعا اور کسی قسم کی گفتگو کے روادار نہیں تھے۔ اعلیٰ حضرت نے بہ اصرار مجھے ہمراہ لے لیا اور میں رواداری میں انکار نہ کرسکا۔

میاں صاحب کے گھر کے عین سامنے اسکوٹر کو اسٹینڈ پر کھڑا کر کے اعلیٰ حضرت خود برآمدے میں داخل ہوئے جبکہ میں باہر ہی کھڑا رہا۔ برآمدے کے دائیں کونے میں ایک مرغی دبکی بیٹھی تھی۔ پیشتر اس کے کہ اعلیٰ حضرت گھنٹی کا بٹن دباتے، مرغی نے آنکھیں کھول کر کچھوے کی طرح گردن کو لمبا کیا اور ایک بھرپور نظر سے باری باری ہم دونوں کی جانب دیکھا۔ ابھی وہ نیک بخت ہم اجنبیوں کے عزائم کا اندازہ بھی نہ کرپائی تھی کہ اعلیٰ حضرت نے آن واحد میں نصیبوں جلی کو دبوچ لیا۔ ایسے کہ سیدھا ہاتھ گردن پر اور الٹا پروں پر۔ مجال ہے جو ذرا بھی پھڑ پھڑائی یا کوئی آواز نکلی ہو۔ دوسرے ہی لمحے وہ واپس پلٹے۔ ویسپا کے پیٹ میں بنے ایک ڈبہ نما خانے میں مغویہ کو گھسیڑا اور طاقچہ بند کردیا۔ یہ سب کچھ یوں آناً فاناً ہوا کہ میں سوچتا ہی رہ گیا۔ اسکوٹر کو اسٹارٹ کر کے مجھے پیچھے بٹھایا اور واپس چل دیے۔ فرمانے لگے "دیکھو! یہ اطالوی کس قدر ہوشیار اور منصوبہ ساز ہوتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی دو پہیوں والی سواری میں انہوں نے صاحب ذوق اور خوش خوراک حضرات کے لیے معقول گنجائش رکھ چھوڑی ہے تاکہ لذت کام و دہن کے لیے متعلقہ اسباب کی نقل و حمل کا رازدارانہ اہتمام کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

وہ مرغی بھی کچھ عجیب مخلوق تھی۔ کارٹون نما سر اور گردن تو مکمل طور پر گنجی تھی ہی لیکن اس کے نامراد گنج نے گردن سے نیچے پوٹا اور پیٹ بھی کسی قدر ننگا کر رکھا

تھا۔ وہ بھی اس انداز میں گویا کوئی بدصورت عورت حیا کی حدود کو پھلانگتے ہوئے ٹاپ لیس یعنی انتہائی کھلے گلے کا جامہ زیب تن کیے بیٹھی ہو۔ جلد کی رنگت مٹیالی سی جیسے جھلسی ہوئی ہو۔ پر بھسلے اور کالے۔ البتہ بدن خوب بھرا بھرا لیکن سراپے میں قطعاً کوئی کشش نہ تھی۔ عمر باڑی اور نہ ہی ادھیڑ۔ غالباً راکھ میں لوٹ لگائے ہوئے تھی۔ اسے دیکھ کر یوں احساس ہوا جیسے بے باک شوخ زادی بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی ہو اور کوئی اُچکا اسے کالی کٹ کے ساحلی علاقے سے اپلے تھاپتے ہوئے یا کوڑے کے ڈھیر پر ستانے کے دوران اچک لایا ہو۔ زیادہ سہمی بھی نہیں تھی، لگتا تھا جیسے دل ہی دل میں یہ ٹھان چکی ہو کہ اب جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔

میں نے اعتراض کیا کہ ہائی اسکول کے دور کی یہ حرکتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں تو حضرت فرمانے لگے۔

"حضور پند و نصائح کو ایک طرف رکھیں۔ پہلے ہی کون سے حاجی عبدالقدوس ہیں جو اس ایک ننھی منی خوبصورت اور معصوم سی واردات کی پاداش میں گردن زدنی ٹھہرائے جائیں گے۔"

میں نے مغویہ کے بارے میں عذر پیش کیا کہ یہ بہت بدصورت ہے اور نظر بھر کے دیکھیں تو جی متلانے لگتا ہے۔ جھٹ سے بولے۔

"آپ کو کس کم بخت نے یہ کہا ہے کہ اسے نظر بھر کے دیکھیں اور یہ کسی کتاب میں نہیں لکھا کہ ہر مونث کو تھیدی نگاہوں سے دیکھنے لگ جایا کریں۔ آپ نے اس سے نکاح تو پڑھوانا نہیں کہ نین نقش میں کیڑے نکالنے لگ گئے ہیں۔ شکم رسید کرنا ہے تو اس مقصد کے لیے یہ بے چاری سولہ آنے موزوں ہے۔"

ذبح کرنے کے لیے اعلیٰ حضرت نے تمام شرعی لوازمات کو بڑے اہتمام سے ملحوظ رکھا۔ سر پر کپڑے کی ٹوپی اوڑھی۔ چھری کے دستے میں لگی کیلوں کی تعداد کو باقاعدہ گن کر اطمینان کیا۔ پھر اسے خوب رگڑ کر تیز کیا اور قبلہ رخ ہوکر بآواز بلند تکبیر پڑھنے لگے۔ میں نے ٹوکا اور کہا:

"یار یہ کیا ڈراما ہے۔ حرام مال پر تکبیر پڑھ کر اسے حلال کرنے سے تو رہے۔ کرو جھٹکا تاکہ قصہ تمام ہو۔" فرمانے لگے۔

"اجی محترم! چوری کا جرم ہم نے کیا ہے۔ اس میں یہ محترمہ تو بے خطا ہیں اور آپ کیسے شقی القلب ہیں کہ اس معصومہ کو رتبہ شہادت ملنے پر قدغن لگانا چاہ رہے ہیں۔"

اس انوکھی منطق کا بھلا کیا جواب دیا جاسکتا تھا۔ لہٰذا چپ رہا تو وہ خود ہی دوبارہ بولے۔ "آپ جمع خاطر رکھیے، پرہیز کرنے میں کیا امر مانع ہے۔ گھر میں اچار موجود ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ حرام کھا کر اپنا دامن داغدار کریں۔"

اس روز معمول سے کہیں بڑھ کر بھوک محسوس ہونے لگی۔ دل ہی دل میں خود کو سمجھایا کہ آج کے دستر خوان سے مجتنب رہ کر ایمان سلامت رکھا جاسکتا ہے۔ ڈیڑھ کلو سے زائد وزن کی دیسی، تندرست اور پلی پلائی مرغی، کم بخت اپنی زندگی میں جس قدر بدشکل تھی، بھننے کے بعد ایسی اشتہا انگیز چٹ پٹی مصالحے دار مہک بکھیرنے لگی کہ رہا نہ گیا اور بن بلائے مہمان کی طرح لپک کر دستر خوان پر جا بیٹھا۔ بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

"لاؤ میاں! اب کیا مضائقہ ہے۔ جب شرعی تقاضے پورے ہوئے اور حتی المقدور حجت تمام ہوئی تو کفران نعمت کیوں کروں۔ رہا سوال قبل از تکبیر سرزد

ہونے والی لغزش کا تو وہ قادر مطلق بڑا غفور الرحیم ہے۔"

ابھی بھری بھری بوٹی کا ٹکڑا سا نوالہ منہ میں رکھ کے دانت آزمانا ہی چاہا تھا کہ معاً میاں صاحب اندر آن دھمکے۔ اپنی تو روح لرز گئی۔ یوں لگا جیسے مرحومہ مرغی بے بال و پر یعنی بحالت برہنگی پھڑک کر منہ سے باہر آجائے گی اور "کڑ کڑ کڑاک" کا دل خراش نعرہ بلند کرتے ہوئے اپنے مالک سے لپٹ جائے گی۔ درد ناک بین کر کے بھری محفل میں مجھے بھی رسوا کردے گی۔ میری جان نکلی جارہی تھی اور اعلیٰ حضرت معمول سے بھی بڑھ کر شاداں اور فرحاں بیٹھے، میاں صاحب کو دعوت شیراز میں شریک ہونے پر آمادہ کر رہے تھے۔ میاں صاحب بلا تکلف شامل ہوگئے اور مزے لے لے کر کھانے لگے۔ آخری ہڈی چچوڑتے ہوئے بولے۔

"واہ جی واہ! مزہ آگیا۔ بڑا ہنر ہے جی اچھی کوکنگ بھی۔" پھر قدرے توقف سے بولے۔

"ہمارے محلے میں کوئی شیطان وارد ہوتا ہے۔ آج تیسری مرغی بھی کھا گیا۔ خدا غارت کرے۔"

اعلیٰ حضرت فرمانے لگے۔

"میاں جی! کیوں خود کو ہلکان کرتے ہیں۔ ایسی اعلیٰ درجے کی غذا کھانے والا یوں غارت نہ ہوگا جیسے آپ چاہتے ہیں۔ یہ اپنا اپنا مقدر ہے۔ پالتا کوئی ہے اور کھا کوئی جاتا ہے۔"

میاں صاحب رخصت ہو چکے تو مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "قبلہ! آپ کی ہوائیاں کیوں اڑی جا رہی تھیں۔ کھانا بھی ڈھنگ سے نہیں کھایا۔"

میں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا تو بڑے ہنسے اور فرمانے لگے۔

"بھائی میرے! سب مرغیوں کے گوشت کا ذائقہ ایک سا ہوتا ہے۔ آپ خواہ مخواہ خوفزدہ ہو رہے تھے۔ بفرض محال اس مرغی کا ذائقہ اگر منفرد یا مخصوص ہوتا تب بھی ڈرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ قرائن سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ میاں صاحب نے اس سے قبل مرحومہ کو چکھا ہوا نہیں تھا۔ ہاں البتہ اگر متوفیہ کا لباس سامنے پڑا ہوتا تو فکر مندی کی ٹھوس وجہ ہوسکتی تھی۔ جب کہ اس جنت مکانی کی پوشاک مع سری پائے و دیگر اعضاء رئیسہ یا آلات اندرونی ایک خوبصورت پیکٹ کی شکل میں کریم خان لال کرتی کے بس اسٹاپ پر "بھول" آئے تھے۔ جسے کوئی خوش قسمت اڑا لے جا کر گھر میں کھول چکا ہوگا اور قرین قیاس ہے کہ اپنی گالیوں کا اسٹاک اب تک خرچ کر چکا ہوگا۔"

عام طور پر اپنے سائل سے نرم روی اختیار کیا کرتے اور زیادہ کی تکرار سے اجتناب کرتے۔ اک ادائے دلنواز اور شان بے نیازی سے فرماتے: "بھئی! ہم فقیر منش لوگ ہیں، زیادہ کا لالچ نہیں کرتے۔ جو کوئی بہ رضا و رغبت دے گیا بخوشی قبول کرلیا۔" کبھی کبھار کوئی حاجت مند اپنے مطلوبہ کام کی افادیت کے مقابلے میں نذرانہ پیش کرتے ہوئے موصوف کے فقیرانہ اطوار سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ ہی ڈنڈی مار جاتا تو فرماتے۔ "حضور کیوں گناہ گار کرتے ہیں۔ ہم کوئی ولی یا پیر فقیر تو نہیں جو آپ چراغی لے آئے۔ یہاں غریب خانے پر زحمت فرمانے کی بجائے کسی دربار پر حاضری دیں اور یہ حقیر نذرانے ہمارے نام سے نذر نیاز کر دیجیے تاکہ

اس کار خیر کا ثواب ہمارے نامہ اعمال میں درج ہو۔"

جواب شرمسار ہو کر کچھ مزید پیش خدمت کرنے کا وعدہ دیتا تو اعلیٰ حضرت اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے مزید آگے بڑھاتے۔

"دیکھیے جناب! ناجائز کاموں کا اپنا ایک ضابطہ اخلاق ہوتا ہے۔ کچھ روایات ہوتی ہیں جن کی پاسداری فریقین پر لازم ہوتی ہے۔ اس میں بددیانتی نہیں چلتی۔ سو دل چھوٹا کرتے ہوئے ڈنڈی نہ ماریے۔ دوزخی تو آپ اور ہم ہیں ہی۔ آپ عاقبت کے ساتھ ساتھ دنیا تو نہ اجاڑیے۔ حرام ہی کھلانا ہے تو بھلے مانس مقدار تو کچھ معقول کرو۔ ہمیں دوہری مار نہ مارو۔"

تاریکی مزید گہری ہو چکی تھی۔ چودہ کنال رقبے پر پرانی طرز تعمیر کا نمونہ یہ کوٹھی جس میں دور غلامی میں دیار غیر سے آئے ہمارے حاکم رہا کرتے تھے، چاروں اطراف اونچی باڑ اور گھنے درخت، عقبی باغ کے پار آخری کنارے پر خدمتگاروں کے کوارٹروں کی قطار۔ برق انداز، مالی، گن مین، سائیس، خلاصی، خانساماں، دھوبی اور خاکروب کے رہائشی کمروں کے علاوہ ایک اصطبل، بھینس یا گائے کے لیے ایک کمرہ اور دھوبی کے کوارٹر کے آگے چھوٹا سا دھوبی گھاٹ، جس کی منڈیر پر میں بیٹھا پرانی یادیں کرید تا رہا۔

کوٹھی کے آگے چار کنال کا خوب صورت باغیچہ، جس میں پھولوں کی کیاریاں، روشیں، جھولے اور لان، جس میں میرا کوئی دادا یا پردادا، مالی، سائیس یا کسی اور روپ میں خادم کے طور پر کام میں مصروف۔ اندر انتہائی اونچی چھتوں اور موٹی دیواروں میں گھرے ہوئے آراستہ کمرے میں سات سمندر پار سے آیا ہوا میرا حاکم محو استراحت، باہر برآمدے میں اسٹول پر بیٹھا میرا کوئی بزرگ پنکھے کی رسی کھینچ رہا ہے۔

ایک درمیانے درجے کا سرکاری افسر، میرا آقا، ایسے ٹھاٹھ باٹھ اور طمطراق سے میری ہی زمین پر میرے ہی وسائل سے میرے آباؤ اجداد پر حکومت کرتا رہا۔ میری ہی کمائی اور خدمت گزاریاں، اس کی عیاشیاں اور شان و شوکت..... ذلت اور پستی کا یہ عالم، گویا میرا سر اور میرے ہی جوتے۔ میرا خون کھول اٹھا۔ مجھے اس دم چوآسیدن شاہ کی مضافاتی پہاڑی پر بکریاں چراتے ہوئے ایک بوڑھے چرواہے کے الفاظ یاد آگئے۔

"غلامی کے دور میں جب کوئی ترقی کر کے صوبیدار بن جایا کرتا تھا تو لوگ کوسوں دور سے پیدل سفر کر کے اس کے گاؤں جایا کرتے تھے تاکہ اس شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں، جو اتنے بڑے منصب پر فائز ہوا۔ پھر وہ گاؤں "صوبیدار کا پنڈ" کے نام سے مشہور ہو جایا کرتا تھا۔ آج اس سامنے والے گاؤں میں کئی جرنیل، کرنیل اور افسر ہیں۔ میں آجڑی (چرواہا) ہوں تو کیا ہوا۔ وہ سب ہم میں سے ہیں، میرے اپنے ہیں۔"

میری سوچوں کا بنجر پن سچائی کی رم جھم پھواروں میں سیراب ہونے لگا اور میں دوسرے ہی لمحے جل تھل ہوگیا۔ میری نظروں کے سامنے اس بوڑھے چرواہے کا عکس دھندلایا تو کئی معتبر چہرے نمودار ہوگئے۔ بے اختیار میری آنکھیں بھیگ گئیں اور میرے لبوں سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔ "تھینکس گاڈ..... تھینک یو مائی گریٹ لیڈر، تھینک یو ویری مچ۔"

دھوبی گھاٹ کی جس منڈیر پر میں بیٹھا تھا اس

کے ساتھ ہی بنے فرش پر میں قبلہ رو ہوکر اک احساس تشکر سے زیر بار ہوتے ہوئے بے اختیار اپنے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر اس کیفیت میں رہا۔ لیکن مجھے احساس ہوا کہ میرے آنسوؤں نے میرے ہاتھوں اور فرش کے کچھ حصے کو تر کردیا ہے۔

ایک بار پھر میرا ذہن آج رات عشاء کے بعد ہونے والے ہنگامے میں الجھ گیا۔ خالد کی جیپ بڑی بڑی ڈاٹوں والے ڈیوڑھی نما پورچ میں آن رکی تھی جس میں سے پانچ اجنبی اترے۔ خالد انہیں اپنے ہمراہ کمرے میں لے جانے لگا تو اس نے نوواردوں سے میرا تعارف کرانا ضروری نہیں سمجھا بلکہ مجھے اپنے کمرے میں جانے کی ہدایت کی۔ مجھے حیرانی ہوئی، کیوں کہ اس کا یہ طرز عمل خلاف معمول تھا۔ وہ اپنے تمام معاملات میری موجودگی میں طے کرلیا کرتا اور کچھ نہیں چھپایا کرتا تھا۔ اجنبیوں کے بارے میں میرا تجسس بڑھ گیا۔ میں بادل نخواستہ اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن کسی انجانے اندیشے کے زیر اثر پھر باہر آگیا۔ میں کسی نہ کسی طرح معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر ایسا کون سا معاملہ ہے جس میں آج اس قدر راز داری برتی جارہی ہے۔ میرا ذہن بڑی سرعت سے کام کرنے لگا اور فوراً ہی مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ میں کوٹھی کے پچھواڑے سے سیڑھیاں طے کرکے برآمدے کی چھت پر آگیا۔ کوٹھی کے چاروں طرف برآمدہ بنا ہوا تھا۔ اور اس کی چھت کمروں کی بہ نسبت اونچائی میں تین چار فٹ کم تھی۔ تمام کمروں کے روشن دان برآمدے کی چھت پر کھلتے تھے تاہم روشن دانوں میں لگی لکڑی کی چوکھٹیں انتہائی مضبوط اور بھاری تھیں۔ اوپر موٹے آہنی سریے لگے ہوئے تھے اور لوہے کی جالی بھی۔ میں نے روشن دان میں سے جھانکا تو اندر برقی روشنی میں سارا منظر میرے سامنے واضح ہوگیا اور آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ ان میں سے ایک اجنبی نے کرنسی نوٹوں کی بہت سی گڈیاں خالد کے آگے ڈھیر کر رکھی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا؟

”آج تک آپ نے چھوٹے چھوٹے معاملات میں یقیناً تعاون کیا لیکن یہ بہت اہم کام ہے۔ اس کا تعلق میرے کچھ بیرونی دوستوں سے ہے جنھوں نے بہت سوچ بچار کے بعد میری یقین دہانی پر آپ کو قابل اعتماد سمجھا ہے اور رقم بھی منہ مانگی دی ہے۔ ایک بات ذہن نشین کرلیں کہ اگر آپ نے دھوکہ دیا تو میری دوستی بھی آپ کو بچا نہیں سکے گی کیونکہ ایک بہت ہی ماہر اسکواڈ ہماری حفاظت پر مامور کردیا گیا ہے۔ وہ لوگ ہمیں لاوارث نہیں چھوڑتے۔“

پہلے تمھیں کبھی ڈبل کراس کیا گیا جواب خدشہ ظاہر کرنے لگے؟۔ اب تم لوگ چائے پیو تاکہ جلد روانہ ہوا جائے۔ میری جیپ پر سرکاری نمبر پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ میں تمھیں صوبائی دارالحکومت میں تمھاری مطلوبہ جگہ پر چھوڑ کر جیپ کو اسی بتائے ہوئے سروں اسٹیشن پر لے آؤں گا۔ تم فارغ ہوکر واپس میرے پاس پہنچ جانا۔ پینتیس منٹ سے زیادہ نہیں لگنے چاہئیں۔ واپسی اسی جیپ میں ہوگی۔ میں تمہیں سرحدی گاؤں کے پاس چھوڑوں گا۔ اس سے آگے میری ذمہ داری ختم، تم جانو اور تمہارے رینجرز۔“ خالد نے کہا۔

”بالکل ٹھیک“ دو تین افراد نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ایک ساتھ کہا۔

میری ٹانگوں اور جسم کے باقی حصوں سے توانائی یکسر معدوم ہوگئی۔ میں پاؤں کے بل بیٹھا تھا لیکن اپنے جسم کو سہارا نہیں سکا۔ چھت پر مٹی کی لپائی کی گئی تھی اور اس پر کہیں کہیں گھاس اُگ چکی تھی۔ نیچے سے آنے والی بیلوں کی بہت سی شاخیں برآمدے کی چھت سے ہوتی ہوئی کمروں کی منڈیروں تک چلی گئی تھیں۔ کسی انجانے خوف، صدمے، شدید غصے اور نفرت کے ملے جلے جذبات نے مجھے ادھ موا کردیا۔ میرے اندر سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی قوت سلب ہوگئی۔ میں ٹوٹتی سانسوں کے ساتھ بے سدھ ہوکر چھت پر ہی ڈھیر ہوگیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر پڑا رہا۔ تاہم میرے جسم میں بیلوں کی ٹہنیاں اور شاخیں کہیں کہیں چبھنے لگیں تو میرے حواس پھر سے بحال ہونے لگے۔ مجھے سب کچھ یاد آگیا۔

میں عمر بھر جس شخص کو اپنا دوست سمجھتا رہا، وہ دشمن دشمن ہوسکتا ہے۔ میں کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ جس کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو میں نے کبھی زیادہ اہمیت نہ دی تھی وہ تباہی کے سمندر میں غرق ہوتے ہوئے ہمیں بھی اپنے ساتھ کھینچ لے گا۔ چوری کی عرضیاں اور رشوت کا رزق حرام کھا کر کوئی اس قدر بے غیرت بھی ہوسکتا ہے کہ ماں سے غداری کرے۔ یہ منافق انسان میری محبت، دوستی اور خلوص کو دغا دیتا رہا۔ میں اسے معاف نہیں کرسکتا تھا۔

میرے روئیں روئیں میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں اس کے بیڈروم کی طرف چلا گیا۔ جہاں ہمہ وقت لوڈڈ اسٹین گن پڑی رہتی تھی۔ اسی لمحے میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اسی روشن دان میں سے ان کتوں پر گولیوں کی بارش کردوں گا۔ اٹھتے ہوئے ایک بار

یومِ آزادی

یہ وہی دن ہے یارو کہ جس روز ہم
ساتھ قائد کے اپنے ملائے قدم
سبز پرچم پہ نظریں جمائے ہوئے
اپنے سینے سے قرآں لگائے ہوئے
مال و زر چھوڑ کر، بام و در چھوڑ کر
خوں میں ڈوبے ہوئے ہم سفر چھوڑ کر
شہرِ اغیار سے مسکراتے ہوئے
حمد پڑھتے ہوئے نعت گاتے ہوئے
مثلِ بادِ بہاری چلے آئے تھے
آمدِ فصلِ گل کی خبر لائے تھے
یہ وہ منزل ہے جس کے لئے عمر بھر
کارواں کارواں، رہ گزر رہ گزر
ایک پوری صدی روز و شب مستقل
اہلِ فکر و نظر اور اربابِ دل
ہاتھ میں ہتھکڑی، پاؤں میں بیڑیاں
آپ اپنی اُٹھائے ہوئے سولیاں
ہر قدم اک نیا زخم کھاتے ہوئے
ہر نئے موڑ پر سر کٹاتے ہوئے
تنگ و تاریک راہوں پہ چلتے رہے
فاصلے قربتوں میں بدلتے رہے

(شاعر: رحمان کیانی، انتخاب: کلیم اللہ فاروقی، لاہور)

غیرارادی طور پر پھر کمرے میں جھانکا تو مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ دیکھتا ہوں کہ پانچوں اجنبی بے ہوش پڑے ہیں۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں اور پانچوں کی ٹانگیں بھی مضبوطی کے ساتھ کرسیوں سے جکڑی ہوئی ہیں۔ خالد ایک ایک کر کے سب کی کسی ہوئی مشکوں کا اطمینان کر چکا تو اس نے روشن دان کی جانب منہ کر کے آواز دی!

''نیچے آجاؤ مرشد!''

میں ایک برقی کوندے کی طرح لپک کر نیچے جا پہنچا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر وحشت زدہ عالم میں جھنجھوڑنے لگا اور بہت سے سوال کر ڈالے۔ وہ اپنی روایتی مسکراہٹ رکھ رکھاؤ اور لب و لہجے میں بولا۔

''مرشد! یہ دشمن کے ایجنٹ ایک اہم مقام پر تخریبی کارروائی کے لیے مامور کیے گئے تھے ..... (قدرے توقف سے) میں اپنی ماں کے توشہ خانہ سے چوریاں تو کیا ہی کرتا تھا۔ انہوں نے سمجھا شاید میں مادر فروش بھی ہوں۔ مرشد! غلطی تو میری تھی ورنہ لوگ مجھے کیوں بکاؤ مال سمجھتے۔ میں اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو گیا۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے کر پوری قوت سے سینے کے ساتھ پیوست کر لیا۔ اس کے جسم کے اک اک مسام سے سچ اور توبہ کا نور پھوٹ کر میرے مشام جاں میں سرایت کرنے لگا۔ فرط جذبات سے میں خود موم کی طرح پگھل رہا تھا۔

خالد نے آج شاید اسی لیے دونوں ملازمین کو چھٹی دے رکھی تھی کہ یہ پروگرام صیغۂ راز میں رہے۔ ہم دونوں نے مل کر پانچوں تخریب کاروں کو جیپ میں اس طرح لوڈ کیا جیسے غلے کی بوریاں ہوں۔ خالد نے مجھے بتایا کہ یہ معاملہ ایسا نہیں کہ مقامی پولیس کے حوالے کیا جائے، لہٰذا وہ کسی انتہائی حساس ادارے کی طرف جیپ لے کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے مجھے کہہ کر گیا کہ میں چائے کے جھوٹے کپ کھنگال دوں اور تھرماس میں بچی ہوئی چائے ضائع کر دوں۔ اس نے تنبیہہ کی کہ میں کمرے سے باہر نہ نکلوں بلکہ تمام دروازوں کی چٹخنیاں چڑھا کر رکھوں کیونکہ ردعمل کے طور پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ عام حالات میں ایسی بات سن کر میں یقیناً گھبرا جاتا لیکن مجھ میں یہ حیرت انگیز تغیر رونما ہوا کہ محض قلم اور الفاظ کا ایک کھلاڑی ہر متوقع خطرے سے ٹکرا جانے کے لیے خود کو تیار پا رہا تھا۔

نہ جانے کب تک ہاتھوں میں اسٹین گن لیے میں کوٹھی کی باڑ کے ساتھ ساتھ چکر لگاتا رہا۔ تھک کر چور ہو گیا تو لان میں پڑی بینچ پر بیٹھ گیا۔ پچھلی رات کا چاند درختوں میں سے جھانکنے لگا۔ مجھے اس دم یوں لگا جیسے کوئی جوگی انمول سچائیوں کے تحفے اپنے دوش پر اٹھائے سامنے آ گیا ہو۔ سارا ماحول نرم، ملائم اور دودھیا روشنی میں نہا کر چاندی جیسا اُجلا ہو گیا۔ ان ہی لمحات میں ایک بہت تابناک چاند میرے نہاں خانۂ دل کی وسعتوں میں طلوع ہو کر ہر شے کو منور کر گیا جس میں سے اطمینان کی سنہری کرنیں پھوٹ کر میری روح کو جلا بخش گئیں۔ نور کی اس بارش میں حسین مستقبل کی بشارت نے میرے ماتھے پر اک سبک سا بوسہ دے کر سرگوشی کی۔ ''تیرا وطن سلامت رہے گا۔ تا ابد۔''

(راولپنڈی میں مقیم محمد الیاس پاکستان کے نامور افسانہ نگار ہیں)

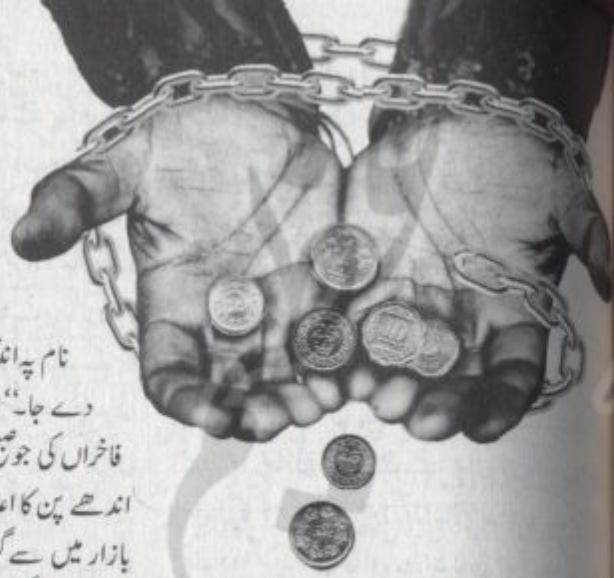

آزادی

ایک اندھی لڑکی کی دل دہلا دینے والی کہانی اس نے اپنی خالی اور بے نور آنکھوں میں آزادی کا ایک مختلف تصور سجا رکھا تھا۔

میرزا ادیب

ہر روز صبح کے وقت جیسے ہی بازار کی دکانیں کھلنے لگتیں اور لوگوں کے آنے جانے سے چہل پہل شروع ہو جاتی، فضا میں بار بار ایک کمزور، افسردہ اور مضمحل آواز گونج اٹھتی "بابا اللہ کے نام پہ اندھی کو دے جا۔ اللہ کے نام پہ اندھی کو دے جا۔"..... یہ آواز فاخراں کی ہوتی۔ اندھی فاخراں کی جو صبح سے شام تک مسلسل چیخ چیخ کر اپنے اندھے پن کا اعلان کرتی رہتی۔ مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ بازار میں سے گزرنے والی ہزاروں آنکھوں میں سے صرف چند آنکھیں ہی ایسی ہوتی تھیں جو اسے دیکھ سکتی تھیں، کیونکہ جب وہ تھک تھکا کر اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ کھینچ کر گھر کے اندر جاتی تھی تو اس کی جھولی میں کبھی تو سات آنے کے پیسے ہوتے تھے، کبھی آٹھ آنے کے اور کبھی ان پیسوں سے بھی کم۔ ہاں تہوار کے موقع پر روپیہ سوا روپیہ ہو جاتا تھا۔ مگر ظاہر ہے پورے سال میں تہوار چار پانچ سے زیادہ نہیں ہوتے اور تین سو چھیاسٹھ دنوں میں سے صرف چار پانچ مرتبہ اوسط آمدنی سے کچھ زیادہ کما لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

جس دن فاخراں کی آمدنی چودہ آنوں سے زیادہ ہوتی اس دن وہ خوشی خوشی چبوترے سے اٹھ کر اندر جاتی کیونکہ کئی ہفتوں کے بعد یہی ایک ایسا موقع ہوتا تھا جب اسے اور گھر والوں کو گوشت سبزی ملتی تھی اور روٹی کے بعد کوئی میٹھی چیز بھی، ورنہ روز روز تو روٹی کے ساتھ دال، خالی سبزی یا مولی ملتی اور روزمرہ

یہ چیزیں کھا کھا کر وہ بیزاری ہو جاتی تھی۔

فاخراں پیٹ کے ہاتھوں بھیک مانگنے پر مجبور تھی۔ صرف اپنے پیٹ کے لیے ہی نہیں، دو اور پیٹ بھی اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے وابستہ تھے۔ ایک پیٹ تو اس کی بڑی بہن زینو کا تھا۔ زینو کی عمر 18 سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی اور اسے روٹی پکانے، سالن تیار کرنے اور کبھی کبھی میلے کچیلے کپڑے دھو ڈالنے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ وہ دن کا بیشتر حصہ چارپائی پر لیٹے گزارتی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نہیں نکل سکتی تھی کیونکہ کئی بار ماں نے اسے ڈانٹ پلائی تھی کہ اگر تو باہر نکلی تو تیری ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ گھر میں کوئی مصروفیت بھی نہیں تھی، یونہی چارپائی پر بے کار پڑی رہتی تھی۔ دوسرا پیٹ فاخراں کی ماں کا تھا۔ فاخراں کی ماں دائم المرض تھی۔ دمے کی پرانی اور مہلک بیماری اس کے جسم کا خون چوستی رہتی تھی اور نحیف و نزار ہڈیوں کا پنجر بنی ہر وقت اپنی چارپائی کے نیچے بلغم کے انبار لگاتی رہتی۔ زینو کو دن میں کئی کئی بار جھاڑو دینی پڑتی اور ہر بار جب بوڑھی ماں کے سینے میں بادل گرجنے لگتے وہ چپ چاپ چارپائی سے اٹھ کر جھاڑو کا رخ کرتی اور جگہ صاف کرنے کے بعد پھر چارپائی پر گر پڑتی۔

فاخراں کی عمر ساڑھے 8 سال سے زیادہ نہیں تھی اور چونکہ قد لمبا تھا اس لیے کچھ زیادہ عمر کی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے دادا نے کبھی بھیک نہیں مانگی تھی۔ اس کے باپ نے کبھی گداگری نہیں کی تھی، اس کی ماں نے کبھی دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے تھے۔ مگر وہ بھیک مانگنے پر مجبور تھی کیونکہ صبح و شام اس کا اور اس کی ماں بہن کا پیٹ کھانے کو مانگتا تھا اور کھانا صرف پھیلے ہوئے ہاتھ ہی لا سکتے تھے۔ روٹی صرف مانگ کر ہی میسر ہو سکتی تھی اور وہ ہر روز بھیک مانگتی تھی۔ فاخراں کے ذہن میں اپنے اور ان دو پیٹوں کا خیال ہر لمحہ ایک نوکدار کانٹے کی طرح چبھتا رہتا تھا اور کبھی کبھی تو یہ خیال رات کو سوتے میں بھی اسے مضطرب کر دیتا تھا۔ اور بے اختیار بہن کے پہلو سے اٹھ کر ہاتھ پھیلا کر وہی الفاظ کہنے لگتی جنھیں ہر روز ہزاروں مرتبہ اپنی زبان سے نکالتی تھی اور جنھیں بار بار دہرا کر اس کا گلا بیٹھ جاتا تھا۔

فاخراں اور اس کے گھر والے تقسیم ملک سے پیشتر فیروز پور چھاؤنی میں رہتے تھے، جہاں اس کا باپ جلد سازی کا کام کرتا تھا۔ اور روزانہ ڈیڑھ دو روپے کما لیتا تھا۔ وہ اگرچہ انپڑھ تھا اور روزانہ پانچ چھ آنے کی افیم اور تین چار آنے کا حلوہ ضرور کھا لیتا تھا تاہم گھر میں کبھی فاقے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ عبداللہ کے ہاتھ میں بڑی صفائی تھی، اسکولوں کے طالب علم نئی جماعت کی کتابیں جلد بندی کے لیے اسی کو دیتے تھے اور سیزن میں تو وہ روزانہ چھ چھ سات سات روپے بھی کما لیتا تھا، یہ خوشحالی کی زندگی نہیں تھی تاہم بری حالت بھی نہیں تھی۔ اچھا خاصا گزارہ ہو رہا تھا۔ مگر فرقہ وارانہ فسادات کے دوران میں ان لوگوں کو لاہور آنا پڑا۔ سوا چار ماہ کیمپ میں رہنے کے بعد انھیں گمٹی بازار کے ایک کونے میں رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا مکان مل گیا اور یہاں ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

عبداللہ نے کسی نہ کسی طرح جلد سازی کا کچھ سامان اکٹھا کر کے اپنے مکان کے چبوترے پر کام کرنا شروع کر دیا، لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس بازار کے رہنے والوں کی زیادہ تعداد مہاجروں کی تھی، ان لوگوں کے سامنے تو صرف زندہ رہنے کی دوڑ دھوپ تھی۔ ایسی حالت میں کتابوں کی طرف کون توجہ کرتا اور کون جلدیں

بندھواتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ چھ دن میں چھ آنے بھی نہ کما سکا۔ اسے پیٹ بھرنے کو کسی نہ کسی طرح روٹی مل گئی لیکن افیون نہ مل سکی۔ اس کی صحت پہلے ہی کافی کمزور تھی اور کمزور ہو گئی اور سات دن بیمار رہنے کے بعد وہ چل بسا۔ اس کی موت کے بعد چند خدا ترس ہمسایوں نے اس بے کس و نادار خاندان کی پرورش کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ چند دن تو گزارہ ہوتا رہا مگر اس کے بعد ان کی توجہ میں کمی آنے لگی۔ اس زمانے میں ہر ایک کو اپنی فکر پڑی تھی، چنانچہ گھر میں فاقے کی نوبت آ گئی۔ اس وقت جسم و جاں کا رشتہ قائم رکھنے کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ اتفاق کی بات ایک دن فاخراں اسی چبوترے پر جہاں اس کے باپ نے کام شروع کیا تھا، بیٹھی گڑ کھا رہی تھی کہ ایک شخص نے اس کے پھٹے پرانے کپڑوں سے یہ اندازہ کر کے کہ وہ بھکارن ہے، اس کے ہاتھ پر دو آنے رکھ دیے..... یہ اس کے اور اس کی ماں بہن کے لیے زندگی کا ایک نیا آسرا تھا، چنانچہ دوسرے دن وہ وہیں ایک ہاتھ پھیلائے خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ دیر کے بعد اس کے ہاتھ میں پونے تین آنے جمع ہو گئے۔ اب تو وہ باقاعدہ مانگنے لگی اور اپنے اندھے پن کا اعلان بھی کرنے لگی۔ جب تک وہ چبوترے پر بیٹھی رہتی اس کے دماغ میں یہی خیال چھایا رہتا کہ کب سات آٹھ آنے جمع ہوں گے اور کب وہ اندر جائے گی۔ جب تک اس کی مطلوبہ آمدنی پوری نہ ہوتی وہ پریشان رہتی کہ اگر لوگوں نے کچھ نہ دیا تو اس کی ماں بہن کو فاقہ کرنا پڑے گا۔ وہ خود فاقہ کر سکتی تھی مگر یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی مریض ماں اور بہن بھوکی سو جائیں۔

اور یہ سلسلہ ساڑھے سات ماہ سے جاری تھا اور اب تو وہ اس معاملے میں اس قدر تجربہ کار ہو چکی تھی کہ جب بھی اس کی تیز قوتِ سامعہ کو قریب آتے ہوئے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی فوراً اس کا ایک ہاتھ پیسہ لینے کے لیے آگے بڑھ آتا اور اسے یقین ہو جاتا کہ پاؤں کی یہ آہٹ اس کے لیے خوشخبری کا پیغام لے کر آئی ہے۔ جیسے ہی سخت سکہ اس کی ہتھیلی میں گرتا اسے اندازہ ہو جاتا کہ دینے والے نے اسے کیا دیا ہے اور اسی نسبت سے اس کے ذہن میں خوشی کی کیفیت بھی لہرانے لگتی۔ مگر یہ کیفیت عارضی ثابت ہوتی۔

اتوار کی دوپہر تھی۔ فاخراں حسب معمول ہاتھ پھیلائے اپنی بے چارگی سے آنے جانے والوں کے جذبۂ رحم کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اتنے میں پاؤں کی آہٹ اس کے قریب آنے لگی۔ اس کے چہرے پر اُمید کی ننھی سی کرن لہرائی۔ اس کا ایک ہاتھ آگے بڑھ گیا اور وہ اس بات کا انتظار کرنے لگی کہ کب سکہ اس کی ہتھیلی میں آئے اور وہ "اللہ تیرا بھلا کرے" کی صدا لگائے۔ اس کا ہاتھ پھیلا رہا، کوئی سخت چیز اس کی ہتھیلی میں نہ گری..... یہ کیا بات ہے اس نے سوچا۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ رحم دل شخص خیرات دے کر آگے بڑھ جاتا ہے، لیکن یہ کون ہے جو اس کے پاس کھڑا ہے۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے، اتنے میں آواز آئی.....

"کیوں لڑکی! تو مانگ کیوں رہی ہے؟"

عجیب سوال تھا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ مانگنے والا کیوں مانگا کرتا ہے۔ آج تک اس قسم کا سوال کسی نے نہیں پوچھا تھا۔ پہلی مرتبہ سوال کے الفاظ سن کر وہ خاموش رہی۔

"بے چاری اندھی ہے۔" دوسری آواز نے کہا۔

اب اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے پاس ایک آدمی

نہیں دو آدمی کھڑے ہیں۔

''لڑکی تو بتاتی نہیں، بھیک کیوں مانگ رہی ہے۔ گھر میں کمانے والا نہیں ہے؟''

''جی نہیں..... ابا مر گیا ہے، اماں بیمار ہے، کہاں سے کھائیں؟'' اس نے جواباً کہا۔

''اوہو..... تو گھر میں کوئی نہیں..... غریبوں کی حالت وہی ہے جو پہلے تھی بلکہ زیادہ خراب ہو گئی ہے۔'' ایک آواز نے کہا۔

''اس ملک کے امیروں کو آزادی ملی ہے غریبوں کو نہیں۔'' یہ کہہ کر دوسرے شخص نے اس کی ہتھیلی پر چار آنے رکھ دیئے۔

وہ انتظار کرتی رہی کہ کچھ اور باتیں بھی سنے مگر کوئی آواز اس کے کان میں نہ آئی۔ وہ جا چکے تھے، چاروں آنوں کو ہتھیلی میں تھامے وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس کے ہونٹوں سے دعائیہ فقرہ بھی نہ نکل سکا۔ ''امیروں کو آزادی ملی ہے غریبوں کو نہیں.....'' یہ الفاظ اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔ یہاں تک کہ زینو نے کوٹھڑی کی دہلیز پر آ کر پوچھا۔

''فخو! کیا کر رہی تھی؟''

''کسی نے چونی دی ہے۔''

''چونی! اچھا!'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''اور وہ کہتا تھا، امیروں کو آزادی ملی ہے غریبوں کو نہیں۔''

زینو کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو کوٹھڑی کی دہلیز پر محض اس لیے آئی تھی کہ اپنی کال کوٹھڑی سے نکل کر ذرا باہر کی دنیا کو بھی ایک نظر دیکھ لے اور بہن سے چند باتیں کر لے۔

''بڑا اچھا آدمی تھا۔'' زینو نے کہا۔

''بڑا اچھا آدمی۔ اللہ کرے روز آیا کرے۔ آج زیادہ پیسے ہو جائیں گے اور یکا یک گڑ والی میٹھی روٹی کے تصور سے اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔''

اس دن اس کی جھولی میں پونے تیرہ آنے جمع ہو گئے..... اور اس شام اسے کھانے کو میٹھی روٹی بھی مل گئی۔ میٹھی روٹی وہ بڑے شوق اور رغبت سے کھایا کرتی تھی اور یہ خواہش کئی ہفتوں کے بعد کہیں جا کر پوری ہوتی تھی۔ روٹی کھانے کے بعد جب وہ چارپائی پر لیٹی تو اسے چار آنے دینے والے شخص کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے کہے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ وہ سوچنے لگی کہ اس فقرے کا مطلب کیا ہے کہ ''اس ملک کے امیروں کو آزادی ملی ہے غریبوں کو نہیں۔'' وہ سوچتی رہی، دیر تک سوچتی رہی۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کا معصوم دماغ ایک الجھن میں مبتلا ہو گیا۔

زینو ابھی سوئی نہیں تھی وہ ہلکے سروں میں گا رہی تھی۔ ''دنیا میں غریبوں کو آرام نہیں ملتا..... روتے ہیں تو ہنسنے کا پیغام نہیں ملتا۔''

''زینو!'' کیا ہے، سوتی کیوں نہیں؟'' فاخراں نے کہا۔

زینو کو اس وقت بہن کی مداخلت بہت بری معلوم ہوئی۔

''غریبوں کو آرام کیوں نہیں ملتا؟ فاخراں نے زینو کے الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا۔''

''نہیں ملتا، بس نہیں ملتا۔ میں کیا جانوں کیوں نہیں ملتا۔''

''زینو! غریبوں کو آزادی نہیں ملی۔''

''اچھا!'' آزادی کیا ہوتی ہے زینو؟''

زینو اور جھنجھلا گئی۔ ''میں کیا جانوں۔''

''زینو بتا دو نا!'' فاخراں کے لہجے میں لجاجت تھی۔

''آزادی ہوتی ہے آزادی۔ ہم عاجزوں کو آزادی کہاں؟ نہ پیٹ بھر کر روٹی ہے..... نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔ ابا مر گئے اب تجھے مانگنا پڑتا ہے اور.....''

زینو نہ جانے کیا کچھ کہہ دیتی کہ ساتھ والی چارپائی پر سوکھی ہوئی ہڈیاں چٹخنے لگیں، زینو اس ڈر سے کہ ماں خفا نہ ہو جائے اور گالیوں کی بوچھاڑ شروع نہ کر دے فقرہ مکمل کیے بغیر کروٹ بدل کر جھوٹ موٹ خراٹے لینے لگی۔ کچھ دیر کے بعد زینو شاید واقعی سو گئی، مگر فاخراں کو نیند نہیں آئی، وہ ابھی تک سوچ رہی تھی کہ غریبوں کو آزادی کیوں نہیں ملی..... کب ملے گی غریبوں کو آزادی..... سوچتے سوچتے آخر کار وہ مضمحل ہو کر سو گئی۔

صبح جب فاخراں جاگی تو زینو معمول کے مطابق انگیٹھی میں آگ سلگا رہی تھی، ابھی چائے تیار ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی اور اپنے اُلجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پھر وہی بات سوچنے لگی، غریبوں کو کب آزادی ملے گی۔ وہ یہ بات سوچ ہی رہی تھی کہ زینو انگیٹھی پر دیگچی رکھتے ہوئے بولی۔

''پھر سوچ رہی ہے آزادی کیا ہے؟''

''کیا ہے؟'' ماں بولی۔

''یہ فاخراں۔''

''کیا ہے فاخراں کو؟ بیمار ہو گئی ہے؟'' ماں کو ایک نئی فکر نے آ دبوچا۔ چند ماہ پیچھے جب فاخراں بیمار ہو گئی تھی تو ان دونوں کو دو دن تک فاقہ کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ گھر میں جتنے پیسے تھے وہ سب فاخراں کے دوا دارو میں خرچ ہو گئے تھے۔ ایک ہی چیز ہو سکتی تھی یا دوا آتی یا گھر میں روٹی پکتی۔ دوا آئی اور چولھا ٹھنڈا رہا۔

''نہیں بے بے یہ پوچھتی ہے غریبوں کو آزادی کب ملے گی؟''

''ماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، ہم عاجزوں کو آزادی سے کیا واسطہ؟ زیادہ بیت گئی ہے، تھوڑی رہ گئی ہے سو بیت جائے گی اور وہ کھانسنے لگی، ہائے..... مر گئی۔ چائے بن گئی ہے تو توے پر روٹی رکھ دے زینو!''

''اچھا بے بے!'' اور جس وقت فاخراں مٹی کے کٹورے میں گرم گرم چائے کے اندر رات کی بچی ہوئی میٹھی روٹی کے ٹکڑے ڈالنے لگی تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ آزادی سے مراد اچھی اچھی چیزوں سے پیٹ بھرنا ہے، معمولی چیزوں سے نہیں۔ اور اچانک اسے نگہت یاد آ گئی۔ نگہت فیروز پور میں اس کی سہیلی تھی جو ایک بہت بڑے مکان میں رہتی تھی۔ فاخراں جب کبھی اس کے مکان میں جاتی تھی تو نگہت بتاتی تھی، یہ میرے ابا کا کمرہ ہے، یہ اماں کا ہے، یہ غسل خانہ ہے، یہ بھائی جان کا کمرہ ہے، یہ ڈرائنگ روم ہے۔ اور فاخراں شفاف دیواروں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کمرے میں گھومتی رہتی۔ نگہت موٹر میں بیٹھ کر اسکول جاتی تھی، دور ہی سے ہارن کی آواز سن کر وہ سمجھ جاتی کہ نگہت آ گئی ہے اور اب وہ موٹر سے اترے گی اور اپنے کمرے میں چلی جائے گی۔ نگہت اسے بتایا کرتی تھی، آج اس نے مرغ کا پلاؤ کھایا ہے، آج گھر میں ہرن کا گوشت پکا ہے اور آج اسے دو لال لال سیب ملے ہیں، یہ الفاظ سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آتا اور وہ تھوکنے لگتی۔ جب نگہت اس کے پاس بیٹھتی تھی اور اس کی انگلیاں امیر سہیلی کی قمیض، کوٹ یا شلوار سے مس کر جاتی تھیں تو اس کے ذہن میں وہ تمام تصورات جاگ اٹھتے تھے جو اس نے ریشم اور کمخواب کے الفاظ سن کر ان کی مادی

شکل کے بارے میں قائم کر رکھ تھے۔ کتنے نرم، ملائم اور شفاف ہوتے ہیں یہ کپڑے جہاں انگلیاں رکھتے ہی پھسل جائیں اور اس وقت بھی آزادی کے بارے میں سوچتے وقت اس کی انگلیوں میں گلبت کے ریشمی کپڑوں کا لمس اس کے ذہن میں پلاؤ کی لذت انگیز خوشبو اور اس کی زبان پر سیب کی قاشوں کی مٹھاس رچنے لگی تھی۔ وہ خیال کرنے لگی تھی کہ جب غریبوں کو آزادی مل جائے گی تو وہ اس کی ماں اور اس کی بہن پھٹے پرانے کپڑے نہیں پہنیں گی۔ رات کی باسی روٹیاں نہیں کھائیں گی۔ ایسی جگہ نہیں رہیں گی جہاں بارش کے وقت چھت میں سے پانی ٹپک ٹپک کر ہر طرف جمع ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہ اچھے اچھے کپڑے پہنیں گی، انھیں کھانے کے لیے اچھی اچھی چیزیں ملیں گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے ہر روز صبح سویرے اٹھ کر رات کی بچی ہوئی سوکھی روٹی کھا کر لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانے پڑیں گے۔ تو آزادی کب ملے گی غریبوں کو، یہ بات اسے معلوم نہیں تھی۔ وہ سوچنے لگی اس شخص نے صرف یہ بتایا ہے کہ امیروں کو آزادی مل گئی ہے، غریبوں کو نہیں۔ اس نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ غریبوں کو کب آزادی ملے گی۔ اسے یہ بھی بتانا چاہیے تھا، اب آئے گا تو میں اس کا ہاتھ تھام لوں گی اور اس وقت تک نہ جانے دوں گی جب تک وہ مجھے یہ بات نہیں بتا دے گا۔ خیر وہ نہ آیا تو کریم ہی سے پوچھ لوں گی۔ وہ جمعرات کو روٹی دینے کے لیے آیا کرتا ہے۔ کریم اس کے محلے میں رہتا تھا۔ اس کا نانا مر گیا تھا اس لیے وہ جمعرات کو فاخراں کے گھر آ کر روٹی دے جاتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ ایک حد تک مطمئن ہو گئی اور اپنا فرض ادا کرنے کے لیے کوٹھڑی سے باہر نکلنے لگی۔

جمعرات کو جب وہ شام کے قریب جھولی میں پیسے سنبھالتی ہوئی اندر جانے لگی تو اس کے دماغ پر یہ آرزو چھائی ہوئی تھی کہ وہ کریم سے آزادی کا سوال ضرور پوچھے گی۔ مگر کوٹھڑی میں قدم رکھتے ہی اسے رونے کی آواز سنائی دی۔ کبھی کبھی ماں زینو کو گالیاں دیتی تھی تو وہ بیچاری رو پڑتی تھی اور اس وقت بھی وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ بہن کو روتے دیکھ کر اس کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک پڑتے تھے اور وہ بہن کو چپ کرانے کی کوشش کرنے لگتی تھی۔ اس وقت وہ ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا بے بے؟"

"اس بے شرم کی بچی کو شرم نہیں آتی، جس بات سے منع کرو وہی کرتی ہے۔"

"کیا بات تھی؟" فاخراں نے پوچھا۔

"میں نے جب ایک بار کہہ دیا ہے کہ کریم آئے تو اس سے کچھ نہ کہا کرو، پھر یہ اس سے کیوں بولتی ہے۔ وہ چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ سارا دن رنڈیوں میں گھسا رہتا ہے۔"

"میں نے اس سے کچھ نہیں کہا، وہ کہتا تھا زینو کا کیا حال ہے؟" زینو نے روتے ہوئے کہا۔

"چپ! اس نے گالی نکال کر دھمکایا۔"

دونوں لڑکیاں سہم کر چپ ہو گئیں۔ فاخراں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماں اتنا بگڑ کیوں رہی ہے، مگر وہ ڈر کے مارے بول نہ سکی۔ اس رات فاخراں دیر تک خدا سے دعا کرتی رہی، اللہ غریبوں کو آزادی دے دے تاکہ کریم روٹی لے کر ہمارے گھر میں آئے ہی نہ اور نہ ماں بیچاری زینو کو گالیاں دے..... آزادی کا خیال کرتے ہی ایک بار پھر اس کی انگلیوں میں ریشمی کپڑوں کا لمس اور اس کے دماغ میں پلاؤ کا ذائقہ لہرانے لگا۔

بہن سو رہی تھی، وہ اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھتے ہوئے بولی "گھبراؤ نہیں زینو! آزادی مل جائے گی۔"

زینو سوتے میں چونک اٹھی۔

"ہائے، مجھے ڈرا ہی دیا ہے تو نے!"

تو سو رہی تھی!..... اچھا سو جا۔ میں کہہ رہی تھی اللہ ضرور ہمیں آزادی دے گا۔"

خاک دے گا..... بے بے کو نہ جانے کیا ہو جاتا ہے..... اتنی گالیاں دیں، اتنی گالیاں دیں کہ.....

"رو نہیں زینو! یہ سب کچھ اس وقت تک ہے جب تک آزادی نہیں ملتی غریبوں کو۔ آزادی مل جائے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تو نماز کیوں نہیں پڑھتی؟"

"پڑھتی ہوں۔" زینو نے یونہی کہہ دیا۔

"اچھا..... تو دعا مانگا کر ناں اللہ غریبوں کو جلدی آزادی دے۔"

"اب سو رہو، نیند آ رہی ہے مجھے۔"

زینو سو گئی مگر فاخراں دیر تک آزادی کے لیے دعا مانگتی رہی۔

سردی بڑھتی جا رہی تھی اور گھر میں ایک کمبل اور لحاف کے سوا سردی روکنے کے لیے اور کچھ بھی نہ تھا۔ کمبل کہیں کہیں سے پھٹا ہوا تھا اور ماں یہی پھٹا ہوا کمبل اوڑھ کر سوتی تھی۔ کئی بار زینو نے کہا "بے بے تو بیمار ہے، لحاف تو لے لے اور کمبل ہمیں دے دے۔" مگر ماں مانتی نہیں تھی۔ فاخراں کی اب یہ کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ پیسے حاصل کرے۔ چنانچہ وہ زینو کے بلانے پر بھی باہر بیٹھی رہتی کہ چند پیسے اور مل جائیں۔ روز جتنے پیسے جمع ہوتے تھے ان میں سے آدھے پیسے لحاف کے لیے محفوظ کر لیے جاتے تھے۔ پہلے ہر روز سالن ضرور بنتا تھا مگر اب مولی کے ساتھ ہی روٹی کھالی جاتی تھی اور سالن کے پیسے بھی بچا لیے جاتے تھے۔ فاخراں اپنی زندگی کو کچھ اہم سمجھنے لگی تھی کیونکہ اسی کے کمائے ہوئے پیسوں سے تین پیٹ بھرتے تھے اور لحاف خریدنے کے لیے پیسے بھی جمع ہو رہے تھے۔ اس احساس نے اس کے اندر کام کرنے کے جذبے کو اور تیز کر دیا اور رات دن وہ اسی خیال میں غلطاں رہنے لگی کہ کب گھر میں لحاف آئے گا اور کب اس کی بیمار ماں سردی سے بچے گی۔

جب معقول رقم جمع ہو گئی تو ماں زیادہ بیمار ہو گئی۔ چنانچہ لحاف کے لیے جمع کیے گئے پیسے دوائیوں پر خرچ ہونے لگے۔ چند دن میں گھر کی ساری جمع پونجی خرچ ہو گئی اور اس کے ساتھ ماں کی زندگی کا اثاثہ بھی ختم ہو گیا۔ ماں مر گئی تو دونوں لڑکیوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اللہ دتہ حلوائی جس نے فاخراں کی ماں کے مرنے پر کفن دفن کا انتظام کیا تھا۔ اپنی بیوی اور بوڑھی بہن سمیت فاخراں کے یہاں آ گیا۔ اب فاخراں کو بھیک نہیں مانگنا پڑتی تھی کیونکہ گھر کا سارا خرچ اللہ دتہ پورا کرتا تھا۔

فاخراں چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھی کسی سوچ میں غرق رہتی تھی۔ سوچتے سوچتے کبھی چہرے کا رخ چھت کی طرف پھیر لیتی اور کبھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لرزنے لگتی۔

اللہ دتہ کو دل کے دورے پڑتے تھے۔ جب کبھی دورہ پڑتا تھا تو پیلا زرد ہو جاتا تھا اور دو تین دن تک دکان پر نہیں جا سکتا تھا۔ معمولی حکیموں، ڈاکٹروں سے کئی مرتبہ علاج کروا چکا تھا، مگر فائدہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ کہتے تھے تمھیں کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔ لیکن اس کی محدود آمدنی بڑے ڈاکٹر کے پاس جانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ فاخراں کے گھر میں آ کر دورہ پڑا تو

اس کے پاس معمولی ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے بھی پیسے نہ تھے۔ اللہ دتہ کی بیوی نے اپنی آخری سونے کی انگوٹھی بھی بیچ دی۔ ڈاکٹر کو گھر پر بلایا گیا۔ مریض کی حالت میں کچھ افاقہ بھی ہوا مگر یہ افاقہ عارضی تھا کیونکہ تیسرے دن چار بے کس عورتوں کا یہ واحد سہارا ٹوٹ گیا۔

چار پیٹ روٹی سے محروم ہو گئے اور چار تن اپنی عریانی چھپانے کے لیے کپڑے کو ترسنے لگے۔

مرحوم اللہ دتہ کا ایک بھانجا کراچی میں رہتا تھا، اسے جب اس حادثے کا علم ہوا تو وہ چالیس روپے ماہانہ بھیجنے لگا۔ اور یوں بمشکل ان کا گزارہ ہونے لگا۔

ایک دن فاخراں اندر آئی تو اسے بہن کی سسکیاں سنائی دیں۔ چند دن سے وہ بہن کی پریشانی محسوس کر کے پریشان ہو رہی تھی اور اب تو بہن کو روتے ہوئے دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ فاخراں نے بہن کو بلایا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

اللہ دتہ کی بیوی گرج کر بولی ''اسے کیا کہتی ہے فخو! یہ تو نواب زادی ہے نواب زادی۔ دماغ عرش پر پہنچ گیا ہے، سمجھتی ہی نہیں کچھ۔ غریبی میں یہ نوابی کبھی دیکھی سنی نہیں تھی۔''

''کیا نوابی ہے خالہ جان؟'' فاخراں نے آنسو روکتے ہوئے پوچھا۔

''یہ نوابی شان نہیں تو اور کیا ہے، کہتی ہے میں میراں بخش سے نکاح نہیں کروں گی۔ میرے دادا جتنا ہے، توبہ! اس کی تو آنکھ کا پانی مر گیا ہے کوئی پوچھے اس طرح گزارہ کیسے ہوگا؟ کون اس نواب کی چھوکری اور اندھی بہن کو روٹی دے گا۔ میں پوچھتی ہوں روٹی کپڑے کا کیا بندوبست ہوگا؟''

''پر خالہ جان! تو کیوں ہماری فکر کرتی ہے، جس طرح ہوگا گزارہ کر لیں گے۔'' زینو روتے ہوئے بولی۔

''گزارہ کر لیں گے..... کس طرح گزارہ کر لیں گے۔ آسمان سے اترے گا من و سلویٰ تیرے لیے۔ اندھی بہن کب تک بھیک مانگے گی۔ میں نے تو اسے منع کر دیا ہے۔ اس میں ہماری بے عزتی ہے۔ ہم یہاں نہ ہوتے تو جو دل میں آتا کرتیں۔ پر اب ہم لڑکی کو بھیک نہیں مانگنے دیں گے۔''

اللہ دتہ کی بیوی تڑپ کر بولی ''زینو تو سمجھتی کیوں نہیں؟ اپنی حالت دیکھ، تجھ کنگال کو کون بیوی بنائے گا۔''

اللہ دتہ کی بہن بولی ''خواہ کچھ ہو تجھے میراں بخش سے نکاح کرنا ہوگا۔''

اللہ دتہ کی بیوی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ زینو سسکیاں لیتے لیتے خاموش ہو گئی مگر فاخراں کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ ماں کی موت کا خاموش غم، اپنی بیچارگی اور بہن کا دکھ..... یہ تینوں احساس ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اس کے دل و دماغ پر ٹوٹ پڑے اور اس کی بے نور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا۔ دیر تک بہتا رہا۔ آخر بہن نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ''نہ رو بہن، نہ رو! اور فاخراں کو یوں محسوس ہوا جیسے زینو کہہ رہی ہو۔'' نہ رو بہن غریبوں کو آزادی ملنے والی ہے، اللہ غریبوں کو ضرور آزادی دے گا۔'' اور اس کے بہتے ہوئے آنسو رک گئے۔

چند دن کے بعد زینو اچانک گھر سے غائب ہو گئی۔ اللہ دتہ کی بیوی اور بہن اس کے لیے سخت بُرے الفاظ استعمال کر رہی تھیں۔ اللہ دتہ کی بیوی کہہ رہی تھی ''زینو حرامزادی نے اپنا منہ کالا کر لیا ہے، کریم کے ساتھ چلی گئی ہے۔ اور اللہ دتہ کی بہن کہہ رہی تھی، مجھے پہلے ہی معلوم تھا یہ لڑکی خاندان کو ڈبو کر رہے گی۔ خود کو نواب زادی سمجھ رہی تھی۔ آخر وہی ہوا نا! اسی لیے تو میراں بخش سے نکاح نہیں کرتی تھی۔''

گھر میں جو عورت بھی آتی تھی زینو کو ضرور گالیاں دیتی تھی۔ فاخراں کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ مگر وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کی بہن نے کوئی نہایت بری حرکت کی ہے۔

بہن کی جدائی نے اس کا برا حال کر دیا۔ جب کبھی وہ اللہ دتہ کی بیوی سے کہتی ''خالہ! زینو کہاں ہے، مجھے وہاں بھیج دو۔'' تو وہ گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتی۔ فاخراں کے لیے چپ رہنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ وقت کا پہیہ اس کے نحیف جسم کو کچلتا ہوا گزر رہا تھا اور وہ خاموش تھی۔ چپ چاپ اپنی اندھی آنکھوں سے خلا کو گھورتی رہتی تھی..... چپ چاپ کسی چیز کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ ایک دن اس نے سنا کہ ایک عورت اللہ دتہ کی بیوی سے کہہ رہی تھی۔ ''زینو ٹبی میں پیشہ کرا رہی ہے۔''

یہ سنتے ہی اللہ دتہ کی بیوی زینو کو بے نقط سنانے لگی۔ فاخراں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور رات جب وہ چارپائی پر لیٹی تو رو رو کر دعا کرتی رہی، ''اللہ مجھے میری بہن سے ملا دے۔'' اس کی یہ دعا قبول ہو گئی کیونکہ ایک ہفتے کے بعد وہ یونہی گھر سے باہر بیٹھی تھی کہ کسی نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا ''چل تجھے تیری بہن بلاتی ہے۔''

''زینو! وہ بے تاب ہو کر بولی ''ہاں۔''

''اچھا! مجھے لے چلو''

کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے تانگے میں بٹھا دیا گیا اور پھر جب تانگہ کہیں رکا تو وہ زینو کی گود میں تھی۔

''ہائے، تو مجھے چھوڑ کر کیوں آ گئی تھی زینو۔''

''تو اچھی ہے نا فخو۔''

''میں اچھی ہوں یا نہیں تجھے کیا، تُو تو مجھے چھوڑ کر آ گئی تھی..... وہ سب لوگ تجھے گالیاں دیتے تھے۔ تو آج کل کیا کرتی ہے؟ ٹبی میں پیشہ کراتی ہے، یہ کیا کام ہوتا ہے..... (ٹبی لاہور کا وہ حصہ جہاں طوائفیں رہتی ہیں) وہ لوگ تو اس کام کو بہت بُرا سمجھتے ہیں۔ خالہ نے تجھے بددعائیں دی تھیں۔ مر جائے خود کمینی کہیں کی..... میری بہن کو بددعائیں دیتی تھی۔''

زینو کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اور فاخراں ان آنسوؤں سے بے خبر تھی۔ ''تجھے بھوک لگی ہے فخو!'' بہن نے پوچھا۔ یہ سن کر فاخراں تمام باتیں بھول گئی۔

''ہاں! کھانے کو کیا ملے گا؟''

''بڑی اچھی اچھی چیزیں، پلاؤ کھائے گی نا!''

''پلاؤ؟..... ہیں، زینو!'' اور یہ کہتے ہوئے فاخراں کا ہاتھ زینو کی قمیض سے مس کرنے لگا۔

''یہ تو بڑی اچھی قمیض ہے۔''

''تو بھی ایسی قمیض پہنے گی؟''

''اچھا! یکا یک اس کے کانوں میں موٹر کے ہارن کی آواز گونج اٹھی۔ اس کی انگلیوں میں شفاف اور ملائم لمس جاگ اٹھا۔ اس کے ذہن میں سوئی ہوئی خوشبو بیدار ہو گئی..... اور وہ خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی ..... ''تو زینو! ٹبی کے غریبوں کو آزادی مل گئی ہے..... ہے نا.....''

زینو نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

فاخراں کی اندھی آنکھوں میں خوشی کی لہریں ناچنے لگیں اور زینو دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتی رہی۔

(انتخاب: محمد زمان خٹک کرلوغہ شریف ہنگو)

پنجابی ادب

شرافت

ایک مکان مالک کی شریفانہ مہربانی کا تذکرہ
جس کی زہرناکی آسانی سے سمجھ نہیں آتی

سلیم خان گمی
ترجمہ: نوید سروش

حاجی نتھو خان نے خادم حسین عرف کھادو کو سڑک کے سامنے رکشے سے اترتے ہوئے دیکھا اور بُرا سا منہ بنا کے کہا ''کنجر کا بچہ

کھادو پھر آ گیا سوڈے کی بوتل، ایک پان اور سو کا نوٹ تیار رکھ شبیر حسین!''

''بہتر حاجی صاحب۔'' کیشیئر شبیر حسین نے آنکھ مار کے ہاتھ کے اشارے سے چپڑاسی کمبلے کو بلا کے اس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ تھمایا اور کہا ''ایک دودھ سوڈا اور ایک پیلی پتی والا پان!''

شبیر حسین کو پتا تھا کہ کھادو کس قسم کا پان پسند کرتا ہے کیوں کہ کھادو کو شبیر حسین سے اپنے اور اپنی مالکن زرقا کے لیے ہر مہینے خرچا پانی ملتا تھا۔

حاجی نتھو خان کا کیشیئر شبیر حسین کارخانے کے دفتر میں بیٹھا تھا، جس میں دو میزیں، دس کرسیاں، دو صوفہ سیٹ، ایک ریفریجریٹر اور چمڑا رنگنے کی دو گانٹھیں کونے میں پڑی تھیں۔ حاجی نتھو دو کارخانوں کا مالک تھا۔ ایک چمڑا تیار کرنے اور دوسرا چمڑا رنگنے کا۔ وہ ذات کا موچی تھا مگر جب سے وہ کارخانے کا مالک بنا، سرکاری کاغذوں میں خان صاحب بن گیا تھا۔ پچھلے سال اس نے حج بھی کر لیا تھا۔ اس سال وہ اپنے علاقے کی زکوٰۃ کمیٹی کا سربراہ بن گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے علاقے میں اس کی بہت عزت تھی۔ علاقے کا تھانے دار بھی فون پر اس کی بات سنتا اور مانتا بھی تھا۔

کھادو اس کے

سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ حاجی کو چہرے کے تاثرات سے وہ بہت بیزار نظر آیا۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ ماتھے پر رکھ کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' حاجی نتھو خان نے جواب دیا اور ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بیٹھنے کو کہا ''آج کیسے آ گیا خادم حسینا؟''

''جی چاہ رہا تھا کہ سلام کر آؤں اور مالکن نے بھی سلام بھیجا ہے۔'' خادم حسین نے جس لمحے یہ فقرہ کہا، اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے اور بیزاری دور ہو گئی۔ نتھو خان سمجھ گیا کہ یہ بی بی کے ذکر کی مہربانی ہے۔

''اپنی مالکن سے کہنا کہ میں پہلے والا نتھو خان نہیں، اب حاجی نتھو خان ہوں۔''

''ہاں جی، مجھے پتا ہے کہ اب آپ حاجی صاحب ہو گئے ہیں۔'' کھادو نے اپنے لہجے میں دنیا جہاں کا احترام جمع کر کے حاجی صاحب سے کہا۔ ''یہ زرقا کو پتا ہے کہ میں حاجی ہوں۔ وہ کچھ سوچے، میں حاجی ہو کر پانی نہیں بن سکتا۔ ہاں، پہلے اور بات تھی۔'' حاجی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے جی کہ آپ اَب حاجی ہیں، پاجی نہیں رہے، مگر مالکن تو وہی ہے نا، وہ تو جن نہیں ہے جی۔'' کھادو نے طنزیہ انداز میں بات کی۔

''خادم حسین! بات سمجھ، میں گناہ کی زندگی چھوڑ چکا ہوں۔ میں اب زرقا کا چاہنے والا نہیں بن سکتا۔'' حاجی نے سختی سے کہا۔

''پر وہ نہیں چاہتی کہ آپ کی چاہت سے منہ موڑے۔'' کھادو ہار ماننے والا نہیں تھا۔

حاجی نتھو خان کچھ پریشان ہو گیا۔ پریشانی اس بات کی تھی کہ کھادو اس کی دلیل کیوں نہیں مانتا۔ اس نے کہا ''اسے جا کر کہو کہ مجھے بھول جائے اور میری چاہت دل سے نکال دے۔ اب نہ وہ باغ ہے اور نہ وہ بلبلیں ہیں۔''

''آپ کی بات مالکن زرقا تک پہنچ جائے گی، مگر مناسب یہی ہے کہ آپ خود کسی دن وہاں چکر لگا لیں۔''

''پھر وہی بات! میں حج کر کے گانے ناچنے والیوں کے محلے میں جاتا ہوا اچھا لگوں گا۔ کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا، حاجی نتھو کس محلے میں گھوم رہا ہے؟ اس محلے میں کون سے چمڑے کے بیوپاری بیٹھے ہیں جو میں سودا کرنے جاؤں۔'' نتھو خان نے سخت لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے جی، آپ کی مرضی!'' خادم حسین نے بولتے ہوئے دائیں طرف دیکھا تو چپڑاسی سوڈے کی بوتل اور پان لے کر کھڑا تھا۔ کھادو نے بوتل کو منہ سے لگایا اور پان بائیں جانب والی جیب میں رکھ لیا۔

''پانی پی کر شبیر سے ملتے جانا۔'' حاجی نے کھادو سے کہا۔

کھادو نے بوتل نیچے رکھی، کرسی سے اٹھتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ شبیر کیشیئر سے سو کا نوٹ وصول کیا اور دفتر سے باہر آ کر سڑک پر رکشا دیکھنے لگا۔

کھادو زرقا کا باورچی اور ذاتی ملازم تھا۔ نتھو کی عمر چالیس اور زرقا کی عمر تیس سال تھی، وہ دونوں ایک دوسرے کو دس برس سے جانتے تھے۔ زرقا پہلے گاتی تھی، مگر اب اس نے گانا چھوڑ دیا تھا۔

چوتھے دن کھادو پھر حاجی نتھو خان کے دفتر

میں بیٹھا تھا اور بہت گھبرایا ہوا تھا۔ دودھ سوڈا پی کر پیلی پتی والا پان جیب میں رکھ کر بھی اس کی گھبراہٹ دور نہیں ہوئی تھی۔ ''مالکن بہت پریشان ہے۔'' وہ بولا

''تو، پھر میں کیا کروں؟'' حاجی نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

''وہ کہتی ہے، یہ کون سا میرا ذاتی گھر ہے، کرائے کا ہے۔ میں یہ گھر چھوڑ دوں گی اور کرائے کا گھر لے کر رہ لوں گی۔'' کھادو نے زرقا کی ترجمانی کی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، بدی کی زندگی چھوڑ کے بھلائی کی زندگی اختیار کر لے۔'' حاجی نے کہا۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ہماری سرکار کو اس قسم کا قانون لاگو کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' کھادو نے جیب سے پان نکال کر منہ میں رکھا۔

''خادم حسینا! اسلامی ملک میں گانا بجانا اور اس طرح کے برے کام نہیں چل سکتے۔ بات یہ ہے کہ ایک آدمی چار شادیاں کر سکتا ہے، اس لیے ہمارے ملک میں عورت کو روٹی کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔'' حاجی نتھو خان نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے جی، مگر زرقا سے کون شادی کرے گا؟'' کھادو نے سوال کیا۔

''اسے کوئی شریف آدمی مل جائے گا۔'' حاجی نے کہا۔

''زرقا جیسی بدنام عورت کے ساتھ کون شادی کرے گا؟'' کھادو کے لہجے میں افسوس تھا۔

''وہ کیسے بدنام ہے، وہ ہمیشہ سے پرکشش، خوبصورت اور تہذیب یافتہ ہے۔ ہاتھ منہ دھونے اور بنے سنورنے کے بعد اٹھارہ سال کی لگتی ہے۔ وہ داغی کیسے ہے!'' حاجی کے کہنے میں ایک لطف تھا۔

''پھر اس کے ساتھ نکاح آپ کر لیں۔'' کھادو نے ایک دم کہا۔

''تُو پاگل ہے خادم حسین! میں حاجی ہوں، اگر حاجی نہ ہوتا تو پھر حق نکاح کر لیتا مگر اب نہیں، سمجھا یا نہیں سمجھا؟'' حاجی نے کھادو کے کندھے پر ہاتھ مار کے پوچھا۔

''ہاں سمجھ گیا میں۔''

وہ اٹھا اور تھکن کے آثار لیے دفتر سے نکل گیا۔ واپس آیا تو شبیر سو کا نوٹ لیے سامنے کھڑا تھا۔ حاجی نتھو خان ٹیلی فون پر چمڑے کا بھاؤ معلوم کر رہا تھا۔ کھادو نے نوٹ لیا اور سلام کیے بغیر ایک بار پھر دفتر سے نکل کے سڑک پر آ گیا۔

پانچویں دن کھادو حاجی نتھو خان کے دفتر آیا۔ حاجی دفتر میں نہیں تھا، اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ حاجی نے آتے ہی دودھ سوڈا اور پان کا آرڈر دیا۔ وہ کھادو کو دیکھ کے حیران ہوا۔ کھادو نے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے کندھے کا رومال بھی دھلا ہوا تھا۔ اس نے حجامت اور شیو بھی تازہ بنوائی تھی اور بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

''آج بہت خوش ہے کھادو! کیا بات ہے؟'' حاجی نے پوچھا ''رات پولیس چھاپا مارنے آئی تھی پر بی بی نے انھیں نکاح نامہ دکھا دیا۔'' وہ بولا۔

''نکاح نامہ..... کس کا نکاح نامہ؟'' حاجی نے حیرانی سے پوچھا۔

''جی، پولیس سے بچنے کے لیے بی بی نے میرے ساتھ جھوٹی موٹی شادی کر لی ہے اور پولیس کے ڈر اور قانون کی مار سے بچنے کے لیے نکاح نامہ تیار کرا لیا ہے۔''

''بھئی، پھر زرقا تو بہت سیانی نکلی۔'' حاجی نے ذرا جھینپتے ہوئے کہا۔

''کیا کرتی جی، پولیس کے پاس قانون کا ڈنڈا تھا اس سے بچنا بھی ضروری ہے۔ ویسے پولیس کو نکاح کا یقین نہیں آیا۔'' وہ ہنس کے بولا۔

''وہ کیوں؟''

''کیوں کہ پولیس مجھے اور بی بی کو جانتی ہے۔ پولیس کو معلوم ہے کہ میں ہانڈی پکانے والا، بی بی کا گھریلو نوکر ہوں۔'' کھادو نے کہا۔

''چلو، جان تو بچی نا پولیس سے۔''

''کدھر جی! تھانے دار نے کہا ہے کہ میں سارا جھوٹ فریب جانتا ہوں۔ تم لوگ قانون کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اب یہ علاقہ چھوڑ کر دفع ہو جاؤ۔ بہت سخت تھانے دار ہے۔'' کھادو نے بیزاری سے آخری فقرہ کہا۔

''اسے چار پیسے دے کر چپ کرا دیتے۔'' حاجی نے مشورہ دیا۔

''پیسے لینے والا تھانے دار نہیں ہے، کوئی ستایا ہوا آدمی ہے۔ میں نے ایسا تھانے دار زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے، بڑا سخت ہے۔'' کھادو کی بیزاری مزید بڑھ گئی۔

''تیری بی بی کو تھانے دار سے بنا کر رکھنی پڑے گی۔'' حاجی نے مشورہ دیا۔

''نہیں بی بی نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور کرائے کا مکان لے گی۔'' وہ بولا۔

''یہ بھی اچھی بات ہے۔''

''میں آج آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ کے بنائے ہوئے مکان دیکھوں۔''

کل آج کل

اس شہر کی گلیوں میں کس شوق سے پھرتے تھے
گلیاں نہ رہیں ویسی ہم تم نہ رہے ویسے
چہرے بھی منور تھے اور کوچے سکوں پرور
بہتر نہ رہا بہتر بدتر سے ہوا بدتر
اس شہر کی بولی میں نرمی تھی حلاوت تھی
گھبرو میں حمیت تھی مٹیار میں غیرت تھی
اس شہر کے پیڑوں سے اخلاص ٹپکتا تھا
اس شہر کی قدرت نے خود کی تھی جنا بندی
اس شہر کی مٹی میں پنہاں تھی ہنر مندی
ہر فرد اب پژمردہ وحشت سی ٹپکتی ہے
گلیوں میں محلوں میں اب بھوک بھٹکتی ہے
اس شہر کی برساتیں اب خون رُلاتی ہیں
سردی کی خنک راتیں روحوں کو جلاتی ہیں
اس گردشِ دوراں کو آنکھوں سے ذرا دیکھو
ڈوبو کے تحیّر میں دیکھو جو تغیّر کو
تم اپنے زمانے کی تہذیب کو ڈھونڈو گے
کچھ بھی تو نہ پاؤ گے جس سمت بھی جاؤ گے
جب تم یہاں زندہ تھے یہ شہر بھی زندہ تھا
اس شہرِ خموشاں کا زندہ تھا ہر اک بندہ
جب تم یہاں بستے تھے یہ شہر گلستاں تھا
اب بانجھ یہ دھرتی ہے جنگل ہے یہ ویراں سا
تھا کل تو حسیں کتنا پر آج دگرگوں ہے
کیا جانے ہو کل کیسا حیران یہ گردوں ہے

(تنویر خواجہ، لاہور)

کھادو نے کہا۔

''اوہ ہاں، گھر دیکھو، ہر مکان کا کرایہ دو ہزار ماہوار ہے۔ وہ میں نے مزدوروں کے لیے بنائے ہیں۔'' حاجی نے بتایا۔

''وہ ابھی سارے خالی ہیں، انہی میں سے ایک گھر بی بی کو دے دیں۔''

''مفت؟''

''نہیں جی، کرایہ دے گی مالکن!'' کھادو نے اس طرح بے باکی سے کہا جیسے وہ کرایہ ساتھ لایا ہو۔

''کرائے کی بات زرقا سے ہوگی، تجھ سے نہیں ہو سکتی۔'' حاجی نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ کھادو اٹھا، سلام کیا اور شبیر سے کرایہ لے کر باہر آ گیا۔

اگلے دن زرقا بنی سنوری حاجی کے پاس بیٹھی دودھ سوڈا پی رہی تھی۔ کھادو ایک طرف بیٹھا پان چبا رہا تھا۔ ''تو نے اچھا کیا کہ خادم حسین کے ساتھ حق نکاح کے کاغذات تیار کرا لیے۔'' حاجی نے کہا۔

''میں کیا کرتی، مجھ سے نکاح کے لیے کوئی تیار ہی نہیں تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ جلدی جلدی اپنی آنکھیں جھپکنے لگی اور بہنے کے لیے تیار آنسوؤں کو روکنے لگی۔

''چلو ٹھیک ہوا۔ اب یہ کمائے گا اور تو آرام سے کھائے گی۔'' حاجی نے کہا۔

''مجھے آرام کہاں؟ کمانا تو مجھے ہی پڑے گا۔ کھادو تو میرا باورچی ہے اور باورچی ہی رہے گا۔''

''اور کچھ نہیں۔'' حاجی نے شرارت سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں، میں اتنی بھی گئی گزری نہیں کہ کھادو سے حقیقی نکاح کر لوں۔''

''شاباش ہو بھئی، شاباش! میں تیری بات سن کر بہت خوش ہوا ہوں۔'' حاجی بولا۔

''تم میری مدد کرو، مجھے اپنا نیا مکان کرائے پر دے دو۔'' وہ عاجزی سے بولی۔

''میں نے کل کھادو کو بتا دیا تھا کہ زرقا مکان کرائے پر لے لے۔''

''ماہانہ کرایہ کتنا ہوگا؟'' زرقا نے پوچھا۔

''کرایہ ہاں کرائے کے بارے میں رات میں نے سوچا تھا کہ اگر زرقا اور اس کی تمام سہیلیاں دس کے دس گھر کرائے پر لے لیں تو مجھے ماہوار دو ہزار فی مکان کے حساب سے بیس ہزار روپے کرایہ ملے گا۔''

''یہ تو بالکل سیدھا حساب ہے اور میرے پاس کرائے دار بھی بہت ہیں۔'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''پھر میں نے سوچا کہ زرقا سے کرایہ نہیں لوں گا کہ اس کے ساتھ اٹھا بیٹھا ہوں۔'' حاجی نتھو خان نے زرقا سے کہا۔

''جب میری دوسری سہیلیاں کرایہ دیں گی تو میں کیوں نہ دوں، میں بھی دو ہزار ماہوار کرایہ دوں گی۔'' وہ زور دے کے بولی۔

''نہیں، میں تجھ سے کرایہ نہیں لوں گا۔ بس مہینے میں ایک آدھ چکر لگا لیا کروں گا۔''

حاجی نتھو خان کی آواز دھیمی تھی کہ شبیر حسین نہ سن لے۔ یہ سنتے ہی زرقا کا میک اپ زدہ چہرہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ وہ کرسی سے ایک دم کھڑی ہوئی اور تلخ لہجے میں بولی ''مجھے یہ بات منظور نہیں کہ کوئی حاجی، پاجی بنے۔''

زرقا نے کھادو کو ہاتھ کا اشارہ کیا اور دفتر سے باہر نکل گئی۔ کھادو سلام کیے بغیر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

■■■

ایک بوڑھی چیل کا حیران کن ماجرا

بوڑھی چیل

اس کی زندگی میں ایک آواز بہت اہم ہو گئی تھی 1947ء کی ہجرت کے پس منظر میں لکھی گئی خاص کہانی

سجاد قادر

مجھے نہیں یاد کہ اس کی عمر کتنی ہوگی، بس اتنا یاد ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا اسے اپنے گھر کے اوپر منڈلاتے پایا۔ ویسے تو وہ اکثر سستانے کے لیے ہمارے گھر میں موجود بیری کے درخت پر بیٹھتی مگر ہر جمعرات کو اس کی ڈیوٹی سی شاید لگ جاتی اس لیے وہ ہر جمعرات کو لازمی آتی۔ ہر جمعرات کو میرے ابا خیرات کیا کرتے تو اس میں سے وہ گوشت کا ایک خاص حصہ اس چیل کے لیے علیحدہ کر لیا کرتے۔ سورج غروب ہونے سے قبل عین شام کے وقت چیل ہمارے ہاں مہمان ہوتی اور دادا ابو اسے وہ گوشت کا ٹکڑا دے دیا کرتے۔ مہمان اس لیے کہا کہ دادا ابو اسے وہ گوشت کبھی پھینکا نہیں کرتے تھے۔ ایک صاف کپڑے کے اوپر رکھ کر چھت کی منڈیر پر رکھ دیتے اور چیل پہلے کافی دیر بیٹھی اسے دیکھتی رہتی۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے اڑتی اور ہمارے گھر کے اوپر دو تین چکر کاٹتی پھر ایک دم سے اس کمرے کی چھت پر اترتی جہاں گوشت کا ٹکڑا رکھا ہوتا۔

گوشت کھانے کے بعد وہ وہاں سے اڑتی اور سیدھی اپنے گھونسلے میں پہنچ جاتی۔ اس کا گھونسلا ہمارے گھر سے کافی دور ہمارے کھیتوں کے عین وسط میں موجود بوڑھے کیکر کے خشک تنے پر تھا۔ مجھے اس کے بچے دیکھنے کا بہت شوق ہوتا تھا۔ مگر کبھی اس کے گھونسلے میں بچے نہیں دیکھے تھے، شاید وہ نر چیل تھی اور ہماری بستی میں وہ ایک ہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی جانور حرام ہو جاتا اور اسے کھیتوں میں پھینک دیا جاتا تو دور دراز سے اتنی چیل اور گدھ وہاں اکٹھے ہو جاتے کہ گننے میں ہی نہیں آتے تھے۔ جب کبھی یہ کسی مردار پہ اکٹھے ہوتے تو میں ان کو گوشت کھاتا دیکھتا اور ان کا آپس میں لڑنا جھگڑنا اور بڑی خوفناک سی آواز نکالتے ہوئے دیکھنا میرا من پسند شغل ہوتا تھا۔ میں ان کی تعداد کو ہمیشہ گننے کی کوشش کیا کرتا تھا مگر کبھی

گننے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

وہ عظیم الجثہ چیل اپنے باقی تمام ساتھیوں سے جسم میں زیادہ مضبوط اور بڑی تھی، کبھی کبھی میں اسے دیکھتا تو مجھے عقاب کا گماں ہوتا۔ عقاب چونکہ بلندیوں پر رہنے والا پرندہ ہے جب کہ چیل پہاڑوں کی نسبت درختوں پر زیادہ خوشی سے گزر بسر کر لیتا ہے۔ چیل کے جوڑے بستیوں میں لوگوں کے گھروں میں موجود درختوں پر بھی بسیرا کر لیا کرتے ہیں۔ ہمارے گاؤں کے اس چیل کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ اس نے کبھی ہماری بستی میں مرغی کے چوزوں کو خوراک کا ذریعہ نہیں بنایا تھا۔ شاید کسی اور بستی یا دور دراز کے علاقوں سے مرغی کے چوزوں کو لقمۂ اجل بنا آتی ہو مگر ہماری بستی میں اس نے کبھی ایسے نہیں کیا تھا، بستی والے میرے دادا ابو کو کبھی کبھی یہ بھی کہہ کر چھیڑا کرتے تھے کہ لوگ شاہین، عقاب، تیتر، کبوتر جیسے پرندے پال کر اپنا شوق پورا کرتے ہیں مگر آپ نے ایک چیل سے دوستی کر کے اپنا تو نام ہی ڈبو لیا ہے۔

دادا ابو کبھی کبھی ایک مخصوص قسم کی آواز نکال کے چیل کو بلا بھی لیا کرتے تھے۔ جب دادا ابو وہ آواز نکالتے تھے تو چیل جہاں کہیں بھی ہوتی کچھ ہی دیر میں ہمارے آنگن میں اتر جاتی۔ اکثر دادا ابو اسے سورج غروب ہونے سے پہلے یاد کیا کرتے تھے۔ جب وہ آجاتی تو دادا ابو اسے ایک نظر دیکھتے مسکراتے کچھ کھانے کو دیتے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ خدا جانے یہ ان کا بات کرنے کا کون سا منفرد طریقہ تھا یا پھر خالی دیدار ہی ان کی ضرورت ہوا کرتا تھا۔

میں کبھی کبھار اپنی تنہائی بانٹنے اس چیل کے پاس چلا جاتا۔ پہلے تو کافی دیر نیچے بیٹھ کے اسے کیکر کے درخت پہ بیٹھا دیکھا کرتا تھا پھر جب اس کے پاس جانے کو دل کرتا تو کیکر کے درخت پہ چڑھ جاتا۔ مگر جب میں اوپر پہنچتا تو چیل وہاں سے اُڑ جاتی۔ حیرانی کی بات یہ کہ کبھی وہ میرے ساتھ درخت کے تنے پہ نہیں بیٹھی۔

وقت گزرتا گیا میں جواں ہوتا گیا اور چیل بوڑھی مگر اس کی اُڑان پہلے جیسی ہی پھرتیلی رہی۔ 1947ء کا زمانہ تھا جب برصغیر کا بٹوارا ہوا، بڑے پیمانے پہ ہجرت، قتل و غارت اور لوٹ مار شروع ہوئی۔ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ہمارا علاقہ ہوشیار پور ان فسادات کا بطور خاص نشانہ بن چکا تھا۔ ہندو مسلمانوں کے اور مسلمان ہندوؤں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے، ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ گوشت ہی گوشت تھا، کیا انسان اور کیا جانور۔ ہم پاکستان آنے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ کبھی سامان اکٹھا کرتے، کبھی مہاجرین کے کیمپ کا پتا کرنے جاتے تو کبھی ارادہ ترک کر دیتے۔ کیونکہ دادا ابو وہ علاقہ اور زمین و جائیداد چھوڑ کر پاکستان آنے کو تیار نہیں تھے، مجھے جس چیز کی شدت سے یاد آتی تھی تو وہ بوڑھی چیل تھی۔ نجانے کیوں میں اس بوڑھی چیل کو دیکھے بغیر بے چینی اور بے سکونی محسوس کیا کرتا تھا۔ تمام تر نامساعد حالات کے باوجود میں ایک دو بار کھیتوں میں جا کے چیل کو دیکھ آیا تھا۔ جب بھی میں کھیتوں میں گیا، چیل کو اپنے گھونسلے میں موجود پایا۔ میں نے اسے اڑتے ہوئے یا کہیں بھی انسانوں یا جانوروں کا گوشت کھاتے ہوئے نہ دیکھا۔ میں حیران تھا کہ اب جب کہ ہر طرف مردہ جانوروں کا ڈھیر لگا ہوا ہے تو یہ کیوں نہیں گوشت کھاتی بلکہ یہ تو اپنا گھونسلا ہی نہیں چھوڑتی، ایک ہی جگہ بیٹھی ہوئی ہے۔

ایک دن میں کیکر کے درخت پہ چڑھ گیا اور اس کے گھونسلے کے ساتھ والے تنے پہ جا کے بیٹھ گیا۔ مگر

اس وقت حیرانی ہوئی جب وہ مجھے اپنے بہت قریب پا کر اُڑی نہیں بلکہ اپنے گھونسلے میں ہی بیٹھی رہی۔ پہلے میں کافی دیر اسے دیکھتا رہا پھر میں نے آہستہ سے اس کے پروں کو ہاتھ لگایا۔ وہ بالکل ٹھیک تھے پھر اس کی ٹانگیں دیکھیں، اس کی چونچ کو دیکھا، پھر اسے اٹھا کے اپنی گود میں رکھا۔ اسے کوئی چوٹ بھی نہیں لگی تھی اور وہ بیمار بھی نہیں تھی۔ مگر نہ جانے کیوں اس نے اپنی اڑان ترک کر دی تھی۔ میں کافی دیر اس سے باتیں کرتا رہا، اسے یہ بھی بتایا کہ حالات خراب ہیں۔ ہم پاکستان جا رہے ہیں شاید پھر ہماری کبھی ملاقات نہ ہو۔ مگر مجھے تمھاری یاد ضرور آئے گی، پھر میں نے اسے یہ بھی کہا کہ تم ہمارے ساتھ چلو۔ تمھیں تو کسی چیز کا خطرہ نہیں تم تو اڑ سکتی ہو، تمھیں تھک جانے کا ڈر نہیں، تمھیں عصمت و آبرو کے لٹ جانے کا خدشہ نہیں اور تو اور تمھارے ننھے منھے اور چھوٹے چھوٹے سے بچے بھی نہیں ہیں کہ تمھیں ان کو اٹھانا پڑے گا۔ مجبور تو وہ لوگ ہیں جن کے معصوم سے بچے ہیں اور بوڑھی ماؤں اور جوان بہنوں کا بوجھ ان کے کندھے پر لدا ہوا ہے، راستے میں بھوک پیاس کا بھی انھیں ڈر ہے، رات ہو جانے پر ٹھکانے کی تلاش بھی ان کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ تم تھک جاؤ تو کسی درخت پر بھی بیٹھ سکتی ہو، تمھیں بھوک لگ جائے تو کسی مردہ انسان یا جانور کا گوشت بھی کھا سکتی ہو۔ تم تو آرام سے ہمارے ساتھ جا سکتی ہو، مگر وہ خاموش بیٹھی رہی اور میری کسی بات، کسی سوال کا جواب نہ دیا اور میں کافی دیر بعد اسے اس کے گھونسلے میں تنہا چھوڑ کر اپنے گھر واپس آ گیا۔

گھر پہنچا تو گھر والوں نے سامان باندھ رکھا تھا اور پاکستان چلنے کی تیار کر رکھی تھی۔ ابو بتا رہے تھے کہ حالات سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں۔ کل رات پڑوس کے گاؤں پر سکھوں نے ہلہ بول دیا۔ مردوں، بوڑھوں اور بچوں کو قتل کر دیا، مکانات جلا دیے جب کہ جوان لڑکیوں کو زبردستی اُٹھا کر ساتھ لے گئے۔ اس لیے ہم کل صبح ہی کیمپ میں چلے جائیں گے جو بھی ضروری سامان ہے وہ ساتھ لے لو، مگر دادا ابو بضد تھے کہ میں نے جینا بھی یہیں ہے اور مرنا بھی یہیں ہے۔ میں نہیں پاکستان جانے والا یہاں ہمارے پرکھوں کی نشانیاں ہیں، انھیں کیا یہیں چھوڑ دیں اور ویسے بھی صدیوں سے سکھ، ہندو اور مسلم یہاں بھائیوں کی طرح رہتے آ رہے ہیں انھیں اب ایک دوسرے کے قتل کرنے کا جنون کیوں ہو گیا ہے۔ آخر اللہ اللہ کر کے طے یہ پایا کہ دادا ابو یہیں رہ جائیں گے اور باقی سب لوگ پاکستان روانہ ہوں گے۔

وہ رات کروٹیں بدل بدل کر گزاری، ایک عجیب سا سماں تھا اور عجیب سی کیفیت، مکان، گھر، کھیت کھلیان، وہاں کی آب و ہوا سب کچھ ہمیشہ کے لیے چھوڑنے پر دل آمادہ نہ تھا۔ لیکن مجبور تھے۔ ہمارے کھیت اور کھیتوں کے درمیان میں وہ کیکر کا بوڑھا درخت اور درخت پہ بوڑھی چیل کا گھونسلا سب کچھ یاد آتا رہا۔ بوڑھی چیل کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی، دل کرتا تھا کہ ابھی بھاگ کے جاؤں اور چیل کو اٹھا کے لے آؤں اگر وہ میرے ساتھ نہ آئے تو میں بھی کیکر کے درخت پہ گھونسلا بنا لوں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے پاس رہوں مگر ایسا بھی کب ممکن تھا۔

بچپن سے ہی جس چیز کے ساتھ آپ زیادہ وابستہ رہے ہوں تو اس چیز کی جدائی آپ کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ کہیں دادا ابو اس چیل کی محبت میں تو یہاں رکنے کے لیے مصر نہیں ہیں۔ کیونکہ وہاں پر دادا ابو کے دوستوں میں سے

اس چیل کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ محبت تو مجھے بھی اس سے تھی مگر میں وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا، میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے نئے وطن پاکستان آنا چاہتا تھا۔

اللہ اللہ کر کے نماز فجر کا وقت ہوا۔ ابھی ہم نماز پڑھ کے فارغ ہی ہوئے تھے کہ سکھوں کے ایک جتھے نے ہماری بستی پر ہلہ بول دیا۔ پوری بستی میں کوئی سو ڈیڑھ سو گھر تھا اور ہر گھر میں تقریباً ایک دو بندوقیں اور کلہاڑیاں وغیرہ موجود تھیں۔ جنگ کا سماں تھا۔ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان زبردست جنگ ہو رہی تھی، سکھ اگرچہ پوری طرح مسلح ہو کے آئے تھے لیکن مسلمانوں کی ایمانی قوت نے انھیں پچھاڑ دیا تھا۔ لڑائی میں ہماری عورتیں اور بچے بھی شامل ہو گئے تھے۔ عورتوں نے ڈنڈے اور سوٹیاں جب کہ بچوں نے اینٹ، روڑے اور پتھر اٹھا رکھے تھے۔ سکھوں کی طرف سے اگر کوئی زخمی ہو کے گرتا تو ہماری عورتیں اس پر پل پڑتیں اور اسے مار ڈالتیں اور اگر کوئی ہمارے خاندان کا زخمی ہوتا تو اسے اٹھا کر گھر لے آتیں اور پانی پلاتیں۔ جب کہ بچے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر اوپر سے ہی پتھر اور اینٹیں پھینک رہے تھے۔ لڑائی میں میرے دادا نے اپنا تانبے کا خنجر سنبھالا ہوا تھا اور نوجوان مردوں کی طرح لڑائی میں پیش پیش تھے۔ جب سکھوں کے حوصلے ٹوٹے اور وہ اپنے مردہ ساتھیوں کے لاشے وہیں چھوڑ کر بھاگے تو ہم بھی ان کے پیچھے لپکے۔ اسی دوران اچانک میری نظر چھت پر پڑی جہاں دو تین سکھ بچوں کو مارنے کے لیے چڑھ گئے تھے۔ میں اور میرا چچا اپنی اپنی کلہاڑیاں لے کر چھتوں کی طرف دوڑے، اور سکھوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور چت کر ڈالا۔ اسی دوران میں نے دادا کی وہ مخصوص آواز سنی جو وہ چیل کو بلانے کے لیے نکالا کرتے تھے۔ میں نے چھت پہ ہی کھڑے ہو کر نظر نیچے دوڑائی تو چند سکھ نظر آئے جو مرنے پڑے ہوئے تھے اور میرے دادا اور چچاؤں کے ساتھ نبرد آزما تھے۔ اچانک میری نظر اوپر اٹھی تو میں نے بوڑھی چیل کو اپنے گھر کے اوپر منڈلاتے ہوئے دیکھا تو میں حیران ہو گیا کہ اسے کیسے خبر ہوئی۔ پھر اچانک میں نے چیل کو صحن کی طرف غوطہ زن ہوتے دیکھا، چیل نے ایک سکھ کی گردن میں اپنی چونچ گاڑ دی جس نے میرے دادا ابو کی پیٹھ میں کرپان گھونپی ہوئی تھی، دادا ابو کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے اور میں چھت سے چھلانگ لگا کر نیچے آیا اور دادا ابو کا سر اپنی گود میں رکھ لیا، چیل نے سکھ پر اتنی بُری طرح سے حملہ کیا تھا کہ وہ نیچے گر گیا، تایا ابو نے جب سکھ کو دادا ابو پر حملہ کرتے دیکھا تو فوراً گرے ہوئے سکھ پر حملہ آور ہوئے انھوں نے جلد بازی میں تلوار سے سکھ کی گردن اس کے جسم سے جدا کی تو افسوس بوڑھی چیل کی گردن بھی اس کے تن سے الگ ہو گئی۔ چیل کی چونچ سکھ کی گردن میں ہی دھنسی رہ گئی جب کہ دھڑ میرے قدموں کے پاس آ گرا۔

میں نے اپنے رخساروں پہ بہتے ہوئے اشکوں کو صاف کیا تو دیکھا کہ دادا ابو اپنا ہاتھ بڑھا کر چیل کے دھڑ پر پھیر رہے تھے اور ان کے ہونٹوں سے چیل کو بلانے والی آواز یوں نکل رہی تھی جیسے اس کا بھی دم نکل رہا ہو۔ چیل کا دھڑ اپنے پَر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ چند لمحوں میں چیل کا جسم ساکت ہو گیا اور اسی وقت دادا ابو نے آخری ہچکی لی اور میں اضطراری حالت میں دادا ابو کا بوسہ لینے کے لیے ان کے اوپر جھکا۔ جب میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو آسمان پر بہت بڑی تعداد میں چیل اور گدھ منڈلا رہے تھے۔ میں نے گننے کی کوشش کی مگر وہ بے شمار تھے۔

■■■

پاکستان میں اوّل اوّل

دلچسپ حقائق، دلچسپ تاریخ

ہم اپنی ہی تاریخ کی خوب صورتی سے ناواقف ہیں

زاہد حسین انجم

قیام

پاکستان کے بعد ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور فنکاروں کی پہلی کانفرنس 5 دسمبر 1947ء کو لاہور میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس میں شریک ہونے والوں میں عبدالمجید سالک، حفیظ جالندھری، پطرس بخاری، فیض احمد فیض، ایم ڈی تاثیر، حفیظ ہوشیار پوری، صلاح الدین، میاں بشیر احمد، فلک پیما، پروفیسر سرور جامعی، شیر محمد اختر، ناہید عالم، شورش کاشمیری، مسعود پرویز، عبدالمجید بھٹی، یوسف ظفر، قیوم نظر، ضیا جالندھری، اعجاز بٹالوی، قتیل شفائی، احمد راہی، اصغر سلیم، نور بجنوری، طفیل احمد، بلقیس طفیل، ساحر لدھیانوی، عبدالمتین عارف، صلاح الدین اکبر اور سراج الحق حافظ شامل تھے۔ کانفرنس میں منظور ہونے والی اہم تجاویز یہ تھیں۔

1۔ امن، آزادی، جمہوریت اور اقلیتوں کا تحفظ
2۔ بھارت اور پاکستان کا تہذیبی اشتراک
3۔ انڈین یونین کے ادیبوں کو پیغام تہنیت
4۔ اردو کو پاکستان میں ذریعہ تعلیم بنانے کی ضرورت
5۔ تہذیبی اور تعلیمی مہم
6۔ پناہ گزینوں کا مسئلہ اور جاگیرداری نظام کے خاتمے کی فوری ضرورت

اردو کے پہلے انسائیکلوپیڈیا کی تیاری

اردو کا پہلا انسائیکلوپیڈیا فیروز سنز لمیٹڈ لاہور نے شائع کیا۔ اس کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر عبدالوحید اور مدیران میں جناب سید سبط حسن، جناب احمد ندیم قاسمی، جناب حسن عابدی، جناب سعید لخت اور جناب مقبول انور داؤدی شامل تھے۔

اس کا پہلا ایڈیشن 1964ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اس کی اس وقت قیمت تیس روپے تھی۔ یہ 9 سال کے عرصے میں (1952-1961ء) مکمل کیا گیا۔ ضخامت 1970 صفحات تھی۔ آخر میں 5 صفحات کا اغلاط نامہ بھی دیا گیا۔

پہلا یک جلدی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

اسلام کے بارے میں پہلا یک جلدی انسائیکلوپیڈیا ابتدا میں سید قاسم محمود نے 15 اکتوبر 1975ء کو قسط وار شائع کیا بعدازاں اس میں ترمیم و اضافے کے ساتھ شاہکار بک فاؤنڈیشن کراچی کے زیر اہتمام اسے یک جلدی صورت میں یکم جنوری 1984ء کو شائع کیا۔

یہ مختصر مگر جامع انسائیکلوپیڈیا ہے اور اس میں اسلام کے بارے میں ان تمام معلومات کو شامل کیا گیا ہے جن کا جاننا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے اس انسائیکلوپیڈیا کو اپنے والد بزرگوار سید عاشم علی کے نام منسوب کیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کے آخر میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے اس میں صرف چلیپائی ناموں کی فہرست دی گئی ہے۔

کئی جلدوں پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا اسلام

یہ انسائیکلوپیڈیا پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام مکمل کی گئی ابتدا میں اس کے مدیر مولوی محمد شفیع تھے ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اس کے مدیر بنے یہ انگریزی کی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا اردو ترجمہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ برصغیر کے حوالے سے بھی اس میں خاصا مواد شامل کر دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک کامیاب کوشش ہے کہ دنیائے اسلام کے بارے میں اردو میں اتنا بڑا کام کیا گیا ہے۔ اس کام کی ابتدا 1950ء میں ہوئی تھی۔

پاکستان کی پہلی عالمی شہرت یافتہ تاریخ دان

عائشہ جلال پاکستان کی پہلی تاریخ دان ہیں جنھیں عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی پہلی کتاب انفرادی ترجمان (Sole Spokesman) ہے۔ اس میں انھوں نے تقسیم ہند اور قائداعظم کے سیاسی کردار کا جائزہ لیا ہے۔

کمال فن ایوارڈ

اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے کمال فن ادبی ایوارڈ کا اجرا 1997ء میں کیا گیا۔ یہ لائف اچیومنٹ ایوارڈ ہے اور اس کی مالیت 5 لاکھ روپے ہے۔ یہ پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں کی زندگی بھر کی خدمات کے صلے میں دیا جاتا ہے۔ اس کا پہلا ایوارڈ نامور شاعر، صحافی، ادیب، احمد ندیم قاسمی کو دیا گیا۔ یہ ایوارڈ ہر سال کسی بھی ایک پاکستانی اہل قلم کو زندگی بھر کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جاتا ہے کمال فن ایوارڈ دینے کے سلسلے میں مصنفین کے پینل کے انتخاب کا اختیار اکادمی پاکستان کے چیئرمین کے پاس ہے۔

1997ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کے اس وقت کے چیئرمین اور مشہور صحافی اور تجزیہ نگار جناب نذیر ناجی کی تجویز پر وزیر اعظم میاں نواز شریف کی حکومت نے اس ادبی ایوارڈ کا اجرا کیا۔

پہلا شاہ فیصل ایوارڈ

پاکستان میں پہلا شاہ فیصل ایوارڈ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے 1977ء میں حاصل کیا۔ سعودی عرب کے جاری کردہ اس ایوارڈ کا مقصد دنیا بھر میں اسلام کے فروغ کا اہم ذریعہ بننا ہے۔ یہ دنیا کا دوسرا، اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ایوارڈ ہے انعامی رقم

3 لاکھ ریال ہے، دوسرا ایوارڈ سینیٹر پروفیسر خورشید احمد کو مارچ 1990ء میں دیا گیا۔

صدارتی انعام برائے نمایاں خدمات

تخلیقی ادب کو فروغ دینے کے لیے 1958ء میں مرکزی حکومت نے صدارتی انعام کا اعلان کیا۔ یہ انعام ہر سال 14 اگست کے موقع پر ادب کے شعبہ میں نمایاں خدمات انجام دینے والے شخص کو دیا جاتا ہے پہلا صدارتی انعام ملک کے مشہور شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری کو دیا گیا۔

اب اس کا دائرہ کار ادب کے علاوہ نشر و اشاعت، نرسنگ، سائنسی ایجادات، ریسرچ، کاشی گری، ڈراما اور فوٹو گرافی کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں تک بڑھا دیا گیا ہے۔

اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والے پہلے وزیر

مسٹر جوگندر ناتھ منڈل وزیر قانون پاکستان کے پہلے وزیر تھے جن کا تعلق اقلیتی فرقے (اچھوت) سے تھا۔ انھوں نے 10 اگست 1947ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس کی صدارت کی۔ قیام پاکستان پر انھیں وزیر قانون اور محنت مقرر کیا گیا۔ 8 اکتوبر 1950ء کو انھوں نے کلکتہ پہنچ کر اپنا استعفیٰ بھیجا جسے حکومت پاکستان نے 15 اکتوبر 1950ء کو منظور کر لیا۔

اقلیتی امور کے پہلے وزیر

راجا تری دیو رائے پاکستان کے پہلے اقلیتی امور کے وزیر تھے۔ وہ 15 اگست 1973ء تا 1974ء اس عہدے پر فائز رہے۔

پہلے سیکرٹری جنرل حکومت پاکستان

چودھری محمد علی حکومت پاکستان کے پہلے سیکرٹری جنرل تھے ان کا تقرر اگست 1947ء میں ہوا۔ وہ 5 جولائی 1905ء کو تنگل انبیا (جالندھر) میں پیدا ہوئے۔ والد کاشتکار تھے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول جالندھر سے میٹرک اور اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا اور کچھ دیر اسلامیہ کالج میں استاد بھی رہے۔ پھر انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس میں ملازمت اختیار کر لی۔ 1936ء میں بہاولپور ریاست کے اکاؤنٹنٹ جنرل بنے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جو وزارت دفاع میں فنانشل ایڈوائزر رہے۔ تحریک پاکستان کے دوران ان کا رابطہ قائداعظم کے ساتھ کرایا گیا قیام پاکستان کے بعد پارٹیشن کمیٹی میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ اثاثوں کی تقسیم کے سلسلے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اکتوبر 1951ء میں وزیر خزانہ مقرر ہوئے 1955ء میں قانون ساز اسمبلی کے رکن اور 12 اگست 1955ء کو وزیر اعظم

کالونی جو بادشاہ کے نام پر آباد کی گئی

1964ء میں شاہ سعود پاکستان کے دورے پر آئے تو ان کا پاکستان بھر میں گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ انھوں نے کراچی میں مہاجرین کی آبادی کے لیے ایک بستی قائم کرنے کا اعلان کیا جس کا نام سعود آباد رکھا گیا۔

قومی شاعر جن کے نام پر ہوائی اڈے کا نام رکھا گیا

25 اپریل 2002ء کو سول ایوی ایشن اتھارٹی نے لاہور کے بین الاقوامی ہوائی اڈے کا نام عالمی شہرت یافتہ پاکستان کے قومی شاعر علامہ اقبال کے نام پر علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئر پورٹ رکھا۔ اس اعتبار سے علامہ اقبال پہلے شاعر ہیں جن کے نام پر ایئر پورٹ کا نام رکھا گیا ہے۔

پاکستان کا عہدہ سنبھالا۔ 1956ء کے آئین کی تیاری میں اہم کردار ادا کیا۔ ان ہی کے عہد میں پاکستان کا پہلا آئین بنا۔ 1958ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد 1960ء میں ایوب خان کے دستوری سوال نامے کا جواب سب سے پہلے انھوں نے دیا۔ 1964ء میں محترمہ فاطمہ جناح کی صدارتی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پاکستان کے بارے میں ایک گراں قدر کتاب Emergence of Pakistan لکھی جس کا اردو ترجمہ 'ظہور پاکستان' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یکم دسمبر 1980ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔

سیکرٹریوں کا پہلی بار براہ راست تقرر

پاکستان کی سول سروس کی تاریخ میں پہلی بار مرکزی حکومت نے ستمبر 1972ء میں سیکرٹری، ایڈیشنل سیکرٹری، جائنٹ سیکرٹری اور ڈپٹی سیکرٹری کی اسامیوں کی بھرتی کے لیے ملک کے سرکردہ اخبارات میں اشتہار دیا۔ حکومت کی جانب سے فارن سروس میں منسٹر 10، قونصلر، فرسٹ سیکرٹری، سیکنڈ سیکرٹری اور تھرڈ سیکرٹری کی اسامیوں کے لیے بھی اشتہار دیا گیا۔ فارن سروس کی ان اسامیوں کی بھرتی کے لیے آزادی کے فوراً بعد بھی اخبارات میں تشہیر کی گئی تھی۔ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کی طرف سے جاری کیے جانے والے اشتہار کے مطابق سرکاری ملازمین کی صورت میں تقرر دو سال کے لیے آزمائشی طور پر کیا گیا۔ اسامیوں کی تعداد یہ تھی سیکرٹری 5، ایڈیشنل سیکرٹری، جوائنٹ سیکرٹری 20، ڈپٹی سیکرٹری 40، منسٹر 10، قونصلر 15، فرسٹ سیکرٹری 20 سیکنڈ سیکرٹری 20 اور تھرڈ سیکرٹری 20۔

سیکرٹری کے عہدہ کے لیے کم از کم تعلیمی قابلیت کا معیار (کسی بھی) منظور شدہ یونیورسٹی کا گریجوایٹ مقرر کیا گیا۔ اس کے لیے تجربے کی جو شرط رکھی گئی اس کے مطابق اکیس سالہ تجربہ اور عمر پچاس اور پچپن کے درمیان ہونی چاہیے۔

پاکستان کی جوہری توانائی کا پہلا بجلی گھر

28 نومبر 1972ء کو پاکستان کی جوہری توانائی کے پہلے مرکز نے کراچی میں کام شروع کر دیا۔ یہ ایک لاکھ پچیس ہزار کلو واٹ بجلی پیدا کر رہا ہے۔ کراچی سے یہ اسٹیشن 15 میل دور واقع ہے۔ اس کی تعمیر کا منصوبہ 1964ء میں تیار ہوا۔ حکومت کینیڈا نے اس منصوبے پر اٹھنے والے غیر ملکی زرمبادلہ کی ضرورت پورا کرنے کے لیے ساٹھ ملین ڈالر قرض دیا اور ایٹمی بجلی گھر کی تکمیل کے لیے مئی 1965ء میں کینیڈا کی جنرل الیکٹرک کمپنی کو ٹھیکا دیا گیا۔ جولائی 1966ء میں اس منصوبہ پر عمل شروع ہوا اور جولائی 1970ء میں تعمیرات اور آلات کی تنصیب کا کام ختم ہو گیا اور اس کے بعد ایٹمی بجلی پیدا کرنے کی کارروائی شروع ہوئی۔ اس سے یکم اگست 1971ء کو پہلی دفعہ ایٹمی بجلی حاصل کی گئی اور صرف ایک سال بعد یعنی 4 اکتوبر 1972ء کو یہ بجلی گھر 137 ڈبلیو ایم بجلی پیدا کرنے لگا۔ 28 نومبر 1972ء کو اس کا افتتاح ہوا۔

بادشاہ جس کا مقبرہ تعمیر کیا گیا

قطب الدین ایبک اس اعتبار سے پہلا بادشاہ ہے جس کا مقبرہ حکومت پاکستان نے تعمیر کرایا۔ یکم اپریل 1962ء کو اس کے مقبرے کے ڈیزائن کی تیاری کا اعلان کیا گیا۔

اُردو کی خوب صورتی اس کے محاورے اور کہاوتیں بڑھاتی ہیں
آئیے کہاوتوں کے بننے کے پس منظر کو جانتے ہیں
کہاوتیں بننا کوئی اتنا آسان کام بھی نہیں ہے

کہاوتوں کی دلچسپ کہانیاں

پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی

"دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہونا یا ہو جانا"

اس کہاوت کا مطلب ہے انصاف ہونا اور یہ ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جب سچ اور جھوٹ الگ ہو جائیں اور ہر کسی کو اس کے اچھے یا برے کام کا بدلا ملے۔

اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک گوالا بڑا بے ایمان تھا اور دودھ میں پانی ملا کر بیچا کرتا تھا۔ بہت جلد اس نے اچھے خاصے پیسے جمع کر لئے۔ ایک روز اس نے ساری رقم ایک تھیلی میں ڈالی اور اپنے گاؤں کی طرف چلا۔ گرمی کا موسم تھا۔ پسینہ چوٹی سے ایڑی تک بہہ رہا تھا۔ گوالے کے راستے میں ایک دریا پڑا۔ اس نے سوچا چلو نہا لیتے ہیں۔ روپوؤں کی تھیلی اس نے ایک درخت کے نیچے رکھی۔ تھیلی پر کپڑے ڈال دیئے اور لنگوٹ کس کر پانی میں کود پڑا۔ اس علاقے میں بندر بہت پائے جاتے تھے۔ اتفاق کی بات ایک بندر درخت پر چڑھا یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ گوالے کے پانی میں اترتے ہی بندر درخت سے اترا اور روپوؤں کی تھیلی لے کر درخت کی ایک اونچی شاخ پر جا بیٹھا۔ گوالا پانی سے نکلا اور بندر کو ڈرانے لگا، لیکن بندر نے تھیلی کھولی اور روپے ایک ایک کر کے ہوا میں اڑانے لگا۔ درخت دریا کے کنارے سے بہت قریب تھا اور روپے اُڑ اُڑ کر پانی میں گرنے لگے۔ گوالے نے روپوؤں کو پکڑنے کی بہت کوشش کی، لیکن پھر بھی آدھے روپے پانی میں جا گرے۔ راستہ چلتے لوگ جو گوالے کی بے ایمانی سے واقف تھے اور یہ تماشا دیکھنے لئے جمع ہو گئے۔ گوالے کی چیخ و پکار سن کر کہنے لگے، "دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا۔" یعنی گوالے نے جو آدھے پیسے دودھ میں پانی ملا کر بے ایمانی سے کمائے تھے وہ پانی میں مل گئے۔

"ناؤ میں خاک اڑانا"

ناؤ کا مطلب ہے کشتی۔ اب آپ کہیں گے کہ کشتی میں خاک یعنی مٹی بھلا کوئی کیسے اڑا سکتا ہے۔ یہ تو بے تکی بات ہوئی، تو جناب اس کہاوت کا مطلب ہے بے تکا بہانہ بنانا۔ یہ کہاوت ایسے موقع پر

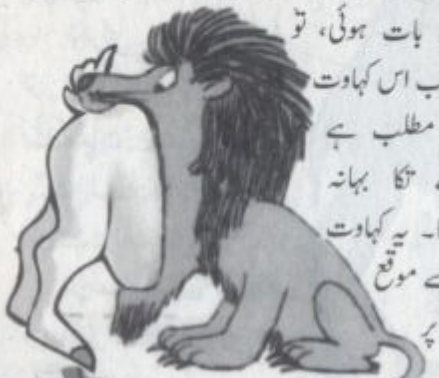

بولی جاتی ہے جب کوئی شخص ایک ناحق بات کہے اور پھر اسے صحیح ثابت کرنے کے لئے الٹے سیدھے بہانے تراشے یا کوئی کسی پر ظلم کرنے کے لئے بے تکی دلیل دے۔

اس کا قصہ بھی سنیے۔ ایک کشتی میں شیر اور بکری اکٹھے دریا پار جا رہے تھے۔ بکری کو دیکھ کر شیر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے سوچا کہ کسی بہانے سے اسے ہڑپ کرنا چاہیے۔ آخر کوئی بہانہ نہ ملا تو بولا، "اے نالائق! ناؤ میں خاک کیوں اڑا رہی ہو؟ اگر میری آنکھ میں خاک چلی گئی تو؟" بکری نے جواب دیا، "ناؤ میں بھلا خاک کہاں؟" اس پر شیر بولا، "بدتمیز، زبان چلاتی ہے۔" اور اسے کھا گیا۔

بھیگی بلی بن جانا یا بھیگی بلی بتانا

اس محاورہ کا مطلب ہے کمزور اور سیدھا سادہ بن جانا یا ڈر کر چپ ہو جانا۔ اسے یوں بھی بولتے ہیں بھیگی بلی بتانا۔ جس کا مطلب ہے سستی کی وجہ سے بہانہ کرنا، ٹالنا، کام نہ کرنے کے لیے کوئی بہانہ کر دینا، کام چوری کرنا۔ اگر کوئی شخص کام کو ٹالنے کے لیے کوئی بہانہ کرے تو کہا جا سکتا ہے، "یہیں پر بیٹھے بیٹھے بھیگی بلی بتا رہے ہو۔" اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک صاحب نے اپنے نوکر سے لیٹے لیٹے پوچھا، کیا باہر بارش ہو رہی ہے؟

نوکر بھی چارپائی پر پڑا اینڈ رہا تھا۔ نیند آ رہی ہو تو کس کا جی اٹھنے کو چاہتا ہے۔ اس نے وہیں پڑے پڑے کہہ دیا، "ہاں جی ہو رہی ہے۔"

ان صاحب نے کہا، "تم عجیب آدمی ہو۔ باہر گئے نہیں اور دیکھے بغیر کہہ دیا کہ ہاں ہو رہی ہے۔"

نوکر نے جلد بہانہ کیا، "ابھی بلی باہر سے آئی تھی۔ میں نے دیکھا تو وہ بھیگی ہوئی تھی۔"

حساب جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں

مطلب یہ کہ تھوڑا علم خطرناک ہوتا ہے۔ یہ کہاوت اس وقت بولی جاتی ہے جب کوئی شخص تھوڑا سا علم حاصل کر کے خود کو بہت قابل سمجھے اور جب اس علم پر عمل کرنے بیٹھے تو اپنی بے وقوفی کی وجہ سے نقصان اٹھائے، مگر نقصان کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آئے۔

اس کی کہانی یہ ہے کہ ایک صاحب زادے نے حساب کا علم سیکھنا شروع کیا۔ ایک روز استاد نے اوسط کا قاعدہ بتایا۔ انہوں نے اسے رٹ لیا۔ شام کو گھر گئے تو گھر والے دریا پار جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ یہ حضرت بھی ساتھ ہو لیے۔ دریا کے کنارے پہنچنے پر گھر والوں نے کشتی تلاش کرنی شروع کی۔ یہ صاحب زادے اوسط کا قاعدہ پڑھ چکے تھے۔ جب کشتی والوں سے انہیں معلوم ہوا کہ دریا کناروں سے دو دو فٹ گہرا ہے اور درمیان میں آٹھ فٹ تو فوراً دونوں کناروں کی گہرائی یعنی دو اور دو چار فٹ اور درمیان کی گہرائی آٹھ فٹ جمع کر کے کل بارہ فٹ کو تین پر تقسیم کر دیا۔ جواب آیا "اوسط گہرائی چار فٹ"۔ اس قاعدے سے تو دریا کی گہرائی بالکل کم تھی۔ اس لئے انہوں نے خوشی خوشی گھر والوں کو بتایا کہ کشتی کا کرایہ بچ جائے گا۔ بغیر کشتی کے بھی دریا پار کیا جا سکتا ہے۔ میں نے حساب لگا کر دیکھا

ہے۔ اس دریا کی اوسط گہرائی چار فٹ ہے۔ یہ سن کر گھر والے دریا پار کرنے کو تیار ہو گئے۔ پورا کنبہ یعنی گھر والے سامان لے کر دریا میں کود پڑے اور دریا کے بیچ میں پہنچ کر آٹھ فٹ گہرے پانی میں ڈوبنے لگے۔ کشتی والوں نے بڑی مشکل سے انہیں بچایا۔ صاحب زادے پانی میں شرابور کنارے پر پہنچے تو دوبارہ حساب جوڑا۔ وہی جواب آیا۔

پریشان ہو کر بولے، "حساب جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں؟"

یہ منہ اور مسور کی دال

اس کہاوت کا مطلب ہے کہ یہ منہ اس کام یا ذمہ داری کے قابل نہیں اور اسی منہ سے کہتے ہو کہ ہم یہ کریں گے ہم وہ کریں گے۔ یہ کہاوت اس وقت بولی جاتی ہے جب کسی سے یہ کہنا ہو کہ تم نالائق ہو اور فلاں کام نہیں کر سکتے۔

اس کا قصہ بھی سنیے۔ کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ کا باورچی ایک نواب کے ہاں نوکر ہو گیا۔

نواب نے اس سے پوچھا، "تم کیا چیز سب سے اچھی پکاتے ہو؟"

وہ بولا، "مسور کی دال ایسی مزیدار پکاتا ہوں کہ جو کھاتا ہے انگلیاں چاٹتا رہ جاتا ہے۔"

نواب نے کہا، "اچھا کل ہمارے ہاں دعوت ہے۔ کل ہی مسور کی دال پکا کر دکھاؤ تو جانیں۔"

باورچی نے حامی بھر لی۔ اگلے روز شامیانہ بندھا۔ مہمان آئے۔ باورچی نے مسور کی دال طشتری میں نکال کر پیش کی۔ پورا شامیانہ مہک اٹھا۔ نواب صاحب آئے۔ دال چکھی۔ واقعی ایسی ذائقے دار اور مزیدار دال کبھی نہ کھائی تھی۔ اش اش کر اٹھے، لیکن تھے آخر کو کنجوس، خرچ کا خیال آ گیا۔ بادشاہ ہوتے تو خرچ کی فکر نہ کرتے، لیکن باورچی بادشاہ کے محل میں کام کر چکا تھا۔ دل کھول کر خرچ کرنے کا عادی تھا۔ اس لیے جب نواب صاحب نے پوچھا کہ دال تو بہت مزے کی ہے، مگر خرچ کتنا اٹھا، تو باورچی کو بہت برا لگا۔

ضبط کر کے بولا، "دو آنے کی دال ہے، بتیس روپے کا مسالا ہے۔"

سستا زمانہ تھا۔ نواب صاحب اتنی مہنگی دال کا سن کر چیخ پڑے، "کیا کہا! بتیس روپے دو آنے کی مسور کی دال!"

باورچی تو بھرا بیٹھا تھا۔ طیش میں آ کر جیب سے بتیس روپے دو آنے نکال کر رکھ دیے اور دال کا برتن زمین پر پٹخ دیا اور کہا، "اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔"

یہ کہہ کر چلا گیا۔ کہتے ہیں کہ دال شامیانے کے جس بانس پر گری تھی وہ کچھ روز بعد مسالے کے اثر سے سرسبز ہو گیا اور اس طرح یہ کہاوت مشہور ہو گئی۔

چور کے گھر مور یا چور کو مور پڑنا

یعنی خود چور کے گھر چوری ہو گئی۔ یہ کہاوت اس

وقت بولی جاتی ہے جب کوئی شخص بے ایمان کے ساتھ بے ایمانی کرے یا کسی ٹھگ کو کوئی شخص ٹھگ لے۔

مور ایک ایسا پرندہ ہے جو چھوٹے موٹے سانپ کھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں ایک چور نے ایک قیمتی ہار چوری کیا اور گھر میں لا کر ایک طرف ڈال دیا۔ گھر میں مور تھا۔ مور نے ہار کو سانپ سمجھ کر نگل لیا۔ چور نے یہ معاملہ دیکھا تو بولا، "بہت خوب! چور کے گھر مور۔" اس کہاوت کو یوں بھی بولتے ہیں "چور کو مور پڑ گئے۔"

بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا

لنڈورا یعنی دم کٹا۔ مطلب یہ کہ کسی کام میں نقصان ہو جائے تو مزید نقصان سے بچنے کے لئے اس کام کو چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ کہاوت اس وقت بولی جاتی ہے جب کوئی چالاک شخص اپنی چکنی چپڑی باتوں سے کسی کو دھوکا دینا چاہے اور وہ اس سے ایک دفعہ نقصان اٹھا چکنے کی وجہ سے دوبارہ اس کی باتوں میں نہ آئے۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک بلی نے ایک چوہے کو پکڑنے کے لئے چھلانگ لگائی۔ چوہا جھکائی دے کر بچ نکلا مگر پھر بھی بلی نے جاتے جاتے ایک پنجہ مار کر اس کی دم اکھیڑ لی۔ چوہا جان سلامت لے کر بل میں پہنچا تو خدا کا شکر ادا کیا اگرچہ اسے لنڈورا ہونے کا بے حد دکھ تھا۔ بلی بہت کائیاں تھی۔ اس نے ہاتھ آئے شکار کو یوں جاتے دیکھا تو ایک چال چلی۔ چوہے کے بل کے پاس جا کر بولی، "ارے بھانجے، تو مجھ سے خواہ مخواہ ہی ڈر گیا۔ میں تو تیری خالہ ہوں۔ تجھ سے مذاق کر رہی تھی۔ چل آ باہر آ تیری دم جوڑ دوں۔ لنڈورا بہت برا معلوم ہوگا۔" مگر چوہا بھی بہت سیانا تھا۔ بلی کی نیت بھانپ کر بولا، "بخشو بی خالہ بلی! میں لنڈورا ہی بھلا"

ٹیڑھی کھیر ہونا

یعنی مشکل کام ہے۔ یہ کہاوت ایسے وقت بولتے ہیں جب کوئی ٹیڑھا اور بہت مشکل کام سر پر آن پڑے۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے کھیر پکائی۔ سوچا اللہ کے نام پر کسی فقیر کو بھی تھوڑی سی کھیر دینی چاہیے۔ اسے جو پہلا فقیر ملا وہ اتفاق سے نابینا تھا اور اس فقیر نے کبھی کھیر نہیں کھائی تھی۔ جب اس شخص نے فقیر سے پوچھا، "کھیر کھاؤ گے؟"

تو فقیر نے سوال کیا، "کھیر کیسی ہوتی ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا، "سفید ہوتی ہے۔"

اندھے نے سفید رنگ بھلا کہاں دیکھا تھا۔ پوچھنے لگا، "سفید رنگ کیسا ہوتا ہے؟"

اس شخص نے کہا، "بگلے جیسا۔"

فقیر نے پوچھا، "بگلا کیسا ہوتا ہے؟" اس پر اس شخص نے ہاتھ اٹھایا اور انگلیوں اور ہتھیلی کو ٹیڑھا کر کے بگلے کی گردن کی طرح بنایا اور بولا، "بگلا ایسا ہوتا ہے۔" نابینا فقیر نے اپنے ہاتھ سے اس شخص کے ہاتھ کو ٹٹولا اور کہنے لگا، "نہ بابا یہ تو بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔ یہ گلے میں اٹک جائے گی۔ میں یہ کھیر نہیں کھا سکتا۔"

"مقبولیت کی معراج"

نیم حجازی کے ناول "شاہین" کی ڈرامائی تشکیل کیونکر ایک طویل اور شاہکار نظم "آہ نامہ" کی تخلیق کا باعث بنی!

ابوفرحان فاروقی

ایک زمانہ تھا کہ پی ٹی وی کے ڈرامے عوام میں اتنے مقبول تھے کہ جب ڈرامے کا وقت ہو تا تو لوگ گھروں کا رخ کرتے تا کہ ڈرامہ دیکھ سکیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں وائی ایم سی اے گراؤنڈ سے صدر پہنچا تا کہ جلدی سے کچھ سودا خرید کر بس میں بیٹھ کر کیماڑی پہنچوں۔ کراچی کی وکٹوریہ اسٹریٹ پر دو تین لڑکے جن کی عمریں 14 تا 16 سال تھیں میرے آگے آگے تیز تیز چل رہے تھے۔ ان لڑکوں کا تعلق گوا سے آ کر کراچی میں بس جانے والی مسیحی کمیونٹی سے تھا۔ عموماً یہ لوگ آپس میں انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت بازار میں یہ لڑکے آپس میں کراچی کی مکسڈ اردو میں بات کر رہے تھے۔ ایک لڑکا جو سب سے تیز چل رہا تھے مڑ مڑ کر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا اڑے یار جلدی کرو آج واٹرس آئے گا (اس کا اشارہ ڈرامہ وارث کی طرف تھا)۔

میں چونکہ وائی سی ایم اے کی اسپورٹس کمیٹی کا فعال ممبر تھا، اس لئے وائی ایم سی اے کے چیئرمین اسپورٹس کمیٹی صادق وہاب الدین تقریباً ہر اسپورٹس ایکٹویٹی میں مجھے ساتھ رکھتے تھے۔ ان دنوں قصبہ کالونی میں نارو بجنین یوتھ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام ایک اسپورٹس کمپلیکس زیر تعمیر تھا۔ صادق صاحب نے راقم الحروف سمیت کراچی کے چند معروف اسپورٹس ماہرین جیسے استاد مسرور، سید شبیہ الحسن، سید عابد حسین، ارشد سلیم، جنگ کے اسپورٹس میگزین کے انچارج عبدالوحید حسینی، ڈان کے ماجد خان، انیس الرحمٰن، اور غالباً ہاکی کے معروف انٹرنیشنل امپائر شمس الزماں کو بھی دعوت دے رکھی تھی۔ ہمارے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے جن کے نام ذہن میں نہیں آ رہے۔ ہم نے سارا دن وہیں گزارا، بچوں کے میچ وغیرہ بھی دیکھے۔ واپسی پر ہم سب بس میں واپس وائی ایم سی اے آ رہے تھے تو ہمارے ساتھ مسیحی کمیونٹی کی چند خواتین بھی تھیں۔ وہ بار بار ڈرائیور سے کہہ رہی تھیں کہ بس تیز چلائے کیوں کہ اس دن وارث ٹی وی پر دکھایا جانے والا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم سب کو یہی بے چینی تھی۔ یہ تھا اس ڈرامے کی مقبولیت کا عالم۔

اس زمانے میں لوگوں کے لئے سب سے بڑی تفریح پاکستانی ڈرامے دیکھنا تھا۔ انھیں دنوں 80ء میں، میں سعودیہ چلا گیا۔ تو وہاں جس بھارتی کو دیکھا، مسلمان ہو یا ہندو، وہ پاکستانی ڈراموں کا رسیا تھا۔ یہاں تک کہ کیرالہ کے لوگ جنہیں ٹھیک سے اردو بولنا بھی نہیں آتی پاکستانی ڈراموں کے شوقین تھے۔ شہناز شیخ کی لاجواب اداکاری کی وجہ سے بھارتی اس کا نام بڑے احترام سے لیا کرتے۔ شاید بھارتی فلم مغل اعظم کو اتنے پاکستانیوں نے نہیں دیکھا ہوگا جتنا کہ پاکستان کے چند معروف ڈراموں کو بھارتی عوام نے دیکھا اور پسند کیا۔ خواجہ اینڈ سن، ان کہی، اور کئی

دیگر ڈرامے بے انتہا مقبول ہوئے۔

پھر پی ٹی وی پر نسیم حجازی کے مشہور ناول شاہین پر مشتمل ڈرامہ سیریل نے تو تہلکہ مچا دیا۔ سعودیہ کے مشہور انگریزی اخبار سعودی گزٹ کے اسسٹنٹ مینیجنگ ایڈیٹر جناب طارق غازی جو کہ مشہور بھارتی صحافی حامد اللہ غازی کے صاحبزادے اور کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ کے سابق استاد ڈاکٹر عابداللہ غازی کے چھوٹے بھائی ہیں جدہ کی معروف اور ہر دلعزیز شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے شاہین سے متاثر ہو کر اپنی مشہور و معروف اور شاہکار طویل نظم "آہ نامہ" لکھی۔ جو جدہ میں منعقد ہونے والی تقریب میں سنائی گئی۔ مختلف لوگوں نے نظم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ راقم الحروف نے بھی اپنی فہم کے مطابق نظم پر تبصرہ پیش کیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ اس نظم میں حالی کی مسدس کی طرح قوم کی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن ان کو دور کرنے کے لیے مثبت اور ٹھوس تجاویز کا فقدان ہے۔ چنانچہ آئندہ چند ماہ کے دوران طارق غازی صاحب نے چند مزید بندوں کا اضافہ کیا اور اس خامی کو دور کیا۔ دوبارہ ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں مکمل "آہ نامہ" دوبارہ سنائی گئی۔ پاک بھارت کے جدہ میں مقیم تقریباً سبھی دانشور اور علمی و ادبی شخصیات نے اس تقریب میں شرکت کی اور طارق غازی صاحب کی دلنواز اور عقل کشا کاوش کو حسب ظرف و علم سراہا۔

اس موقع پر دیگر تبصرہ نگاروں کے علاوہ طارق غازی صاحب کی بیگم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا جو کہ طارق صاحب کے لیے باعث حیرانی تھا کیونکہ تقریب کے منتظمین نے انھیں اس سے بالکل بے خبر رکھا تھا۔ ان کی بیگم نے بتایا کہ پچھلے دو سال طارق صاحب دن رات مطالعہ میں مصروف رہے اور ان پر ایک خاص کیفیت طاری رہی۔ سونے کا وقت مقرر تھا نہ جاگنے کا۔ لوگوں سے ملنا جلنا بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ رات کو بار بار سوتے سے اُٹھ کر کچھ لکھنے بیٹھ جاتے۔ خواب و خور تک کا ہوش نہ تھا۔ خدا خدا کر کے یہ نظم مکمل ہوئی تو طارق صاحب کی روزمرہ کی مصروفیات پرانے ڈھب پر آئیں۔

آج کل کے ڈرامے جانے کیوں اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ گلیمر کو ہائی لائٹ کیا جاتا ہے لچر اور بازاری زبان بھی استعمال ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ ڈرامے ایک مخصوص طبقے کے لیے لکھے جا رہے ہیں نہ کہ عام آدمی کے لیے۔ لباس کے معاملے میں بھی کراچی سے شروع ہونے والی فیشن پریڈ، کیٹ واک، اور بے لباسی کی حد تک برائے نام لباس کے بہت بُرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

ان دنوں مختلف ٹی وی چینلز پر ترکی ڈراموں کے ترجمے دکھانے کا مقابلہ جاری ہے۔ خاص طور پر تاریخی ڈرامے ''میرا سلطان'' کا بہت چرچا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ کوئی بھی سرکاری یا پرائیویٹ چینل شاہین، آخری چٹان اور محمد بن قاسم جیسے تاریخی ڈراموں کو دوبارہ سے ٹیلی کاسٹ کرے۔ 80ء کی دہائی میں بننے والے یہ ڈرامے آج بھی تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوں گے۔ ان کی خوب صورتی اور ڈرامائی تشکیل ہی نہیں بے حد موثر پیغام بھی تھا جو ان کے کرداروں اور کہانی کے ان ناظرین کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا۔

کاش میرے پاس بھی ڈورے مون کا گیجٹ ہوتا!

Doraemon کے اثرات پاکستانی بچوں پر

بچوں کی پسند اور جنون میں فرق پہ بات کرتی ایک سادہ سی تحریر

زینب محمود

آج کل آپ کسی بھی بچے سے پوچھیں کہ آپ کا پسندیدہ کارٹون پروگرام کون سا ہے تو وہ جھٹ سے Doraemon کا نام لے گا اور یہ صرف پسندیدہ پروگرام تک ہی محدود نہیں بلکہ بچوں کو ہر چیز میں ڈورے مون چاہیے اور مارکیٹ میں بھی بچوں کا کریز دیکھتے ہوئے نہ صرف مختلف اقسام کے کھلونے ڈورے مون یا اُس کے کرداروں کی شکل میں دستیاب ہیں۔ بلکہ بنیادی ضرورت کی چیزوں میں بھی ڈورے مون چھا چکا ہے۔ ڈورے مون والا اسکول بیگ، پنسلیں، کاپیاں، پانی کا تھرماس، ٹفن کا ڈبا، کلائی کی گھڑیاں، وال کلاک، ڈورمیٹ، لیمپ اور نہ جانے کون کونسی اشیا دستیاب ہیں۔ یہاں تک کہ اب تو ڈورے مون کی شکل والا موبائل بھی مارکیٹ میں دستیاب ہے اور یہ صرف اسکول جانے والے بچوں کا ہی شوق نہیں بلکہ چھوٹے بچے جو ٹھیک سے بولنا چالنا بھی نہیں جانتے مگر ٹی۔وی پہ ڈورے مون والے کارٹون دیکھ کر ڈورے مون والے کھلونے لینے کی ضد کرتے ہیں اور ماں باپ بچوں کا کریز دیکھ کر انھیں یہ سب دلانے پر مجبور ہیں۔ درحقیقت ڈورے مون ایک جاپانی کارٹون سیریز ہے جو کہ جاپانی کارٹونسٹ Fujiko

سستی کا مارا ڈورے مون

یہ ایک ایسے بچے Nobita کی کہانی ہے جسے نہایت سُست دکھایا گیا ہے۔ ہروقت روتا یا سوتا رہتا ہے۔ وہ پڑھائی میں نالائق ہے، کبھی اپنا ہوم ورک نہیں کرتا، چھٹیوں میں کوئی بھی اسے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا کیونکہ وہ بہت سست ہے

Fujio کی تخلیق ہے۔ یہ سب سے پہلے 1969ء میں شائع ہوئی اور اس کی مقبولیت کی بنا پر اسے جاپان کے 6 بڑے میگزینز کی زینت بنایا گیا۔ ٹیلی ویژن پر اسے پہلی بار یکم اپریل 1973ء کو "Asahi" ٹیلی ویژن نیٹ ورک پہ پیش کیا گیا۔ یہ ایک ذہین روبوٹ بلی کی داستان ہے جو وقت میں پیچھے کی طرف سفر کرتے ہوئے 22ویں صدی سے ہماری دنیا میں آیا ہے۔ جو ایک چوتھی جماعت کے بچے Nobita Nobi کے پاس رہتا ہے اور اپنے مختلف ''جادوئی گیجٹس'' سے اُس کی اور اُس کے دوستوں کی مدد کرتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک مزاحیہ کارٹون پروگرام ہے۔ انڈیا میں ڈورے مون کا ہندی ترجمہ پہلی بار 2005ء میں ہنگامہ T.V نے پیش کیا اور بعدازاں ڈزنی ٹی۔وی نے اسے 2010ء میں پیش کیا اور Disney T.V نے مارچ سے ڈورے مون کی بالکل نئی اقساط پیش کیں۔ تبھی سے یہ انڈیا کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی کیبل نیٹ ورک پہ دکھایا جاتا ہے اور پاکستانی بچوں کا جنون بن چکا ہے۔

مجھے ذاتی طور پر ڈورے مون کی کچھ باتوں پر اعتراض ہے۔ ایک تو یہ ایک ایسے بچے Nobita کی کہانی ہے جسے نہایت سُست دکھایا گیا ہے۔ ہروقت روتا یا سوتا رہتا ہے۔ وہ پڑھائی میں نالائق ہے، کبھی اپنا ہوم ورک نہیں کرتا، چھٹیوں میں کوئی بھی اسے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا کیونکہ وہ بہت سست ہے اور پھر ڈورے مون کے مختلف گیجٹس کی مدد سے کام نکالتا ہے اور غلط کام کرکے مشکل میں پڑا رہتا ہے۔ یہ بات بچوں پر منفی اثر پیدا کر رہی ہے۔ میں نے خود بہت سے بچوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ کاش ہمارے پاس بھی کوئی ڈورے مون کا گیجٹ ہوتا تو ہمارا کام بھی آسان ہو جاتا۔ مزید یہ کہ ڈورے مون کارٹون بھی ہندی زبان میں پیش ہوتے ہیں جس سے پاکستانی بچوں کی اردو بُری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ بچے اب اُردو میں انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی کے الفاظ بھی بڑی تعداد میں شامل کرنے لگے ہیں۔

کوئی کارٹون پروگرام دیکھنا بُرا نہیں ہے مگر اُس کو کریز بنا لینا غلط ہے۔ والدین کو چاہیے کہ بچوں کے اس کریز میں کمی لانے کے لیے اقدامات کریں۔ کیونکہ آج کل اسکول میں بھی بچے ڈورے مون ہی پر گفتگو کر رہے ہوتے ہیں اور اسی کی اشکال کی اشیاء جمع کرنے کے جنون میں مبتلا ہیں۔ کھیل میں بھی ڈورے مون کے کرداروں نوبتا، جیان، شزوکا، سنیو وغیرہ کی نقل کر رہے ہوتے ہیں۔ بچوں کی پسند اور جنون میں فرق ہونا چاہیے اور کسی بھی چیز یا پروگرام کو ایک حد میں رہتے ہوئے ہی پسند کرنا چاہیے۔

دنیا کی دوسری بلند ترین عمارت کا تذکرہ

مکہ کلاک ٹاور

30 کلومیٹر دور سے نظر آنے والے کلاک کی آواز میں ایسا کیا ہے جو سات کلومیٹر دور تک سنائی دیتی ہے

فقیر اللہ خاں

وہ گھڑی کتنی مبارک تھی جب دنیائے اسلام کے مقدس ترین شہر مکہ میں دنیا کی سب سے بڑی گھڑی کی تنصیب کے لیے بلند ترین کلاک ٹاور کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ کلاک ٹاور مسلمانوں کے مقدس مقام خانہ کعبہ کے پہلو میں رُکن یمانی سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر مقدس پہاڑی صفا کے پیچھے سڑک کے پار تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کلاک ٹاور کا سنگ بنیاد 2004ء میں رکھا گیا۔ 2012ء میں اس کلاک ٹاور کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ 1432ھ ماہِ رمضان کے مقدس ایام میں اس کلاک کو آزمائشی بنیادوں پر تین ماہ کے لیے چلایا گیا اور اگلے سال عیدالفطر 1433ھ کو اس کلاک کا باضابطہ طور پر سعودی فرماں رواشاہ عبداللہ نے افتتاح کیا۔

مکہ کا مقدس شہر جدہ سے 70 کلومیٹر کے فاصلے پر سطح سمندر سے 909 میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ خانہ کعبہ کے ساتھ جنوب کی جانب الجیاد قلعہ تھا جسے ترک عثمانی حکمرانوں نے اٹھارویں صدی عیسوی میں تعمیر کروایا تھا۔ بالکل اس جگہ سعودی حکومت نے موجودہ عظیم منصوبے کا پروگرام بنایا جس میں دنیا کے سب سے بلند کلاک ٹاور اور ہزاروں رہائشی کمروں کے علاوہ ایک پانچ ستارہ ہوٹل کی تعمیر کا منصوبہ شامل تھا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہاں پر پہلے سے موجود قلعے کو مسمار کرنا ضروری تھا۔ 2002ء میں الجیاد قلعے کی مسماری کا کام جب شروع ہوا تو ترک حکومت کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس کے علاوہ مغربی میڈیا نے صدائے احتجاج بلند کی کہ یہ ترکی کے ساتھ زیادتی ہے لیکن یہ سب واویلا بے سود ثابت ہوا کیونکہ اس وقت ترکی کے بجائے خانہ کعبہ کی تولیت سعودی خاندان کے پاس ہے اور خادم الحرمین کا تاج سعودی حکمرانوں کے سر پر سج چکا ہے۔

اس وقت پوری دنیا میں مکہ کلاک ٹاور دنیا کی دوسری بلند ترین عمارت ہے اور اس کی چوٹی پر نصب شدہ کلاک ساری دنیا میں سب سے بڑا کلاک ہے۔ مکہ کلاک ٹاور کی عمارت سے بلندی میں صرف برج دبئی ہی بلند ہے جس کی اونچائی 2718 فٹ ہے جب کہ مکہ کلاک ٹاور کی اونچائی 1972 فٹ (601 میٹر) ہے۔ یہ کلاک حجم کے لحاظ سے لندن کے بگ بین (Big Ben) سے چھ گنا بڑا ہے۔ مکہ کلاک ٹاور اس عظیم پراجیکٹ کا حصہ ہے جس میں 3000 کمروں والا ہوٹل بھی شامل ہے۔ جن میں 858 کمرے لگژری اپارٹمنٹس پر مشتمل ہیں۔ ان کمروں کی کھڑکیاں خانہ کعبہ کی طرف کھلتی ہیں، جہاں سے خانہ کعبہ اور مسجد الحرام کا روح پرور نظارہ ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔ حج کے ایام میں اس کمپلیکس میں 6500 زائرین قیام کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ 10 ہزار نمازیوں کے نماز پڑھنے کے لیے بھی ایک بہت بڑا ہال بنایا گیا ہے۔ اس پورے پراجیکٹ کی 123 منزلیں ہیں جن میں 120 زمین کے اوپر اور تین زیرِ زمین ہیں۔ نیچے تہ خانوں میں 1000 سے زائد گاڑیاں پارک کی جا سکتی ہیں۔ 76 منزلیں ہوٹل کے زیر استعمال ہیں۔ ایک منزل میں اسلامی میوزیم بھی بنایا گیا ہے۔ 20 منزلوں پر مشتمل ایک بہت بڑا شاپنگ مال بھی موجود ہے۔ اس کمپلیکس میں 96 برقی زینے ہیں۔ ان کے علاوہ لفٹس بھی نصب کی گئی ہیں۔ جن کی رفتار چھ میٹر فی سیکنڈ ہے۔

مکہ کلاک ٹاور زمین سے 1740 فٹ کی بلندی پر نصب کیا گیا ہے۔ کلاک کے ڈائیل ایریا کا رقبہ (141x141) 19881 مربع فٹ ہے، جب کہ کلاک کا قطر 128 فٹ ہے۔ منٹ کی سوئی 72 فٹ اور گھنٹوں

کی سوئی 56 فٹ لمبی ہے۔ کلاک کے اوپر موٹے حروف میں "اللہ اکبر" لکھا ہوا ہے۔ یہ کلاک 30 کلومیٹر کے فاصلے سے نظر آتا ہے۔ پورے کلاک کے سامنے والے حصے پر خوبصورت ٹائلیں لگائی گئی ہیں۔ کلاک کے فرش پر 21 لاکھ (دو ملین) LED لائٹس لگائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ کلاک کے اوپر 2100 سفید اور سبز رنگ کی روشنیاں بھی نصب کی گئی ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں جب رات کے وقت یہ لائٹس روشن ہوتی ہیں تو ان کے سامنے آسمان کے ستارے منہ چھپاتے دکھائی دیتے ہیں۔ رات کے وقت یہ کلاک ٹاور 20 کلومیٹر کے فاصلہ سے نظر آتا ہے۔ کلاک کی چھت پر سولہ (16) اہم لائٹس لگائی گئی ہیں جو بالکل عمودی آسمان کی طرف روشنی پھینکتی ہیں جو دس کلومیٹر تک آسمان کی بلندیوں تک چلی جاتی ہیں۔ اگر رات کے وقت پاکستان سے جدہ جاتے ہوئے دائیں جانب خانہ کعبہ کی طرف دیکھیں تو جہاز کی کھڑکی سے اتنا پُرلطف منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اس طرح محسوس ہوتا ہے گویا ہزاروں لاکھوں چاند اس دھرتی پر اتر آئے ہوں۔

کلاک کے فرش پر دونوں سوئیوں کے پس منظر میں سعودی حکومت کا قومی نشان دو تلواروں کے درمیان کھجور کا درخت بنایا گیا ہے۔ مسجد الحرام میں دی جانے والی پانچوں وقت کی اذان کی آواز اس کلاک ٹاور سے سات کلومیٹر کے فاصلے تک بخوبی سنی جا سکتی ہے۔ کلاک کی چھت کے اوپر 1833 فٹ کی بلندی پر ایک رصد گاہ بھی بنائی گئی جو یقیناً دنیا میں سب سے بلند رصد گاہ ہے۔ یہ رصد گاہ مسلمانوں کے مقدس مہینوں کا چاند دیکھنے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس رصد گاہ میں اتنی طاقتور دوربینیں نصب کی گئی ہیں کہ چاند کے لیے آنکھ مچولی کھیلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اس کلاک کا ڈیزائن ایک سوِس کمپنی Strantec نے تیار کیا اور کلاک کی تنصیب کا کارنامہ ایک جرمن کمپنی پریمیئر کمپوزٹ ٹیکنالوجی نے سرانجام دیا۔ اس کمپنی کا ذیلی دفتر دبئی میں ہے۔ اس کلاک کی تنصیب میں 250 مسلمان ماہر کاریگروں نے حصہ لیا۔ یہ کلاک تیار کرنے میں تین ماہ کا عرصہ لگا اور دبئی سے لا کر مکہ ٹاور پر اس کو نصب کیا گیا۔ واقعی اتنی بلندی پر ایسا تکنیکی کام کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اتنی بلندی سے صرف نیچے دیکھنے سے انسان کی روح کانپنے لگتی ہے۔

کلاک کے اوپر فائبر گلاس سے بنایا ہوا سنہرے رنگ کا ہلال بھی نصب کیا گیا ہے، جس کا وزن 35 ٹن ہے۔ یہ ہلال بھی جرمن فرم پریمیئر کمپوزٹ ٹیکنالوجی نے دبئی میں تیار کیا اور اس ہلال کی تنصیب اور ویلڈنگ کا کام مسلمان ماہر کاریگروں نے ہی سرانجام دیا۔ یہ ہلال کلاک ٹاور کی چوٹی کے کلس پر رکھا گیا ہے۔ مکہ کلاک ٹاور کے سارے پراجیکٹ کی تعمیر کا کام سعودی عرب کی سب سے بڑی کنسٹرکشن کمپنی 'بن لادن' نے سرانجام دیا اور سارے پراجیکٹ کی تعمیر 'دارالہندسہ کمپنی' کی نگرانی میں مکمل ہوئی۔

2008ء میں دوحہ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دنیائے اسلام کے نامور جید علماء اور اسکالرز نے حصہ لیا۔ کانفرنس کے دوران وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ 125 سالہ پرانا اختیار کردہ GMT (گرین وچ) مقام دنیا کا مرکزی پوائنٹ نہیں بلکہ اس ارض کا مرکزی نقطہ مکہ معظمہ ہے۔ یہ گرین وچ مین ٹائم جسے دنیا کا معیاری وقت قرار دیا گیا ہے، مبنی برحقیقت نہیں۔ انھوں نے کانفرنس میں یہ بات بڑے وثوق اور سائنٹیفک دلائل کے ساتھ ثابت کی کہ مکہ ہی دنیا کا مرکزی مقام ہے۔

اس نتیجے کے پیش نظر ہی سعودی حکومت نے اس جگہ کلاک ٹاور تعمیر کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور آج وہی کلاک ٹاور دنیائے اسلام کے باسیوں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا ہے۔ کانفرنس کے مندوبین نے برملا اس حقیقت کا اظہار کیا کہ 1884ء میں لندن کے GMT کا وقت تمام دنیا پر مسلط کیا گیا تھا جو کہ حقائق کے منافی ہے بلکہ مکہ کلاک ٹاور کا وقت ہی دنیا کا اصلی اور صحیح معیاری وقت کہلانے کا مستحق ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی تمام اسلامی ممالک مکہ کے معیاری وقت کو GMT کے بجائے تسلیم کرلیں گے اور دنیا کے تمام مسلمان اپنی گھڑیاں مکہ کلاک ٹاور کے وقت ہی سے سیٹ کرلیں گے۔

مکہ کلاک ٹاور کی تعمیر سے چار ورلڈ ریکارڈ بھی بن چکے ہیں جو یہ ہیں:

1۔ یہ کلاک ٹاور دنیا کا سب سے بلند ٹاور ہے۔

2۔ سب سے بڑا ہے۔

3۔ اس پراجیکٹ کا فلور ایریا 1,575,815 m² (516,961,931 ft²) ہے جو کہ دبئی ایئرپورٹ کے فلور ایریا سے بھی زیادہ ہے۔

4۔ کلاک ٹاور کی چھت زمین سے 1740 فٹ بلند ہے۔

یقیناً یہ سعودی حکومت کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے کہ اس نے دنیا کے سب سے بڑے اور بلند کلاک ٹاور کو تعمیر کرکے تمام دنیا کے مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کردیا ہے۔ اس سے قبل یہی فخر مغربی دنیا کے پاس تھا۔ گویا دنیا میں بلند و بالا فلک بوس عمارتیں تعمیر کرنے کی ایک طرح ان کے پاس اجارہ داری تھی۔ اس اجارہ داری کا طلسم اس وقت پاش پاش ہوگیا جب ملائیشیا کے دارالحکومت کوالالمپور میں پیٹروناس ٹاورز نے سر نکالا۔ اس کے بعد دبئی میں برج دبئی کی تعمیر ہوئی جو ابھی تک 2718 فٹ کی بلندی کے ساتھ دنیا کی بلند ترین عمارت ہے اور اب مسلمانوں کے مقدس ترین شہر مکہ میں دنیا کے سب سے بلند کلاک ٹاور کی تعمیر کو چاہے مسلمانوں کی مذہبی فوقیت کا ثبوت نہ بھی مانا جائے مگر دنیا کی بلند ترین عمارتوں میں اس کے مقام سے انکار تو ممکن نہیں رہا۔

کامیابی کا اصل مفہوم

ہم نے کامیابی کا معیار ہی غلط بنا رکھا ہے۔ ہر طاقت، شہرت، دولت، مرتبے کو کامیابی کہتے ہیں۔ یہ کامیابی یہ تو نہیں۔ کیا ہم نے آخرت پر ایمان چھوڑ دیا؟ ممکن ہے ایسے ہی ہو۔ کامیابی مغرب کی تقلید میں نہیں۔ کامیابی تو اللہ کے حبیب ﷺ کے تقرب میں ہے۔ ہم بھول گئے۔ شاید ہم خدا پر بھروسا کرنے کے بجائے ووٹ پر بھروسا کرتے ہیں۔ ووٹ گنتی کا نام ہے وزن کرنے اور تولنے کا نام نہیں۔ جھوٹے لوگوں کے ووٹ سے سچا انسان کیسے آسکتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ووٹ کے بغیر سچا آدمی کیسے سامنے آسکتا ہے۔ صداقتیں شہید ہوتی رہتی ہیں۔ اب یہ سلسلہ ختم ہوجانا چاہیے۔ صداقت کے سرفراز ہونے کا وقت کب آئے گا؟ آئے گا ضرور آئے گا لیکن کب، لیکن کچھ نہیں، خاموشی سے کرب برداشت کرتے چلو۔ بولنے سے بات الجھ جاتی ہے۔ بات کو الجھنا نہیں چاہیے، لہٰذا کرب بہتر ہے۔ اسے اپنا نصیب سمجھ کر قبول کرلیا جائے، کیسے کریں؟ کربناک بات ہے۔ اللہ زمین اور آسمانوں کا مالک ہے۔ اُس کی مسجد کے لیے چندہ چاہیے؟ کلمہ کفر ہے لیکن ہے۔ خدا ہمیں ہمارے شر سے محفوظ کرے۔ خدا ہمارے دل میں پیدا ہونے والے شبہات کو غرق کرے۔ کوئی ایسا سیلاب جو ہمارے اندیشوں کو بہالے جائے لیکن سیلاب۔ خدا کرے سیلاب نہ آئے۔ سیلاب بری شے ہے اندیشوں کے ساتھ ہی گزر کریں گے۔ آخر ہم عادی ہوچکے ہیں۔ ہم اندیشوں کی چادر بنائیں گے اور پھر اس چادر کو تان کر سوجائیں گے۔ ہم خواب اور خیال کے پرستار ہیں۔ اے اللہ ہمیں اچھے اچھے خواب دکھا۔ ہم حقیقت اور حقائق دیکھنے اور سوچنے کے کرب سے نجات چاہتے ہیں۔ یا اللہ! ہمیں نجات دے.....!

(واصف علی واصف کی کتاب "قطرہ قطرہ دریا" سے اقتباس)

سفرنامہ

دورہ مصر کے صرف تین ماہ بعد قاہرہ پر کیا بیتی؟

سوال یہ ہے کہ پورے قد سے کھڑے
لاکھوں اخوانیوں کو

اس بار جھکانا ممکن ہوگا؟

تحریر و تہذیب: اختر عباس

مرسی کے بعد کے مصر کا احاطہ کرتی ایک تجزیاتی تحریر

"مصر کی جیلوں کو اخوان سے اُنس ہے اور فوج کے لیے اُنہیں بھرنا جمہوریت کو راستہ دینے کی نسبت آسان بھی ہے۔"

"ہم تمہاری گولیوں اور ٹینکوں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ہم اُس وقت تک لاشیں اُٹھاتے رہیں گے جب تک مصر کے فرعونوں کو گھر نہیں بھیج دیتے۔"

صحرائے

سینا سے گزرتے ہوئے جو خوف مصری بارڈر سیکیورٹی اور انٹیلی جنس کے عملے نے ساتھ کر دیا تھا، وہ اب کہیں پیچھے رہ چکا تھا۔ نہر سویز کا پل عبور کرنے کے بعد نماز مغرب اور کھانے کے لیے ایک ہوٹل پر رکے۔ بے شک یہ برلب سڑک بنا ہوا ایک کشادہ ہوٹل تھا۔ جس کے اندر ہی ایک بے انتہا خوب صورت مسجد بھی تھی جہاں ہم نے نماز ادا کی، دیواروں اور چھت پر شیشے کا کام کسی نے بہت محبت سے کروایا تھا۔ اس کی تصاویر لیں اندر باہر مسافروں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ فلسطین غزہ سے آنے والے کچھ مسافروں سے سلام دعا بھی ہوئی۔ یہاں کھانا نہ صرف تازہ بلکہ بہت مزے دار تھا۔ جرمنی سے آئے ڈاکٹر موسی الماز دجب یہ کہہ رہے تھے کہ صدر مرسی نے غزہ والوں پہ بہت احسان کیا ہے کہ راستہ کھول دیا تھا تو ہم دونوں نہیں جانتے تھے کہ صرف تین ماہ بعد مرسی صدر نہیں رہیں گے اور رفح بارڈر کا راستہ پھر بند کر دیا جائے گا۔ فوجی سربراہ عبدالفتاح سیسی جسے فوج میں نسبتاً کم عمر جان کر فوج کی باگ ڈور تھمائی گئی تھی، فیلڈ مارشل طنطاوی کی جبری سبکدوشی سے افسروں کی ترقی کا پندرہ برسوں سے بند دروازہ کھولا گیا تھا تب خیال تھا کہ خاموش طبع جرنیل نئی جمہوری حکومت کے لیے تکلیف اور رکاوٹ کا باعث نہیں بنیں گے۔ اسی جنرل سیسی نے جس کی اہلیہ کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ اخوان سے ہمدردی رکھتی ہیں، اخوان صدر کو 40 دن کا الٹی میٹم دے کر ان کا تختہ اُلٹ دیا۔ ان کے بارے میں نت نئے انکشافات کا

مرسی کھجور سے سیسی خُمر تک

مصری عوام کی یہ عادت ہے کہ وہ جب بھی قومی نوعیت کے کسی فیصلے پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں تو اس فیصلے اور اقدام کی محرک شخصیت کے نام سے کوئی اچھی اور مرغوب شے موسوم کر دیتے ہیں۔ گزشتہ برس جب صدر محمد مرسی برسر اقتدار آئے تو ان کی دین داری اور اسلامی کلچر سے محبت کے سبب ماہ رمضان میں مصر میں عجوہ کے بعد مہنگی اور عمدہ کھجور کا نام "مرسی" رکھا گیا تھا۔ اس سال ماہ رمضان میں مقبول کھجور کو "تمرد" کا نام دیا گیا ہے۔ مرسی کھجور اس بار نسبتاً کم مقبول رہی۔ اس کے مقابلے میں سیکولر حلقوں میں فرانسیسی شراب مرغوب ترین مشروب ہے۔ "مرسی کھجور" کے مقابلے میں فرانسیسی شراب کو "سیسی خمور یا خُمر سیسی" کا نام دیا ہے۔ ہمارے بانو بازار جیسے ایک مرکزی بازار میں ہم نے مرسی کھجور کے علاوہ ایک ریڑھی پر بھاپ میں پکی ہوئی میٹھی چھلی (بھٹہ) بھی کھائی۔ اس کا پکایا جانا بہت حیران کر دینے والا تھا۔ یوں سمجھیے ریڑھی پر چھوٹی سی بھٹی رکھی ہوئی تھی۔

"سینا کے کمانڈر سیسی نے اسرائیل کے ساتھ اپنے قریبی تعلقات کے باعث اپنے تمام اقدامات سے اسرائیل کو باخبر رکھا۔"

سلسلہ جاری ہے۔ عربی جریدے "اشروق" نے تو کہا ہے کہ سیسی جو سینا کے کمانڈر رہے، نے اسرائیل کو اپنے قریبی تعلقات کے باعث اپنے تمام اقدامات سے باخبر رکھا۔ اسرائیل کے معروف تجزیہ کار رونی دائیل نے تو یہ بھی کہا ہے کہ فوجی بغاوت کے تین دن پہلے انھوں نے موساد سمیت اسرائیل کے عسکری اور اسٹریٹیجک ماہرین سے اپنا منصوبہ بتا کر راہنمائی لی۔ اسرائیلی حکام نے اخوان سے نمٹنے کے لیے انھیں خصوصی ٹپس دیے۔ رونی دائیل نے اسرائیلی چینل ٹو پر اس بارے میں اور بھی تفصیلات دیں، جن کا عملی اظہار یوں ہوا کہ بغاوت کے فوری بعد اسرائیلی وزیراعظم نے امریکا پر کھل کر زور دیا کہ مصری فوج کو (کیمپ ڈیوڈ معاہدے کی حفاظت اور اسرائیل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرنے کے عوض) دی جانے والی ڈیڑھ ارب کی امداد نہ روکی جائے۔

فلسطینیوں کے لیے مصر کے ویزے بند

عبوری حکومت نے فوری طور پر فلسطینیوں کے لیے مصر کے ویزے بند کرنے کا حکم دیا اور سرحدیں سیل کر دیں اور ان سیکڑوں فلسطینیوں کو قاہرہ ائیر پورٹ سے واپس کر دیا گیا جو رمضان اور عید کے لیے رفح بارڈر کراس کر کے غزہ جانے کے لیے آئے تھے۔

کینیڈین آن لائن رسالے "گلوبل ریسرچ" نے

مرسی کے 32 لاکھ حامی قاہرہ کی سڑکوں پر

فون پر قاہرہ میں مقیم ڈاکٹر مصطفےٰ بکل سے بات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ محمد مرسی کے 32 لاکھ سے زائد حامیوں نے نماز جمعہ کی ادائی کے بعد قاہرہ کی سڑکوں پر فوجی بغاوت کے خلاف مارچ کیا۔ وہ خود اس موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے کہا حیران کن خبر یہ ہے کہ قاہرہ میں چار جگہ ملین مارچ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اخوان المسلمون اور معزول صدر محمد مرسی کی حمایت میں دیگر سیاسی جماعتیں بھی احتجاج کر رہی ہیں۔ ان میں جماعت الاسلامیہ بھی شامل ہے، جس نے نمازیوں پر فائرنگ کا ذمہ دار مصر کے کٹھ پتلی صدر عدلی منصور کو قرار دیا ہے۔ جماعت الاسلامیہ نے کہا کہ وزارت داخلہ کی طرف سے احتجاج کرنے والے شہریوں کو یہ کہہ کر خوفزدہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ قاہرہ میں مختلف جگہوں پر بم دھماکے ہو سکتے ہیں، سرکاری حکام کی ایسی تنبیہہ سے واضح ہوتا ہے کہ مصری اسٹیبلشمنٹ خود یہ کام کر رہی ہے، جس طرح 1954ء میں جمال عبدالناصر نے کیا تھا۔ جماعت الاسلامیہ کا کہنا ہے کہ اس قسم کی دھمکیوں سے مصری عوام کو اپنی آزادی کی حفاظت کرنے سے نہیں روکا جا سکتا۔ عوام جنوری 2011ء کے انقلاب کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

اخوان کی جسٹس اینڈ فریڈم پارٹی کے صدر محمد سعد الکتاتنی گرفتار ہیں جبکہ نائب صدر عصام العریان نے کہا ہے کہ "عرب بہار کی جگہ اب ہم جمہوری بہار کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔" عبوری حکومت کے لیے مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں اس لیے کہ کوئی بھی دینی سیاسی جماعت عبوری حکومت میں شامل نہیں ہونا چاہتی۔ جبکہ مرسی مخالف اتحاد میں شامل تمام جماعتیں حکومت میں اعلیٰ عہدے کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔

”مصری حکام نے ترکی ایئر لائنز کو فلسطینی باشندوں کو قاہرہ لانے پر 6,000 ڈالر جرمانہ عائد کیا۔“

اطلاع دی ہے کہ مصری امیگریشن حکام نے غزہ جانے والے تمام فلسطینیوں کو قاہرہ ایئر پورٹ استعمال کرنے سے منع کردیا ہے اور تمام بین الاقوامی ایئر لائنز کو بھی پابند کردیا ہے کہ ایسا کرنے پر نہ صرف انھیں بھاری جرمانہ کیا جائے گا بلکہ ان مسافروں کو اگلی پرواز سے وہ واپس بھی لے کر جائیں گے۔ مصری حکام نے سب سے پہلے ترک فضائی کمپنی ترک ایئر لائنز کو فلسطینی باشندوں کو قاہرہ لانے پر 6000 ڈالر جرمانہ عائد کیا ہے۔ ترک ایئر لائنز نے اس جرمانے کے بعد سخت موقف اپنایا اور پہلے سے نوٹیفیکشن کے عدم اجرا کو بنیاد بنا کر جرمانہ ادا کرنے سے انکار کردیا ہے۔ جس پر اسے کیے گئے جرمانے کو وارننگ میں بدل دیا گیا ہے۔

کھانے اور نماز کے بعد ہماری کار برق رفتاری سے ہمیں قاہرہ پہنچانے کے لیے بھاگ رہی تھی جہاں اگلی صبح پورے عالم عرب سے ڈاکٹروں کی فلاحی تنظیموں کے اسلامک ہاسپٹلز کنسورشیم کی کانفرنس تھی۔ فیڈریشن آف اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن (FIMA) جس کے بینر تلے اس دورے کا اہتمام تھا اور جس کے لیے مجھے میڈیا ایڈوائزر منتخب کیا گیا تھا، ان تنظیموں میل سے ایک تھی۔

نیا ہوٹل، ہوٹل المعادی سے زیادہ خوب صورت اور زیادہ کشادہ تھا اور دریائے نیل کنارے واقع تھا۔ استقبالیہ کے سامنے دو کمپیوٹر ٹرمینل تھے۔ پتا چلا کہ یہاں سے اپنی ای میل دس منٹ کے لیے فری دیکھی جاسکتی ہے۔ قاہرہ جیسے مہنگے شہر میں جہاں انٹرنیٹ سہولتیں اور بھی مہنگی ہیں یہ پہلی اچھی خبر تھی جو آٹھ دس دن کے بعد سنائی دی تھی۔ سامان رکھ کر واپس آیا اور وقفے وقفے سے کئی دس منٹ لگائے کیونکہ دس منٹ بعد ہی کمپیوٹر خود بخود اپنے آپ لاگ آف ہوجاتے ہیں۔

تحریر اسکوائر کی ہمسائیگی

ہمارا ہوٹل تحریر اسکوائر کے بالکل قریب واقع تھا۔

”اخوان کے مظاہرین اگر تحریر اسکوائر پر قبضہ کرنے کے ارادے سے نکلے تو میدانِ جنگ ”یہی نیل کا پُل ہوگا۔“

درمیان میں دریائے نیل کا ایک پل حائل تھا جو اصل میں قاہرہ اور ڈاؤن ٹاؤن کو باہم ملاتا ہے۔ اہرام مصر بھی اسی سائیڈ پر ہیں اور حال ہی میں شہرت پانے والا رابعہ العدویہ کا میدان بھی یہی پل ہے جو بار بار بند ہوتا ہے اور خدانخواستہ کسی روز بڑے عوامی تصادم کی خبر آئی تو بھی یہی پل مرکز ہوگا کہ رابعہ العدویہ میں مقیم اخوان کے مظاہرین اگر تحریر اسکوائر پر قبضہ کرنے کے ارادے سے نکلے تو میدانِ جنگ یہی علاقہ بنے گا۔

میدانِ رابعہ العدویہ

میدان رابعہ العدویہ بنیادی طور پر ایک چوک ہے اور چاروں طرف سے بڑی سڑکیں یہاں آکر ملتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں میدان التحریر یا تحریر اسکوائر کو دیکھیے وہ نسبتاً ایک چھوٹا سا چوک ہے جہاں ٹی (T) کی شکل میں تین سڑکیں ملتی ہیں۔ بازاروں اور عمارتوں سے گھرا ہوا یہ علاقہ آٹھ دس ہزار لوگ بھی ہوں تو یوں بھر جاتا ہے کہ سر ہی سر نظر آتے ہیں۔ تقریباً ایک سال سے اس کی دو سڑکیں رکاوٹیں رکھ کر بند کردی گئی ہیں۔ صرف ایک سڑک کھلی ہے اور وہ بھی شارع عام نہیں رہی۔ عام لوگ وہاں بیٹھے ڈیڑھ دو سو مظاہرین کے پاس جانے سے ڈرتے تھے۔ ان کے ساتھ دھرنے میں شریک لڑکیوں سے دست درازی اور عصمت ریزی کی خبریں مارچ کے پہلے ہفتے ہم نے وہیں قاہرہ میں سنی

برطانوی جریدے گارجین کی تحقیقی رپورٹ

مصر کی عبوری حکومت اور فوج، نمازیوں پر فائرنگ اور ان کے قتل عام پر عوامی اور بین الاقوامی ردِعمل سے سخت پریشان ہے اور جواباً اخوان پر الزام تراشی کررہی ہے۔ اس دوران برطانوی جریدے گارجین نے اپنی رپورٹ میں قرار دیا ہے کہ فوج نے اخوان کے پُرامن مظاہرین پر گولی چلائی اور 53 کو موقع ہی پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جبکہ 435 زخمی اب بھی ہسپتالوں میں پڑے ہیں۔ گارجین کے نمایندوں پیٹرک نگسلے، لیہ گریم اور محمود نے کئی دنوں کی محنت سے تیار کردہ تحقیقی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ریپبلکن گارڈ ہیڈ کوارٹر کے باہر مظاہرین کے کیمپ میں زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ مصری باشندے تھے۔ ڈاکٹر یحییٰ موسیٰ، ان کے ساتھی لیکچرار جامعہ الازہر ڈاکٹر ردا محمدی، ڈاکٹر یاسر لطہ، دیگر تمام زخمی بھی انجینئر اور ڈاکٹر تھے اور نہتے تھے۔ اکثر کو گولیاں گردنوں میں لگیں اور پیٹھ پر لگیں۔ پیٹرک نے تمام ویڈیوز کا بھی فارینسک تجزیہ کروایا تو ایسا کوئی ثبوت یا نشان بھی نہیں ملا کہ مظاہرین مسلح تھے اور پیپلز ریپبلکن کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ 3:17 پر نماز فجر شروع ہوئی اور 3:25 ان پر گولیاں برسائی گئیں جو سب کو ناف کے اوپر لگی ہیں۔ فیلڈ ہسپتال میں 3:40 پر پہلی لاش موصول ہوئی تب تک ساری سڑک خون سے سرخ ہوچکی تھی۔ عینی گواہ سیف الجمال کا کہنا تھا کہ فائرنگ شروع ہوتے ہی اس نے اپنا کیمرا آن کردیا تھا۔ اس نے اپنی وڈیو گارجین والوں سے شیئر کی جس میں فوجی گولیاں برسا رہے ہیں اور نمازیوں کو لاٹھیوں سے پیٹ رہے ہیں۔ رپورٹ میں لکھا ہے کہ مصری فوج کا بیان ”جھوٹ کا پلندہ“ ہے۔

''لبرل تحریک ''تمرد'' کے التحریر اسکوائر پر صرف چار روز میں 91 خواتین کے ساتھ اجتماعی زیادتی کا ارتکاب کیا گیا۔''

تھیں۔ میدان رابعہ اور میدان التحریر کا موازنہ بھائی گیٹ اور منارِ پاکستان کے میدانوں سے کرلیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ التحریر پہ زیادہ لوگ جمع ہونے سے ٹریفک جام اور دریائے نیل کے پل سے ڈاؤن ٹاؤن جانے کے راستے فوری طور پر بند ہوجاتے ہیں۔ اخوان کے لوگ 27 جون سے میدان رابعہ میں بیٹھے ہیں جبکہ فوجی بغاوت 3 جولائی کی رات ہوئی۔ اخوان پہلے سے توقع کررہے تھے کہ التحریر کے مظاہرین کے مطالبات اور تعداد کو بنیاد بنا کر فوج اور عدلیہ مل کر ایسی غیر قانونی اور غیر آئینی حرکت کرسکتی ہے۔ اس کے توڑ کے لیے وہ 27 جون سے اپنے حامیوں کو میدان میں لے آئے تھے کہ کل کوئی یہ نہ کہے کہ صدر مرسی کی حمایت میں عوام نہیں تھے۔ 5 جولائی کو پہلا بڑا مظاہرہ ہوا۔ اخوان کے مرشد عام ڈاکٹر محمد البدیع پہلی بار عوامی سطح پر کسی احتجاجی تحریک میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ انھوں نے وہاں خطاب بھی کیا۔ لاہور سے شائع ہونے والے ایک ہم عصر روزنامے کے کالم نگار نے اپنے کالم بازگشت میں انتہائی مضحکہ خیز معلومات کا اظہار کیا کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ موصوف نے اپنی دانشورانہ لیاقت کا ثبوت دیتے ہوئے لکھا ''اخوان المسلمون کے رہبر کبیر آقائے بدیع، صدر مرسی کے اس انجام سے دوچار روز قبل اپنی ستائیس بیگمات کے ہمراہ اسکندریہ سے 265 کلومیٹر دور اپنے قصبے میں واپس چلے گئے۔ بعد ازاں انھیں فوج نے حفاظتی حراست میں لے لیا۔ انھوں نے گلف نیوز کا حوالہ دے کر اس تضحیک بھرے جملے کو اپنے کالم کی زینت بنایا۔ ساتھ

4 روز میں 91 خواتین سے زیادتی

خواتین مظاہرین کے ساتھ زیادتیوں اور دست درازیوں کے حوالے سے ایک تازہ رپورٹ میں برطانوی جریدے ''ڈیلی میل'' نے مقامی ذرائع ابلاغ اور قاہرہ میں اپنے نمائندے کے حوالے سے انکشاف کیا ہے کہ اخوان المسلمون کے رہنما اور مصر کے صدر مرسی کے خلاف برپا کی جانے والی سیکولر اور لبرل تحریک ''تمرد'' کے التحریر اسکوائر پر 28 جون سے 2 جولائی 2013ء تک صرف چار روز کے دوران 91 خواتین کے ساتھ اجتماعی زیادتی کا ارتکاب کیا گیا جس کی تصدیق انسانی حقوق کے اداروں، طبی ذرائع اور خواتین کے تحفظ کے لیے کام کرنے والی تنظیموں نے بھی کی ہے۔ برطانوی جریدے نے لکھا ہے کہ مرسی حکومت کے خلاف اور اس سے پہلے بھی حسنی مبارک کے خلاف عوامی مظاہروں اور انقلابی تحریک میں شریک ہزاروں مصری خواتین نے اس بات کی شکایات کی تھیں کہ انھیں اپنے ساتھی مرد حضرات کی جانب سے دست درازیوں اور زیادتی کے ارتکاب کے واقعات نے بددل کردیا ہے اور اب مصری خواتین نے مطالبہ شروع کردیا ہے کہ التحریر اسکوائر اور اس جیسے بڑے مظاہروں میں خواتین کو مکمل تحفظ فراہم کیا جانا چاہیے۔ مصری خواتین کے تحفظ کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کے حوالے سے معروف مصری صحافی ''رندہ ال طہاوی'' کہتی ہیں کہ مصری سیاست میں خواتین کو دیوار سے لگا دیا گیا ہے۔

ہی لکھا کہ التحریر چوک میں 92 خواتین کو اغوا کرنے اور 46 کی آبروریزی کا مقدمہ درج کرایا گیا ہے۔ آخری جملہ پھر قابل غور ہے ''انھوں نے جنسی تجاوز کا الزام کسی خاص جماعت پر نہیں لگایا؟''

جس بات کو مصری اور عالمی میڈیا چیخ چیخ کر بیان کررہا ہے کہ التحریر چوک میں اپوزیشن کے لوگ قابض ہیں کوئی اور نہیں۔ انہی کے مطالبے اور اصرار کو بنیاد بنا کر فوجی جنتا نے اپنی بغاوت کے تانے بانے بُنے اور منتخب صدر کا تختہ الٹ دیا۔ وہی ان کو نظر نہیں آرہے کہ کس جماعت کے ہیں۔ ایسے مضمون نگار مصر میں بھی کافی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ وہاں کے اخبارات میں ہم نے ان کے بہت نمونے دیکھے۔ ڈاکٹر خیرات شاطر اور ڈاکٹر مرسی کے پیچھے تو وہ ہاتھ دھو کر پڑے رہے۔

''یا مرسی ارحل ارحل'' کے نام سے چھپنے والے اس کالم نگار کی مبلغ معلومات حیران کن حد تک افسوس ناک ہیں۔

دنیا میں سب سے بڑے افطار کا ورلڈ ریکارڈ

میدانِ رابعہ العدویہ میں ہونے والے مظاہرے تاحد نظر میلوں تک پھیلے نظر آتے ہیں۔ اخوان آن لائن ڈاٹ کام پر ان کی تصاویر اور کوریج دیکھ کر انسان حیران ہی رہ جاتا ہے۔ حالیہ سیاسی تاریخ میں کسی ملک کے عوام کا اتنی بڑی تعداد میں گھروں سے باہر آکر مسلسل 26 دن

مرسی کی بیٹی شائمہ

مرسی کا بیٹا اُسامہ

تک احتجاج کرنا اور وہ بھی لاکھوں لوگوں کا پر امن احتجاج، یہ الگ سے ورلڈ ریکارڈ ہے۔ اخوان نے اعلان کیا کہ میدان رابعہ میں دنیا کی سب سے بڑی افطاری کا ورلڈ ریکارڈ قائم کیا جائے گا۔ یوں بروز جمعہ انھوں نے ریکارڈ قائم کرکے سیاسی تجزیہ نگاروں کو حیران کردیا۔

اخوان نے اس میدان کو سحری، افطاری، تراویح، تہجد اور احتجاج کے ایک امتزاج میں ڈھال کر اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کو دنیا سے منوالیا ہے۔

مرشد عام ڈاکٹر محمد البدیع کا ولولہ انگیز خطاب

احتجاج کرنا جس قدر آسان ہوتا ہے۔ اس کے نتائج کو سمجھنا اور سنبھالنا اُتنا ہی کٹھن ہوتا ہے۔ اخوان کے مرشد عام عوامی اجتماعات سے خطاب نہیں کرتے۔ اخوان ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے یہ سلسلہ قادریہ کا تسلسل ہے۔ اپنی نظر بندی سے پہلے واحد خطاب میں مرشد عام نے جو الفاظ کہے وہ اس قدر ولولہ انگیز ہیں کہ مُردوں میں جان ڈال دیتے ہیں۔ احتجاج پر نکلے لوگوں کے جذبات کو انھوں نے کس قدر انگیخت کیا ہوگا۔ انھوں نے کہا:

''میں مصری فوج سے کہتا ہوں کہ کان کھول کر سنو! ہم تمھاری گولیوں اور ٹینکوں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ہم اُس وقت تک لاشیں اُٹھاتے رہیں گے جب تک مصر کے فرعونوں کو گھر نہیں بھیج دیتے۔ ہم کسی بھی

ڈاکٹر محمد البدیع نے کہا ''میں مصری فوج سے کہتا ہوں کہ کان کھول کر سُنو! ہم تمہاری گولیوں اور ٹینکوں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ہم اُس وقت تک لاشیں اُٹھاتے رہیں گے جب تک مصر کے فرعونوں کو گھر نہیں بھیج دیتے۔''

صورت شہدا کے خون سے سینچے گئے انقلاب کو ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ ہم پرامن طریقے سے مصر کو حقیقی انقلاب کی طرف لائیں گے تم ہمیں ٹینکوں سے ڈراتے ہو تو سن لو! ناممکن ہے۔''

مرشد عام کے الفاظ ''یہ احتجاج پُر امن ہوگا اور تب تک ہوگا جب تک منتخب صدر محمد مرسی کو بحال نہیں کیا جاتا'' وہاں نعرے بھی منتخب صدر محمد مرسی ''المومنین المرسی محمد مرسی'' کے لگتے ہیں۔

اب تک احتجاج کے ستائیس دنوں میں اخوان نے جس بہادری، صبر اور مستقل مزاجی کا ثبوت دیا ہے اس نے مغربی دنیا کو بھی حیران کر دیا ہے۔ شروع میں تجزیے کیے جا رہے تھے کہ اخوان شاید دس دن تک ہی احتجاجی تحریک کا ٹمپو برقرار رکھ سکیں گے اس کے بعد عوامی مزاحمت دم توڑ دے گی اور فوجی اور عبوری حکومت کے ہاتھ اس قدر مضبوط ہو جائیں گے کہ وہ مرسی کے بنائے ہوئے آئین میں بنیادی ترامیم کر کے دوبارہ ریفرنڈم کروانے کی پوزیشن میں ہوں گے۔

''فوج منقسم عوام میں کس کا ساتھ دے''

مصر میں جو کچھ ہوا کیا اس سے اخوان المسلمون کو یا اس کے سیاسی اور عوامی کردار کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ رابرٹ فسک نے اپنے کالم میں بڑے پرزور انداز میں لکھا ہے کہ ''محمد مرسی کے ساتھ خواہ کچھ بھی ہو۔ اور اس سے روا رکھا جانے والا سلوک انصاف ہو یا ناانصافی ملک کی سب سے منظم جماعت کے طور پر اخوان المسلمون برقرار رہے گی۔ یہ پارٹی جانتی ہے کہ کسی بھی مشکل گھڑی میں کس طرح زندہ رہنا اور خود کو برقرار رکھنا ہے''

"The Army is built from both of Egypt's Divide." کے نام سے ممتاز جریدے The Independent میں انھوں نے مزید لکھا ہے کہ ''محمد مرسی نے چند روز قبل جو لہجہ اختیار کیا تھا وہ کسی حد تک حسنی مبارک کے لہجے سے ملتا تھا مگر اس میں مرسی کا قصور کم تھا کیونکہ وہ منتخب تھے اور انھیں اپنی بات زور دے کر منوانے کا حق حاصل تھا۔ دو سال

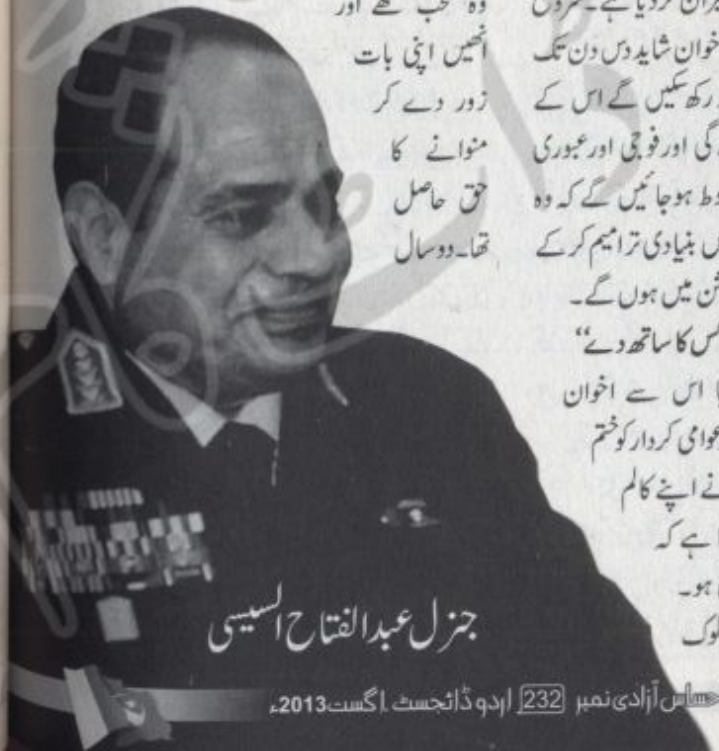

جنرل عبدالفتاح السیسی

''قاہرہ شہر میں ایک دن میں 14 الگ الگ جگہوں پر ملین مارچ ایک ناقابل تصور اور بظاہر ناقابل عمل حکمت عملی تھی مگر اخوان نے یہ بھی کر دکھایا۔''

قبل حالت یہ تھی کہ عوام حسنی مبارک کے خلاف تھے اور اب وہ ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ ایسے میں فوج کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔ اُسے طے کرنا ہے کہ وہ کس طرف ہے اور حقیقت یہ ہے کہ فوج کو منقسم عوام کے ساتھ رہنا ہے وہ کسی ایک فریق کی حمایت یا مخالفت کر کے کام نہیں کر سکتی۔''

کیا فوجی بغاوت کا فیصلہ بیک فائر ہو گیا

آج مصر میں تو یہ بات عام طور پر کہی جا رہی تھی کہ فوجی بغاوت کا فیصلہ بیک فائر کر گیا ہے۔ اب دنیا بھر میں سیاسی تجزیہ نگاروں نے دو اہم بنیادوں پر اسے پری میچور کہنا شروع کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ انڈیپنڈنٹ نے کہا ہے کہ اس فیصلے اور واقعہ سے اخوان کے ووٹ بینک میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔

مصر سے باہر دنیا جو بالخصوص مغربی ذرائع ابلاغ پر انحصار کرتی ہے۔ انھیں توقع تھی کہ چند روزہ احتجاج کے بعد لوگ ٹھنڈے پڑ جائیں گے اور عبوری صدر اپنی مرضی سے آئین میں تبدیلیاں کر کے دوبارہ ریفرنڈم کے لیے کال دیں گے۔ مگر ادھر سب کچھ الٹ ہو رہا ہے۔ کئی جرنیلوں کی عدم اطمینانی استعفوں میں ڈھلنے والی ہے۔ عوام کا مسلسل 27 دنوں سے سڑکوں پہ ہونا ایک نئی نظیر بنتا جا رہا ہے۔ قاہرہ شہر میں ایک دن میں 14 الگ الگ جگہوں پر ملین مارچ ایک ناقابل تصور اور بظاہر ناقابل عمل حکمت عملی تھی مگر اخوان نے یہ بھی کر دکھایا۔

اخوان کے مظاہرے اور دھرنے خواتین کے لیے محفوظ

خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والی متحرک خاتون رہنما ''ہدیٰ الشعراوی'' کا استدلال ہے کہ بائیں بازو کے سیکولر سیاست دان اصرار کرتے ہیں کہ پہلے جمہوریت کو قائم ہو لینے دیں پھر خواتین کے حقوق، مسائل اور ان کے تحفظ پر بھی بات چیت ہوگی۔ وہ اس سے متفق نہیں ہیں، جب تک خواتین کی پسماندگی دور نہیں کی جائے گی، انھیں تحفظ نہیں ملے گا اور مصری سیاست کا فعال حصہ نہیں بنایا جائے گا۔ اس وقت تک جمہوریت پھل پھول نہیں پائے گی۔ ہدیٰ الشعراوی کا کہنا ہے کہ اس سلسلہ میں ہمیں ایک روشن مثال اخوان المسلمون کی جانب سے ملتی ہے، جہاں کارکنان سے لے کر اعلیٰ عہدوں تک خواتین موجود ہیں، مثال کے طور پر ''ہدیٰ عبدالمنعم'' کا نام سامنے ہے، جو وکیل ہیں اور فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی کی امور نسواں کمیٹی کی نگراں ہیں اور اخوان المسلمون کے کئی سماجی پروگرامز کا انتظام و انصرام دیکھتی ہیں۔ اس حوالے سے ہدیٰ عبدالمنعم کا کہنا ہے کہ مظاہروں میں خواتین کے ساتھ زیادتیوں کے واقعات کو ختم کرنے کے لیے خواتین تنظیموں کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔ ہدیٰ عبدالمنعم کا کہنا تھا کہ خواتین کے ساتھ زیادتیوں کے تمام واقعات سیکولر کیمپ میں ہوئے ہیں اور اخوان المسلمون کے مظاہرے اور دھرنے اس قباحت سے پاک ہیں کیونکہ اخوان المسلمون کے مرد کارکنان ان کی حفاظت کے فرائض انجام دیتے ہیں، اس لیے کوئی اوباش گروہ اخوان کے مظاہرے میں گھس نہیں سکتا۔

”اخوان کے لوگوں میں کسی نے جیل میں 5 سال گزارے ہیں تو کسی نے 10 سال۔ 13 سے 20 سال والے تو کتنے ہی لوگ ہیں۔“

مدغم منصورہ کے ڈاکٹر خالد دیب کی دعوت

اخوان کے جتنے بھی لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں تین چیزیں بے حد نمایاں پائیں۔ خوش اخلاق، خوش مزاج اور انتہائی پڑھے لکھے۔ کسی نے جیل میں 5 سال گزارے تو کسی نے 10 سال۔ 13 سے 20 سال والے تو کتنے ہی لوگ تھے، جیسے کوئی انھیں جیل میں ڈال کر بھول جائے۔ الخدمت پاکستان کے سربراہ ڈاکٹر حفظ الرحمٰن صاحب نے ایک بار اخوان کے سابق مرشد عام مہدی عاکف کے ساتھ چھوٹی سی صاحبزادی دیکھ کر تاخیر سے شادی کا سوال کیا تو انھوں نے مسکرا کر کہا نصف عمر تو جیل میں کٹی، رہائی ملی تو 49 سال کا تھا، تب شادی کی۔ مدغم منصورہ سے ڈاکٹر خالد دیب خصوصی طور پر کئی گھنٹے کی ڈرائیو کر کے ہم سے ملنے آئے۔ وہ وہاں اخوان کے موثر سیاسی قائدین میں سے ہیں۔ منصورہ وہی جگہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مصر میں سب سے خوبصورت لوگ یہیں پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد تین دن کلینک کرتے ہیں اور باقی چار دن اخوان کا کام۔ مصری عرب عام طور پر گھر میں دعوت نہیں دیتے۔ ڈاکٹر خالد ہماری میزبانی کے لیے بطور خاص قاہرہ آئے تھے۔ انتظار بٹ صاحب نے خبردار کیا ڈاکٹر صاحب بہت شدید قسم کے میزبان ہیں۔ ہم ان کا اشارہ نہ پا سکے۔ دریائے نیل کے بالکل کنارے ایک خوب صورت ہوٹل ریڈ چلیز میں کھانے کا آرڈر ہونے لگا تو ویٹر بچھ

مخالفانہ تحریک تمرد میں انقلابیوں کی ادائیں

مصری جریدے الاہرام نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ مرسی حکومت کے خلاف برپا کی جانے والی مخالفانہ تحریک ”تمرد“ کے التحریر اسکوائر میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد کے مجمع میں سیکڑوں خواتین نے دست درازی، بے لباس کیے جانے اور 91 خواتین نے جبری زیادتی کے واقعات کی شکایات درج کروائی ہیں لیکن پولیس کا عملہ اس ضمن میں کوئی کردار ادا نہیں کر رہا ہے۔ جرمن جریدے ”دراپسی جیل“ نے مصر میں انقلابیوں کے مظاہروں میں افسوس ناک پہلو کے حوالے سے اس کو ایک تاریک دور قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے نمائندے کو بھی ایسی اطلاعات کی تصدیق ہوئی ہے کہ التحریر اسکوائر میں اوباش نوجوانوں کے گروہ موجود ہیں جو طے شدہ منصوبے کے تحت دو چار خواتین کو ہدف بنا کر ان کو غیر محسوس طریقے سے گھیر لیتے ہیں اور پھر انھیں زیادتی کا نشانہ بناتے ہیں۔ اسی گروہ کے اراکین خواتین کے گرد گھیرا ڈال کر بظاہر خواتین کو بچانے کا دکھاوا کرتے ہیں اور پھر مقصد پورا ہو جانے کے بعد مخالفانہ نعرے بازی کرتے ہوئے کھسک جاتے ہیں۔ لیکن اس پورے معاملے کا افسوسناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ زیادتی کا نشانہ بنائی جانے والی خواتین کو علم ہی نہیں ہو پاتا کہ انھیں کس نے نشانہ بنایا۔ ایسے واقعات کی رپورٹنگ سے ان کی خانگی زندگی اور مستقبل میں شادی کے معاملات متاثر ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ جب دینا فرید سے استفسار کیا گیا کہ آیا کس قسم کی خواتین کو مظاہروں میں نشانہ بنایا گیا؟ تو ان کا کہنا تھا کہ جن لڑکیوں نے جینز اور چست لباس پہنے ہوئے تھے، انھیں بالخصوص نشانہ بنایا گیا ہے۔

”شیخ طلال مصطفیٰ اپنی طوفانی محبت کے ہاتھوں مشہور لبنانی اداکارہ سوزان کا قتل کر بیٹھے۔“

بچھ جا رہے تھے۔ کھانے میں باربی کیو مرغی و کباب، مٹن ود پاستہ، میٹھے چاول، جن پر میوے سجے ہوئے تھے۔ کھانے سے پہلے سلاد آیا اور ہر ایک کے لیے الگ طرح کا سوپ، جس کے ساتھ ململ میں لپٹے لیموں تھے ہم نے کھیرے کھانے شروع کیے تو ڈاکٹر عمران صحاف نے بڑے شفیق انداز میں ڈانٹ پلائی پوچھ تو لیتے یہاں یوں کھیرے کھانا، کھانے کے آداب میں شامل بھی ہے یا نہیں۔ میں نے کھٹ سے ڈاکٹر خالد سے پوچھ لیا۔ انھوں نے اپنی سولین ڈالر مسکراہٹ سے لبریز لہجے میں کہا، بالکل کھائیے“ صحاف صاحب نے پھر ٹوکا۔ ”اسی سے پوچھ لیا۔ کسی اور سے پوچھتے“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ڈاکٹر صاحب اصل سورس (Source) سے جواب صحیح ملتا ہے۔“ کھانے کے دوران اندازہ ہو گیا تھا کہ کھا کھا کر ہف جائیں گے یہ ختم نہیں ہوگا۔ آرڈر کے الفاظ اب سمجھ میں آئے جو انھوں نے مینو کارڈز دیکھ کر کہے تھے۔ ہر ڈش لے آؤ۔ اخوان والوں کی میزبانی اور فیاضی کا یہ مظاہرہ آنے والے دنوں میں بھی بار بار ہوا۔ معلوم ہوا یہ ان کا لائف سٹائل ہے۔ اس روز اکثر کھانے ہمیں پیک کر کے ہوٹل لے جانے پڑے۔ کھانے کے بعد دریا کے اندر تک بنے لکڑی کے پل پر جا کر تصاویر بنائی گئیں۔ ڈاکٹر خالد سے ملاقات بے حد یادگار رہی اور بہت معلومات افزا بھی۔

ڈاکٹر مصطفیٰ ہیکل، مرسی کے پرسنل سٹاف آفیسر

رباب سٹی، 25 کلومیٹر سے زیادہ رقبے میں پھیلا ہوا قاہرہ کا خوب صورت اور مہنگا ترین رہائشی علاقہ ہے یہ ہمارے بحریہ ٹاؤن سے بھی کافی آگے کی چیز ہے اس کے مالک حسنی مبارک کے دوست شیخ طلال مصطفیٰ ہیں جو اپنی طوفانی محبت کے ہاتھوں مشہور لبنانی اداکارہ سوزان کا قتل کر بیٹھے۔ ابھی تک جیل میں ہیں۔ رُباب

”دریائے نیل پر ایتھوپیا ڈیم بنانے، پٹرول، گیس اور توانائی کے میدان میں رکاوٹیں کھڑی کر کے مصر کو معاشی اور اقتصادی طور پر کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔“

سٹی میں عام سا گھر بھی 4 کروڑ سے کم کا نہیں تھا۔ وہیں ہم ڈاکٹر مصطفےٰ ہیکل سے ملنے جا رہے تھے۔ یہ آئی سرجن ہیں۔ انھوں نے دس سال صدر محمد مرسی کے ساتھ کام کیا۔ کیسے آدمی ہیں محمد مرسی؟ میں نے پوچھا۔ سادہ مگر سچے مسلمان، بہت واضح اور عمدہ سیاسی سوچ اور صبر سے مالا مال۔ محمد مرسی صدر بننے سے پہلے پارلیمنٹ کے رکن تھے۔ انھیں اس زمانے میں دنیا کے بہترین پارلیمنٹیرین کا اعزاز ملا تھا۔ ڈاکٹر مصطفےٰ کو ان کے ساتھ طویل عرصہ کام کرنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر مصطفےٰ سرکاری اخبار ”الاہرام“ کے سابق مشہور مدیر حسنین ہیکل جنھوں نے بعض بڑی معرکۃ الآرا کتابیں لکھی ہیں، کے ہیکل قبیلے سے ہیں مگر سیاسی طور پر کوسوں دور۔ حسنین ہیکل سادات اور حسنی مبارک کے بے حد قریب رہے۔ عمر اور صحت نے اب سرگرم نہیں رہنے دیا۔ ہوٹل سے ٹیکسی لے کر رباب سٹی پہنچے جہاں ڈاکٹر مصطفےٰ ہیکل اپنے بیٹوں کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ وہاں سے سیدھے ایک ہوٹل پہنچے۔ کھانے کے دوران ہی اوپر کچن کے ساتھ بنی جگہ پر نماز عصر پڑھی۔ ڈاکٹر عمران صحاف اور میرے علاوہ باقی پہلے ہی پڑھ چکے تھے۔ کھانے کے دوران بالکل وہی منظر دہرایا گیا جس کا چند روز پہلے المنصورہ سے آنے والے ڈاکٹر خالد نے دوران میزبانی شاندار عملی مظاہرہ کیا تھا۔ صدر مرسی کے بارے میں وہ بتا رہے تھے۔ نماز اچھی پڑھتا ہے روزے خوب رکھتا ہے۔ اپنے معمول کا پابند اپنے

حسنی مبارک کے نظام کی واپسی!

مصر کے معروف تجزیہ کار اور سیاسی مبصر، رفیق حبیب نے اس حوالے سے کہا ہے کہ مصر میں محمد مرسی کی منتخب حکومت کے خلاف کارروائی فوجی بغاوت ہے جس کے ذریعے ملک میں پھر حسنی مبارک کا نظام عملاً نافذ کر دیا گیا ہے۔ رفیق حبیب نے فیس بک پر اپنے تجزیے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ حالیہ بغاوت امریکا اور خلیجی ممالک کی خواہش اور تعاون سے برپا کی گئی ہے اور مصر کی فوجی قیادت کے ساتھ ان قوتوں کی مشاورت رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بعض خلیجی ممالک نہیں چاہتے کہ مصر میں اسلامی جمہوری حکومت آئے، کیونکہ اس سے ان کے ہاں رائج خاندانی شہنشاہیت کو خطرات درپیش ہیں۔ رفیق حبیب کے مطابق امریکی تھنک ٹینک کی نظر میں مصر میں اخوان کی اسلام پسند حکومت کی کامیابی کی صورت میں خطے میں امریکی پالیسیوں کو دھچکا لگ سکتا ہے جس کے بعد امریکا کو خطے کے معاملات میں دخل اندازی کا موقع نہیں ملے گا۔ تجزیہ کار کے مطابق اس مقصد کے لیے مصر کے سیکولر حلقے سے مذکورہ قوتوں نے خوب کام لیا ہے۔ مصر کو معاشی اور اقتصادی میدان میں کمزور کرنے کی سازشیں کی گئیں۔ دریائے نیل پر ایتھوپیا میں ڈیم بنانے کا مسئلہ کھڑا کر دیا گیا۔ پٹرول، گیس اور توانائی کے میدان میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ مصری تجزیہ کاروں اور اقتصادی ماہرین نے تسلیم کیا ہے کہ مرسی حکومت کے لیے بہت سے مسائل امریکا اور مغربی ممالک نے پیدا کیے۔ پھر سیکولر اور لبرل طبقات کی پشت پناہی کر کے ملک میں شورش پیدا کی گئی اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے اخوان کو بدنام کیا گیا۔

”صدر مرسی کی حکومت کے خلاف فوجی بغاوت کرانے کے لیے اپوزیشن جماعتوں کے اتحاد سالویشن فرنٹ میں شامل بعض سیاستدانوں کو کروڑوں ڈالر کے فنڈز دیے گئے۔“

ہی گھر میں رہتا ہے۔ چار بچے ہیں تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ پچھلے دنوں بیٹے اُسامہ اور بیٹی شائمہ نے پریس کانفرنس کر کے کہا محمد مرسی کو قید رکھنا ایک مقبول عام سوچ کو قید رکھنا ہے۔ ہمارا خاندان ان کی رہائی کے لیے ہر قانونی قدم اُٹھائے گا۔ ہم فوج کے خلاف چارہ جوئی کا ارادہ رکھتے ہیں کیونکہ وہی گرفتاری کی ذمہ دار ہے۔ اس سے چند روز پہلے دوسرے بیٹے نے کہا تھا والد محترم! جان دے دیجیے گا، عزت پر حرف نہ آنے دیجیے، جھکیے گا مت، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“

300 شراب خانوں اور نائٹ کلبوں کی رونقیں

مصر میں اسلام پسند صدر محمد مرسی کی حکومت کے خاتمے کے بعد 300 شراب خانوں اور نائٹ کلبوں کی رونقیں بحال ہو گئی ہیں۔ عبوری حکومت کی جانب سے ماہ رمضان کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے حیران کن حکم نامے کی رو سے شراب خانے اور نائٹ کلب کھولنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ صدر مرسی نے اقتدار سنبھالنے کے بعد رمضان کے حوالے سے جاری کردہ ضابطہ اخلاق کے تحت رمضان میں شراب خانے اور نائٹ کلبز بند رکھنے کا حکم جاری کیا تھا۔ اب حکام کی جانب سے اجازت ملنے کے بعد قاہرہ کے 300 شراب خانے اور نائٹ کلب دھڑلے سے کھولے گئے ہیں، جہاں گاہکوں کو پیش کی جانے والی اعلیٰ قسم کی شراب کو وزیر دفاع جنرل عبدالفتاح السیسی حوالے سے ”خمر سیسی“ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ عرب

امریکا نے اسراع الفتح کو کیسے استعمال کیا؟

الجزیرہ ٹی وی کی ایک رپورٹ کے مطابق مصر سمیت بعض دیگر عرب ممالک میں امریکا کے حامی عناصر کو سالانہ کروڑوں ڈالر فراہم کرنے کے لیے محکمہ خارجہ کے تحت چلنے والے ادارے یو ایس ایڈ، بیورو آف ڈیموکریسی، ہیومن رائٹس اینڈ لیبر، دی مڈل ایسٹ پارٹنرشپ اینڈ ایشیئو اور نیشنل انڈومنٹ فار ڈیموکریسی (این ای ڈی) کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ ادارے انٹرنیشنل ریپبلکن انسٹی ٹیوٹ، نیشنل ڈیموکریٹک انسٹی ٹیوٹ اور فریڈم ہاؤس جیسے اداروں کو رقوم کی تقسیم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ انویسٹی گیٹو رپورٹنگ پروگرام کی حاصل کردہ دستاویزات سے پتا چلتا ہے کہ ان اداروں کے ذریعے مصر میں صدر مرسی کے مخالفین کو فنڈز فراہم کیے گئے۔ مصر میں زیادہ تر فنڈنگ نیشنل انڈومنٹ فار ڈیموکریسی (این ای ڈی) کے ذریعے کی جا رہی ہے۔ دستاویزات کے مطابق صرف 2011ء کے بجٹ میں کانگریس نے این ای ڈی کو 118 ملین ڈالر کی منظوری دی، جبکہ امریکا نے صدر مرسی کی حکومت کے خلاف فوجی بغاوت کرانے کے لیے اپوزیشن جماعتوں کے اتحاد سالویشن فرنٹ میں شامل بعض سیاستدانوں کو بھی فنڈز دیے، جنھوں نے اسے تحریک کو متشدد بنانے کے لیے استعمال کیا۔ مصری ڈیموکریٹک اکیڈمی نامی این جی او کی سربراہ اسریٰ عبدالفتح کو بھی صدر مرسی کے خلاف استعمال کیا گیا۔ اسریٰ نے مساجد تک کا گھیراؤ کیا اور نمازیوں اور ان افراد پر پتھراؤ کرائے جو آئین کو اسلامی بنانے کے حامی تھے۔ اسریٰ کو بھی لاکھوں ڈالر فراہم کیے جا رہے ہیں۔

”جرمن وزیر خارجہ نے مصری عسکری قیادت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ معزول کیے جانے والے صدر مرسی کو فی الفور اور بلا مشروط رہائی دے۔“

جریدے، الوطن کی رپورٹ کے مطابق مصر میں اخوان المسلمون کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد سیکولر عناصر نے حکومتی سرپرستی میں کھلے عام اسلامی تعلیمات کی مخالفت اور دینی شعائر کی بے حرمتی کے ارتکاب کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ الوطن کے مطابق ماہ رمضان میں شراب نوشی اور رقص و سرود کی محفلیں جمائی جارہی ہیں۔

ترک وزیر خارجہ کی مرسی کے حق میں چلائی مہم کیسے رنگ لائی؟

جرمن جریدے ”داراپسی جیل“ نے ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ ترک وزیر خارجہ کی جانب سے اسلام پسند مصری صدر مرسی کے حق میں چلائی جانے والی رابطہ مہم رنگ لے آئی ہے اور جرمن وزیر خارجہ Guido Westerwelle نے ایک بیان میں مصری عسکری قیادت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ معزول کیے جانے والے صدر مرسی کو فی الفور اور بلا مشروط رہائی دے کیوں کہ ایسا نہ کرکے جمہوریت اور جمہوری اقدار کو نقصان پہنچایا جارہا ہے۔ ترک جریدے ”ڈیلی حریت“ کا کہنا ہے کہ ترک وزیر خارجہ داؤد اوغلو کی جانب سے 22 ممالک کے وزرائے خارجہ سے مصر کے بحران پر کی جانے والی بات چیت کا پہلا مثبت نتیجہ جرمنی سے برآمد ہوا ہے اور جرمن وزیر خارجہ ویسٹر ویلے نے مصری عسکری قیادت سے سخت لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے سابق صدر کی رہائی اور اسلام پسندوں کے خلاف یک طرفہ کریک ڈاؤن ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ برطانوی

امریکا میں مقیم سزا یافتہ مصری کرنل اخوان کو زندہ جلا دینے کی ترغیب دیتا رہا

گزشتہ 4 برسوں سے سالانہ ایک لاکھ 20 ہزار ڈالر فنڈز دیے جارہے ہیں، جبکہ دیگر ذرائع سے بھی اس کی فنڈنگ کی جاتی ہے، جس کے ذریعے مصر میں تشدد کو ہوا دی جاتی ہے۔ یہ فنڈز عفیفی کو اس کی تنظیم حقوق الناس کے نام پر دیے گئے۔ تشدد کو ہوا دینے پر اسے مصر میں غیر حاضری پر 5 برس قید کی سزا بھی ہوچکی ہے۔ اسے سب سے زیادہ منتخب صدر مرسی کے خلاف استعمال کیا گیا۔ عفیفی سوشل میڈیا پر مصری حکام کے خلاف حملوں کی ترغیب دیتا رہا۔ مصر میں ملازمت کے دوران انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزیوں میں ملوث عفیفی کو 2008ء میں ہیومن رائٹس فیلوشپ سے نوازا گیا۔ عفیفی سلمان نے امریکا سے فنڈز لینے کی تصدیق کی ہے، تاہم کہا ہے کہ یہ مونگ پھلی کی طرح ہے۔ سوشل میڈیا پر موجود عفیفی کے پیغامات میں وہ کھلے عام صدر مرسی کے خلاف پُرتشدد احتجاج، حتیٰ کہ قتل و غارت کی ترغیب دیتے نظر آئے۔ اس طرح امریکی سرزمین کو مصر میں تشدد کو ہوا دینے کے لیے استعمال کیا گیا۔ فیس بک پر ایک پیغام میں وہ اپنے حامیوں کو کہتے پائے گئے کہ اخوان المسلمون والوں کی ٹانگیں توڑ دو۔ ایک اور پیغام میں اس نے قاہرہ میں احتجاج کے لیے جانے والے اخوان کے کارکنوں کو زندہ جلا دینے کا کہا اور اس کے لیے طریقہ بھی بتایا۔ اس نے کہا کہ سڑک پر درخت پھینک کر یا گڑھے کھود کر قاہرہ جانے والی بسوں کو روکو اور پھر انھیں سواروں سمیت جلا دو۔ ایک اور پیغام میں اس نے یونیفائیڈ سروسز فراہم کرنے والے اداروں کے اعلیٰ حکام کو قتل کرنے کی ہدایت کی۔

”امریکا اسلام کے طاقتور ملکوں کی افواج کو ختم کرنا چاہتا ہے پہلے وہ ان کی مدد کرتا ہے پھر انھیں اپنے ہی ملک کے عوام سے لڑواتا ہے۔“

جریدے ٹیلی گراف کا کہنا ہے کہ جرمنی کی دیکھا دیکھی امریکا نے بھی مرسی کی رہائی کے لیے نیا مطالبہ کیا ہے۔

کیا فوج کے لیے اپنے اقدام سے پیچھے ہٹنا ممکن ہوگا

ڈاکٹر خالد دیب کا تعلق منصورہ شہر کے قریب ہی واقع مدغم سے ہے۔ یہ خوب صورت اور تاریخی جگہ ہے جہاں دریائے نیل کے دو ملکوں سے آنے والے الگ الگ حصے باہم ملتے ہیں۔ دو سال قبل جب ڈاکٹر انتظار مصر گئے تو انھیں ڈاکٹر دیب اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ تب حسنی مبارک کے خلاف مظاہرے جاری تھے۔ کھانے سے ذرا پہلے انھوں نے ڈاکٹر انتظار سے کہا نمازِ جمعہ کے لیے چلتے ہیں، کافی امکان ہے کہ وہاں میری گرفتاری ہوجائے (ان کا شمار وہاں اخوان کے نمایاں ترین سیاسی اور تنظیمی شخصیات میں ہوتا تھا۔ وہ کئی بار گرفتاریوں اور سزاؤں کا سامنا کرچکے تھے) بٹ صاحب کی حیرت آج تک نہیں جاتی کہ کوئی آدمی گرفتاری کو اتنا بھی نارمل لے سکتا ہے کہ پورا پلان اس

گو سیسی گو

ہفتے کی صبح مصری فوج نے رابعہ العدویہ کے میدان کو خالی کرانے کے لیے اس پیغام پر مبنی پمفلٹ پھینکے کہ تمام مصری بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا آپ میدان خالی کردیں۔ لیکن اس پر مظاہرین میں مزید اشتعال پھیل گیا۔ انھوں نے ”الٹا گو سیسی گو“ کے نعرے لگانے شروع کردیے۔ مظاہرین نے کہا کہ وہ میدان صرف اس صورت میں چھوڑیں گے جب انھیں یقین ہوجائے گا کہ صدر مرسی ایوان صدر لوٹ گئے ہیں اور یہ کہ وہ یہاں صدر مرسی کی رہائی کے لیے نہیں بلکہ ان کو ان کا جائز مقام دلانے کے لیے بیٹھے ہیں۔

امریکا اسلام کے طاقتور ملکوں کی افواج کو ختم کرنا چاہتا ہے پہلے وہ ان کی مدد کرتا ہے پھر انھیں اپنے ہی ملک کے عوام سے لڑواتا ہے۔ عراق اور لیبیا کی فوج تباہ ہوچکی ہے، شامی فوج بھی تباہ ہورہی ہے۔ اب اسلامی دنیا میں صرف دو ممالک کی افواج رہ گئی ہیں جو لڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ایک مصری فوج اور دوسری پاکستان آرمی۔ ابوبکر کے مطابق مصر میں فوجی انقلاب کے بعد یہی بحث ہوئی تھی کہ پاکستان میں فوجی انقلاب کے بعد سول حکومت آجاتی ہے۔ مصر میں ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ صدر مرسی کو جس طریقے سے فوجیوں نے مسند اقتدار سے اتار پھینکا ہے، عرب عوام سمجھتے ہیں کہ انھیں اپنے ملک میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اس لیے کہ عرب ممالک کی افواج کو یہودی لابی کنٹرول کیے ہوئے ہے۔ مصر، شام اور خلیجی ممالک کی افواج بھی اس میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے عرب ممالک مصری فوج کا ساتھ دے رہے ہیں۔ عرب صحافی کا مزید کہنا ہے کہ مرسی دور حکومت کے 9 ماہ امریکا نے دل پر پتھر رکھ کر برداشت کیے۔ مرسی حکومت نے اس دوران کارانجن بنانے شروع کیے۔ کمپیوٹر ٹیلنٹس (ایڈوانسڈ کمپیوٹر) کی پروڈکشن شروع کی۔ گندم کی پیداوار بڑھائی تاکہ مصر خود انحصاری کی طرف بڑھے۔ لیکن امریکا کو پسند نہیں تھا کہ مصر خود انحصاری کی طرف جائے۔ اس لیے کہ مصر امریکی گندم اور امریکی مصنوعات کی اولین منڈی ہے۔ عرب تجزیہ نگاروں کو خدشہ ہے کہ مصری فوج امریکا کی ایما پر مصر میں بہت بڑی خونریزی کرائے گی کیونکہ امریکا نے محمد البرادی کو اس کام کے لیے تعینات کیا ہے جنھوں نے عراق کو تباہ کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور مصر کو ایٹمی طاقت نہیں بننے دیا باوجود اس کے کہ مصر کے پاس بڑے ایٹمی سائنس دان تھے۔ محمد البرادی اس وقت عبوری حکومت میں نائب صدر بن کر امریکی ایجنڈے کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

”قاہرہ ائیر پورٹ کو جانے والی سڑک پر اخوان المسلمون کے مظاہرین کے خلاف بڑی کارروائی کے لیے ملٹری ہارڈ ویئر اور آرمڈ پرسونل کیریئرز پہنچادی گئی ہیں۔“

کے سامنے ہو۔ بولے آپ مہمان ہیں۔ گرفتاری کے بعد بڑا بیٹا عبدالرحمٰن آپ کو گھر ساتھ لے آئے گا۔ کھانا کھلائے گا اور پھر قاہرہ چھوڑ آئے گا۔ پریشانی نہیں ہوگی آپ کو۔“ ایک ڈاکٹر خالد دیب کا کیا ذکر، اخوان کو ایسے لاکھوں بے لوث انقلابی، جذباتی کارکنان اور راہنماؤں کا ساتھ حاصل ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اس طویل ہوتے احتجاجی پروگرام کو کتنی دیر جاری رکھ سکیں گے اور کیا واقعی تاریخ میں پہلی بار یہ ہو پائے گا کہ فوج اپنی بغاوت کے اقدام سے پیچھے ہٹ کر جمہوری نظام کو جاری رہنے کی اجازت دے دے گی؟ بظاہر ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ مصر کی جیلوں کو اخوان سے انس ہے اور فوج کے لیے انھیں بھرنا اور اخوان راہنماؤں کو سزاؤں سے ہمکنار کرنا جمہوریت کو راستہ دینے سے نسبتاً آسان ہے۔ ماضی میں مصری فوج کا ہاتھ اس معاملے میں کافی کھلا رہا ہے مگر تب اخوان مار کھا کر سر جھکا لیا کرتے تھے۔ پورے قد سے کھڑے لاکھوں اخوانیوں کو اس بار جھکانا کیا ممکن ہوگا؟ کیا اخوان کو جمہوری نظام میں حصہ لینے اور جیتنے سے باز رکھنے کی نامسعود کوششیں کارگر ہوسکیں گی؟ امریکا، آرمی اور عدلیہ کا ٹرائیکا مصری تاریخ کا پہیہ کتنی دیر روک سکے گا؟ بیشک تاریخ بدلتی ہے۔ تاریخ بنتی ہے اور بدلنے اور بنانے والوں کا انتظار کرتی ہے۔ اسی انتظار میں سفرنامے کی قسط بھی ادھوری رہی۔ ■■■

اخوان پر پابندی کے باعث نئی جیت کا امکان

مصری حکام کا کہنا ہے کہ ان کے پاس اخوان المسلمون کو غیر قانونی قرار دینے کا آپشن موجود ہے اور اگر اخوان المسلمون کی قیادت نے نگراں حکومت میں شامل ہونے کی پیشکش نہ مانی تو آیندہ دس روز میں اس پر پابندی کا فیصلہ کرلیا جائے گا۔ ادھر امریکی جریدے ”ڈیلی بیسٹ“ کا کہنا ہے کہ عسکری قیادت کو اخوان المسلمین کے حوالے سے اپنا لب ولہجہ تبدیل کرنے اور رویے میں نرمی لانے کی ضرورت ہے کیوں کہ اخوان المسلمون کے معزول صدر مرسی کو رہا کرنے اور اس کے حامیوں کے خلاف کریک ڈاؤن روکے بغیر حالات کو معمول پر نہیں لایا جاسکتا۔ واضح رہے کہ اخوان المسلمون نے سیاسی طاقت کے پرامن مظاہرے سے عالمی افق پر اپنی حیثیت منوالی ہے اور امریکی، یورپی اور عرب میڈیا نے تسلیم کیا ہے کہ اخوان المسلمون کے تمام مظاہرے پرامن اور منظم تھے اور اس تنظیم نے مستقبل میں بھی ایسے ہی مظاہروں کے انعقاد کا اعلان کیا ہے۔ جرمن جریدے ”داراپسی جیل“ کا کہنا ہے کہ عسکری قیادت کی پالیسیوں نے اخوان المسلمون کو دیگر اسلامی جماعتوں کے ساتھ یکجا کردیا ہے اور اس وقت مصر بھر کے تمام اسلام پسند، جنرل فتاح السیسی کی پالیسی کے سبب منظم ہوچکے ہیں اور اس بات کے روشن امکانات ہیں کہ آیندہ الیکشن میں اخوان المسلمون کو کامیابی حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ جریدے نے اپنی رپورٹ میں ایسے ہزاروں مصریوں کا ذکر کیا ہے جو اخوان المسلمون کے کارکن یا ہمدرد نہیں تھے لیکن وہ فوج کی جانب سے حکومت کی معزولی پر سخت ناراض و مشتعل ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ وہ مرسی کے اس حق کی حفاظت چاہتے ہیں کہ ایک جمہوری صدر ہونے کے ناتے انھیں اپنی مدت صدارت پوری کرنے کا موقع دیا جائے۔

باتیں نئی، تحریریں نئی

تصویر

ایک معصوم بچی کی گمشدہ کتاب کا ماجرا اس کے رونے کی اصل وجہ کچھ اور تھی

ناجیہ ملک

کھانا پکاتے ہوئے صبیحہ کے آنسوؤں نے اتنا پریشان کیا کہ عجیب سے احساسات میں گھری کمرے میں چلی آئی۔ ہنڈیا میں بھی مجھے اس کے آنسو تیرتے نظر آرہے تھے۔ بیڈ پر بیٹھ کر میں نے کمبل لپیٹا اور ممتاز مفتی کی کتاب ”ان کہی“ کھول لی۔ مقصد صرف ان آنسوؤں سے پیچھا چھڑانا تھا۔ لیکن یہ کوشش بھی زیادہ دیر کامیاب نہ ہوسکی۔ دو بھیگی بھیگی آنکھیں کتاب کے صفحے پر ابھر آئیں اور سارے لفظ ادھر اُدھر بھاگ گئے، کتاب ہاتھ سے کھسک کر نیچے جا پڑی اور ذہن اُن آنسوؤں میں ڈوبتا چلا گیا۔ سردی کا احساس ہوا میں نے کمبل سر تک تان لیا اور کتاب تکیے کے نیچے رکھ دی۔

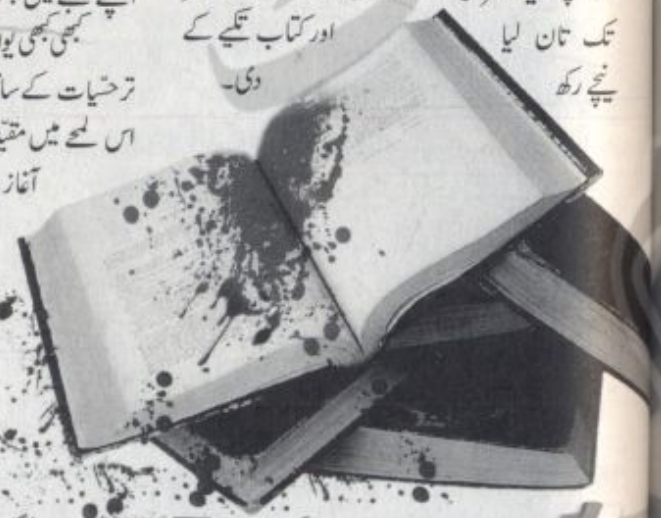

دن بھر کی تھکن دماغ پر بُری طرح حاوی ہوگئی۔ ایسے میں نیند کی دیوی فوراً مہربان ہو جایا کرتی ہے، کیونکہ سارا دن بچوں کے ساتھ مصروفیت اس قدر تھکا دیتی تھی۔ مجھے اسکول میں پڑھاتے چند ہی دن ہوئے تھے۔ وہی گورنمنٹ کے اسکولوں کے عام مسائل، کلاسز زیادہ اور اسٹاف کی کمی کے باعث ایک وقت میں دو دو، تین تین کلاسز کو سنبھالنا ایک مشکل اور صبر آزما کام تھا۔ 8 اکتوبر کے سانحے نے عمارت ڈھا کر رہی سہی کسر پوری کردی تھی۔ لیکن ان تمام مسائل کے باوجود اس اسکول کا معیار تعلیم بے حد اچھا تھا، وجہ انتھک محنت تھی جو شدید قسم کی تھکن سے دوچار کردیتی تھی۔ یوں تھک کر بستر پر لیٹتے ہی نیند کی وادی میں اتر جاتی۔ لیکن آج نیند کی جگہ بھی ان آنسوؤں نے لے لی تھی۔ چند لمحے بے چینی سے کروٹیں بدلنے کے بعد میں باہر کھلی فضا میں نکل آئی۔ ساری وادی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی، ستاروں کے ساتھ تنہا سفر کرتی رات بھی اپنے اندر اُداسیاں سمیٹے ہوئے تھی۔ ذہن ایک بار پھر دن کے اس واقعے کی طرف جا نکلا اور اعصاب شکن لمحوں نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کوئی ایک واقعہ آپ کو تمام ترحسیات کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے، پھر آپ اس لمحے میں مقید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تیسرے پیریڈ کا آغاز ہوا تو سورج نے بھی پہاڑوں کے پیچھے سے طلوع ہو کر اپنی شکل دکھائی، جاتی ہوئی سردیوں کی نرم سی دھوپ خوشگوار حرارت لیے ہوئے تھی۔ جماعت سوئم کی طالبات کو لکھنے کا کام دے کر میں نے ان کی ہوم ورک والی کاپیاں

اٹھالیں، ابھی تین چار کاپیاں ہی چیک کی تھیں جب سسکیوں کی آواز بے حد قریب سے آئی۔ وقت کم تھا اور مقابلہ سخت والا حال تھا۔ بے تحاشا مصروفیت میں نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ادھر دیکھا جدھر سے سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ کرسی کے عین پیچھے بیٹھی صبیحہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ ہر دم ہنستا مسکراتا سرخ و سفید چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ دکھ اور خوف کی پرچھائیاں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' جواب ندارد۔

کاپیاں میز پر رکھ کر میں پیچھے مڑی اور اس کا چہرہ اوپر کرنا چاہا تو اس نے گھٹنوں میں چھپا کر مزید تیزی سے رونا شروع کر دیا۔ رونے کی وجہ جاننے کی ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد ناکام ہو کر میں نے دوبارہ کاپیاں اٹھالیں۔

اس بے وقت کی راگنی نے مجھے شدید کوفت میں مبتلا کر دیا۔ جی چاہا ایک کرارا سا تھپڑ جڑ دوں۔ اچانک خیال آنے پر میں نے ساتھ بیٹھی بچی سے پوچھا: ''اس کی کتاب گم ہوگئی ہے اس لیے ہر طرف ڈھونڈی نہیں ملی'' بچی نے بتایا۔ وجہ جان کر مجھے اطمینان کا احساس ہوا تو میں بھی مطمئن ہو کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''کون سی کتاب تھی؟''

''اُردو کی۔''

اوہو! یہ کوئی رونے والی بات ہے میرے پاس اردو کی کتاب ہے وہ لے لو اور چپ ہو جاؤ۔ لیکن آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے۔ میں نے ہمدردانہ لہجے میں صبیحہ سے کہا ''رونا ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا کتاب تھی، کوئی انسان نہیں جو کھو جائیں تو ملتے نہیں۔'' یہ جملہ بے اختیار میری زبان سے پھسلا تھا جس پر بعد میں افسوس بھی ہوا۔ چلو میں آپ کو نئی کتاب لے دوں گی بس اب خاموش!

''مس یہ کہہ رہی ہے اپنی والی کتاب لوں گی۔'' ساتھ والی بچی نے کہا۔

''اب میں اپنی والی کتاب کہاں سے لاؤں؟''

''کہاں چھوڑی تھی؟''

لیکن آنسوؤں کی شدت سے اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ کام ختم کر کے میں نے کاپیاں بچوں کو تھمائیں تو میز کے اوپر ایک کتاب رکھی نظر آئی۔ ایک کتاب تو یہ ہے، یہ رکھی ہے یہ تو نہیں یہ سنتے ہی اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور تیر کی طرح لپکی۔

چوتھے پیریڈ کی گھنٹی بجی تو سارے بچے بیگ اٹھائے باہر بھاگ گئے۔ جب کہ وہ اردگرد سے بے خبر تیزی سے کتاب کے صفحے پلٹ رہی تھی، چہرے پر شدید الجھن کے آثار تھے۔

ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گئی اور پھر اس کے چہرے پر سکون پھیل گیا۔ ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ بڑی دلفریب تھی۔ وہ کتاب کے صفحے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ میں نے یہ منظر نہایت دلچسپی سے دیکھا اور بے اختیاری میں ہاتھ بڑھا کر کتاب لے لی۔ صفحوں کے بیچوں بیچ ایک آدمی کی تصویر تھی جس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ یہ میرے ابو ہیں، یہ کراچی کی تصویر ہے، جب وہ وہاں کام کرتے تھے۔ بے پناہ پیار اس کے لہجے میں سمٹ آیا تھا۔ میرے ابو چھٹی پر گھر آئے تھے اور پھر زلزلہ آیا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ اب میں ان کی تصویر اپنے پاس رکھتی ہوں، میں کتاب کے لیے نہیں تصویر کے لیے روئی تھی۔

اس نے کتاب میرے ہاتھ سے لی کسی قیمتی متاع کی طرح اپنے سینے سے لگائی اور باہر نکل گئی۔

کیا بے جان تصویریں انسانوں کا نعم البدل ہوتی ہیں، میرا دل دکھ کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

اور اب صبیحہ کے آنسو.....!!

باتیں نئی، تحریریں نئی

سمندر کنارا

سمندر کی بپھری موجوں کی ساحرانہ کشش کا احوال جو لوگوں کے غم، پریشانی، بے چینی اور بے سکونی کو بہالے جاتی ہیں

عبدالقیوم

قدرت نے انسان کو پرندوں کی سی بے فکری کی کتنی نعمت عطا کی ہے، اس کا اندازہ تب ہوتا ہے جب سمندر کنارے کی ساحرانہ کشش مجھے اپنی جانب کھینچتی ہے۔ میں ہجوم اور ہاؤ ہُو کے عادی دوستوں کی محفل سے دامن چھڑا کر، سمندر کنارے کی مہرباں ماں کی طرح وا آغوش کی طرف لپکتا ہوں تو اس کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی جب لوگوں کے ہجوم کو خوش و خرم اور بچوں کو ہنستے، مسکراتے، دوڑتے اور بھاگتے دیکھتا ہوں تو پریشانیوں اور فکرمندیوں سے چھٹکارا پا کر میرے دماغ کی تنی رگیں دھیرے دھیرے ڈھیلی پڑنے لگتی ہیں۔ سکون و اطمینان کی پرچھائیاں میرے وجود پر سایہ فگن ہو کر مجھے بے فکری کے حصار میں لے لیتی ہیں، تب میں خود کو مکمل تنہائی کے ماحول میں جذب کر لیتا ہوں۔

ذہنی اور قلبی سکون کے متلاشی سمندر کنارے کے جادو سے مسحور ہو کر اس سحر آفریں ماحول میں گم ہونے کے لیے جوق در جوق آتے ہیں۔ بچوں کے خوشی کے بے ہنگم قہقہوں اور شور شرابے سے قطع نظر، سمندر کی منہ زور موجوں سے محبت کرنے والی خواتین بے فکری سے شلوار کے پائنچے گھٹنوں تک چڑھائے..... للچاتی نظروں سے تکنے والوں سے بے نیاز، یوں پانی کے اندر آگے بڑھتی ہیں جیسے دُور تک بڑھتی ہی چلی جائیں

گی۔ خوشی کے مارے خون کی سرخی سے تمتماتے چہروں اور بے تحاشا قہقہوں کی اسیر بن کر موجوں کی نوعیت سے بے پروا وہ آگے ہی آگے قدم بہ قدم چلی جاتی ہیں۔ لیکن جونہی زور دار اور پُرشور اچھلتی بپھری موجوں کو اپنی طرف لپکتا دیکھتی ہیں تو خوفزدہ ہو کر بے ہنگم چیخوں اور شوروغل کے ساتھ الٹے پاؤں کنارے کی طرف آنکھیں بند کر کے، افراتفری کے عالم میں اپنے تن بدن کی ہیئت کذائی سے بے نیاز یوں پناہ کے لیے بھاگتی ہیں جیسے اچھا بھلا عقل مند انسان مصیبت آنے پر بچاؤ اور خودحفاظتی کے لیے اکثر بے سوچے سمجھے نتیجے سے بے نیاز جس سمت منہ اٹھتا ہے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ انسان کی یہ بوالعجبی میرے لیے ہمیشہ ایک سوالیہ نشان رہی ہے کہ نامناسب حالات اور مصیبت کا سامنا ہونے پر تحفظ کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کی بجائے وہ کیوں قلبی اطمینان اور ذہنی توازن کھو کر تنکے کا سہارا لینا گوارا کر لیتا ہے۔

قدرت نے سمندر کو حسن و دلکشی کی دولت سے اسی لیے نوازا ہے کہ وہ انسان کو ماحول کی سادگی اور جاذبیت کا پرستار بنا کر، دنیاوی چمک دمک اور فضول میلوں جھمیلوں سے دامن بچانے کی تربیت دے سکے اور اسے گناہوں کی سرزمین آباد نہ کرنے دے جس میں وہ آنکھیں رکھنے کے باوجود بھی رچ بس جانے کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ مجھے تو سمندر کنارا مذہبی تعلیمات کا ایک استعارہ لگتا ہے جو انسان میں مثبت تحریک پیدا کرتا ہے اور دنیاوی منفی اقدار سے مختلف ہونے کی خُو بُو پیدا کرتا ہے۔ شاید ہی کوئی شخص سمندر کنارے ٹہلتے اور لطف اندوز ہوتے ہوئے، فکر و تردد اور غیبت و حسد کے کانٹوں سے الجھ کر، فکری آلودگی سے خود کو بے بسی اور پریشان خیالی کے حصار میں بے دست و پا کرتا ہے۔ وہ تو ہر قسم کی منفی سوچوں سے دامن بچا کر سمندر کی موجوں کے لوری آمیز دھیمے دھیمے شور اور ہوا کے نرم نرم، سرور آمیز جھونکوں سے مسرور ہو کر سکون و آرام کشید کرتا ہے۔ دنیاوی بکھیڑوں اور الجھنوں کے شکار لوگ کبھی اکثر سمندر کنارے کی ساحرانہ کشش اور ماحول کے پُرسکون لمحات میں سیر و تفریح اور چہل قدمی کو دستیاب وقت کا حصہ بنانے کی حتی المقدور کوشش کرتے اور ذہنی بوجھل پن سے نجات پانے کی سعی مشکور کرتے ہیں۔

آج کا مال و زر کا قیدی اور مصروف انسان مناظر فطرت کے حسن و جاذبیت سے صرف نظر کر کے، مصنوعی آسائشوں کے حصول میں اتنا مگن و مصروف ہے کہ جسمانی و ذہنی صحت سے غفلت کے بھیانک نتائج کا ادراک نہیں کر پاتا اور بے چینی و بے سکونی کا شکار رہتا ہے۔ اگر کبھی ایسا شخص سمندر کنارے تپتی دوپہر میں آبی پرندوں کے غول بالخصوص مرغابیوں کو ہجوم کی شکل میں ایک جگہ اکٹھا ستاتا ہوا دیکھنے کی زحمت گوارا کرے کہ وہ کس طرح ایک پیٹ بھرے متمول شخص کی طرح قیلولہ کی لذت سے لطف اندوز ہوتی ہیں تو اس کے دل میں چھپی حرص و ہوس کی منہ زور لہروں کا رخ بدلنے کی صورت میں اس کی بے اطمینانی اور پریشانیوں کا مداوا ناممکن نہیں رہتا۔

سمندر کنارے سے میری وابستگی کے ڈانڈے اس وقت سے ملے ہوئے ہیں، جب لڑکپن میں صرف نیکر اور میلی کچیلی بنیان پہنے، مچھیروں کو جال کے ذریعے مچھلیاں پکڑتے ہوئے بڑے چاؤ سے دیکھا کرتا تھا۔

جب وہ جال کنارے پر لاتے تو اس میں چھوٹی بڑی مچھلیاں تلملاتی اور اچھل کود کر رہی ہوتیں۔ جب تک مجھ میں مچھلیاں پکڑنے کا شعور بیدار نہیں ہوا تھا۔ مچھیروں کی دیکھا دیکھی میں بھی چھوٹی مچھلیوں کو واپس سمندر میں پھینک کر ان کا ہاتھ بٹاتا۔ لیکن جب چھوٹی مچھلیوں کی اہمیت کا احساس ہوا تو ان کی افادیت کے پیش نظر، مچھیروں کے منع کرنے کے باوجود بھی ان کی نظریں بچا کر انھیں جمع کرتا۔ بعد میں مچھلی پکڑنے والے ہُک میں بطور چارہ استعمال کر کے دو تین گھنٹے مچھلیاں پکڑنے میں گزار دیتا۔ بمشکل چند بڑی مچھلیاں ہاتھ لگتیں تو انھیں ڈور میں پرو کر ہاتھ میں لٹکائے، گنگناتے ہوئے گھر لوٹتا۔

سمندر کنارا میرے خون میں رچ بس گیا تھا۔ جوان ہونے پر بھی اس کی کشش سے خود کو آزاد نہ کر سکا۔ اکثر مچھیروں سے میں نے گفتگو کے وسیلے سے ان کے ذہنوں کو ٹٹولا ہے۔ ہر مرتبہ مجھے یہی اندازہ ہوا کہ سمندر کنارے بسنے والے مچھیرے اکثر ذہنی پریشانیوں سے بیگانہ اور فکر امروز و فردا سے لاتعلق ہوتے ہیں۔ دل کا حال خدا جانے، لیکن مجھے تو ہمیشہ یوں لگا کر جیسے وہ پہنچے ہوئے اللہ والوں کی طرح دنیاوی لالچ سے آزاد ہیں۔ وہ مفلسی کے تنگ حصار میں رہنے بسنے کے باوجود خوش و خرم اور ہشاش بشاش رہتے ہیں جیسے انھیں یقین واثق ہو کہ اب کے جال سمندر میں ڈالا تو وافر مقدار میں بڑی مچھلیاں ہاتھ لگیں گی۔ امید کا دیا ان کے ذہنوں میں ہمیشہ روشن رہتا ہے۔ وہ شہری لوگوں کی طرح اکثر متفکر اور سوچ بچار کے بھنور میں ڈبکیاں نہیں کھاتے رہتے۔ پیوند لگے معمولی لباس، ننگے سر اور ننگے پاؤں، جال کو تھامے جب مچھیرے سمندر کی موجوں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھتے ہیں تو مجھے ان کی دلیری اور رزق حلال کے لیے جدوجہد کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

جب میں ننگے پاؤں سمندر کنارے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر کھڑے ہو کر دُور اُفق پر نظریں جماتا ہوں تو آنِ واحد میں میرا ذہن صدیوں پیچھے چلا جاتا ہے، جب دنیا میں نہ دُخانی جہاز تھے اور نہ دریاؤں کو روکنے اور ان کا رخ موڑنے کے لیے پشتے اور پُل تعمیر کرنے کا شعور جاگا تھا۔ جب دنیا میں تہذیب و تمدن اور سائنس کا راج نہیں تھا۔ لوگ ترقی کرنے کے جنون سے کوسوں دور تھے۔ قدیم زمانے کا انسان کشتی نما تختوں پر بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سمندر کے بہاؤ کے رحم و کرم پر خاندان اور اہل و عیال کے ساتھ سفر کرتا کہاں سے کہاں پہنچ جایا کرتا تھا۔ وہ فطرتاً معاشی طور پر پرندوں کی طرح آزاد تھا۔ اپنے قبیلے کے علاوہ اگر اسے کسی شے سے انسیت تھی تو وہ صرف سمندر کا کنارا ہوا کرتا تھا، جسے وہ اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھا کرتا تھا۔ اسی لیے جب وہ بپھری موجوں اور سمندر کی تیز روانی سے چھٹکارا پا کر کنارے کسی ساحل پر اترتا تو عموماً سرسبز و شاداب وادی یا جنگل میں جا نکلتا تھا۔ انسان اور حیوان، دونوں غذا کے لیے سرسبز و شاداب وادیوں کے ساتھ ساتھ گھنے جنگلوں کے محتاج ہوا کرتے تھے۔ لیکن یہ محتاجی انھیں اس لیے قبول تھی کہ ان پر کسی اور کا راج نہیں ہوتا تھا۔ جو گروہ سب سے پہلے ان وادیوں میں پہنچ جاتا، وہ ڈیرے ڈال کر رہنے لگتا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہو جاتا۔

میں جب بھی ہر شے سے بے نیاز ہو کر ذہنی و فکری

رشتہ توڑ کر سمندر کی بپھری موجوں کی شائیں شائیں سے اپنا ناطہ جوڑتا ہوں تو جیسے وہ زبانِ حال سے مجھ سے کہتی ہیں کہ ہم بنی نوع انسان کی بے لوث خدمتگار اور ہمدرد ہیں۔ ہم ہی انسان کو ہیبت ناک اور خود سر سمندر سے باحفاظت نکال کر کنارے سے آشنا کرتی ہیں کہ وہ ازسرِ نو زندگی کا آغاز کر سکے، ہم ہی انسانوں کی ساحلوں کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ لامحدود سمندر میں محو سفر کشتیوں اور دیوہیکل بحری جہازوں کو بندرگاہ کی طرف دھکیلنے میں معاون ہوتی ہیں کہ خود ہماری عارضی منزل سمندر کنارا ہی ہوتا ہے کہ ہمیں پھر سمندر اپنی بانہوں میں سمیٹ کر خود میں جذب کر لیتا ہے۔

گھر کے گھٹے گھٹے ماحول سے جب میری طبیعت اوبتی تو تھوڑے فاصلے پر موجود سمندر کنارا ہی میری پناہگاہ ہوا کرتا تھا، جہاں کا کھلا ڈلا ماحول، ٹھنڈی ہوا کے تسکین بخش جھونکے اور تاحد نظر پھیلے سمندر کی ہلکی ہلکی شائیں شائیں، مجھے ذہنی تناؤ سے نجات دلایا کرتی تھی۔ یہی سمندر کنارا امتحانات کے دنوں میں ہمیں مطلوبہ سازگار ماحول فراہم کرتا۔ آس پاس بسنے والے ہم طالب علم ساتھیوں کے لیے ایک پُرسکون اور کشادہ کھلے ایئر کنڈیشنڈ ہال کی مانند تھا جس کی پناہ میں ہم معاشرے اور شور شرابے کے ماحول کی الجھنوں اور فکر و تردد سے نجات پا کر، امتحانات کی تیاری کرتے اور غروب آفتاب کے ساتھ ہی ہلکے پھلکے ذہن کے ساتھ گھروں کو لوٹا کرتے تھے۔ آج بھی جب میں عرصہ بعد وہاں جا نکلتا ہوں تو سمندر کنارے کا ماحول مجھے مسحور کر دیتا ہے اور آنکھیں بند کرتے ہی یادوں کی لہروں کے دھیرے دھیرے ہلکورے، مجھے بیتے دنوں کے شہد آگیں لمحوں کی وادی میں پہنچا کر آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر لاتے ہیں۔

قدرت کے اصول نرالے ہیں۔ سمندر کنارا امن و سلامتی کا نشان سمجھا جاتا ہے، اسی لیے آج بھی امن پسند اور سکون کے متلاشی لوگ ایسے ماحول کے قریب آباد ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر اس المیے سے بھی مفر ممکن نہیں کہ بالآخر ایک نہ ایک دن بپھرے اور بے قابو سمندر کی زد میں آ کر وہ بے گھری کے دکھ اور مال و زر اور جان کے زیاں سے بھی دوچار ہو ہی جاتے ہیں۔ سمندری طوفان کی شہ پا کر غضبناک موجیں کنارے پر آباد غریبوں کی جھونپڑیوں اور امیروں کے محل نما گھروں کو مع مال و اسباب بہا لے جاتی ہیں۔ وہ لوگ جو اس تباہی سے دوچار ہوتے ہیں وہ بے بسی سے ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔ ان کا امن و شانتی پر سے اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ چپ چاپ، بے ضرر اور شانت زندگی پر قانع رہنے والے آخر کیوں کسی نہ کسی دن زبردست کے ہاتھوں اپنی اصلیت اور شناخت کھونے کے ساتھ ساتھ امن و سکون سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں۔ قیامت خیز زلزلے، تباہ کن سمندری طوفان، بے لگام بادوباراں اور بے قابو سیلاب..... یہ سارے قدرت کے وہ منفی انداز ہیں جو انسانوں کو اکثر بے بسی اور بے چارگی کے جال میں الجھا کر شکوہ شکایت پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ ڈر و خوف قدرت کے وسیلے سے ہمیشہ سے انسانی تہذیب کا ایک اٹل المیہ رہا ہے۔

باتیں نئی، تحریریں نئی

توجہ دیں تعریف کریں

والدین اور اولاد کے درمیان دُوری کی اصل وجہ کیا ہے اور لوگ اکثر مایوسی و پریشانی کا شکار کیوں رہتے ہیں؟

محمد عاطف سلیم

آپ کا ایک دوست جب کسی مجلس میں بات کرتا ہے تو اس کی بات سب سنتے ہیں اور کان کھول کر بیٹھتے ہیں..... مگر جب آپ کسی مجلس میں بات کرتے ہیں تو لوگ اٹھ کر چلے جاتے ہیں..... یا ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ وجہ کیا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ آپ کے پاس علم بھی زیادہ ہو اور اونچی ڈگریاں بھی ہوں تو پھر کیوں آپ کے دوست نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا اور آپ نہ کر سکے۔

آپ عاجز رہے۔

ایک والد گھر میں داخل ہوتا ہے تو اس کے بیٹے اندر سے دوڑ کر آتے ہیں..... خوشی سے ملتے ہیں، مگر دوسرا والد جب گھر میں داخل ہوتا ہے تو اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے اندر سے کوئی نہیں آتا..... نہ اس کی طرف کوئی دیکھتا ہے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں..... ایسا کیوں ہے؟..... کیا دونوں باپ نہیں ہیں؟

اس قسم کی بہت سی مثالیں آپ کو روز دیکھنے کو ملیں گی..... بعض اساتذہ شکوہ کرتے ہیں کہ طلبہ ہماری باتیں توجہ سے نہیں سنتے، ہم سے تعلق نہیں رکھتے..... بہت سے والدین شکایت کرتے ہیں کہ ہمارے بچے ہمارے ساتھ بیٹھ کر باتیں نہیں کرتے، ہمارے ساتھ تبادلہ خیال نہیں کرتے اور اکثر لوگ پریشانی اور مایوسی کا شکار ہیں اور وہ یہ گلہ کرتے پھرتے ہیں کہ لوگ ہم سے محبت نہیں کرتے..... ہمیں نوکری نہیں ملتی، ہم ناکام ہیں، آخر ایسا کیوں؟

اس لیے کہ ہم نے وہ مہارت اور نفسیات کے ان اصولوں کو سیکھا ہی نہیں جن کے ذریعے ہم لوگوں کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کر سکیں اور ان کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لے سکیں۔ آیئے! ہم آپ کو ہمارے رول ماڈل، انسانی تاریخ کے عظیم ترین ماہر نفسیات، سرکارِ دو عالم، خاتم الانبیاء حضور اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ کی روشنی میں ان اصولوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ جن کو ہم اتباع سنت کی نیت

سے اپنا کر اپنی زندگی کو پُر لطف بنا سکتے ہیں..... لوگوں کے دلوں میں گھر کر سکتے ہیں۔

سرورِ کائنات ﷺ انسانی معاملات میں اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ ہر انسان کو یہ احساس دلاتے تھے کہ اس کا مسئلہ خود آپ ﷺ کا مسئلہ ہے اور اس کی پریشانی آپ ﷺ کی پریشانی ہے، اسی طرح اچھی چیزوں اور بہترین صفات و اعمال پر توجہ دیتے تھے اور یہ احساس دلاتے کہ دوسروں کی خوشی خود آپ ﷺ کی خوشی ہے..... دوسروں کو توجہ دیتے اور ان کی تحسین فرماتے تھے۔

جب کوئی شخص نبی علیہ السلام سے مصافحہ کرتا تھا تو آپ ﷺ اس وقت تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے جب تک کہ وہ خود اپنا ہاتھ الگ نہ کر لیتا۔ جب کوئی آپ ﷺ سے بات کرتا تھا تو آپ ﷺ پوری توجہ سے اس کی بات سنتے اور چہرہ مبارک کے ساتھ ساتھ باقی تمام جسم بھی اس کی طرف موڑ لیتے اور خاموش رہ کر اس کی پوری بات سنتے تھے۔

دنیوی زندگی میں ہم بہت سے کام ایسے سرانجام دیتے ہیں جو اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتے بلکہ دوسروں کے لیے ہوتے ہیں۔ مثلاً جب آپ کو کسی شادی کی دعوت پر بلایا جاتا ہے تو آپ اچھا اور خوشنما لباس پہن کر جاتے ہیں۔ یہ اس لیے کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوں اور اس کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کریں۔ جب آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ آپ کے خوشنما لباس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہے ہیں اور تعریف کر رہے ہیں تو آپ خوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح آپ مہمان خانے (بیٹھک) کو خوبصورت بناتے ہیں، اس کو اچھے انداز سے سجاتے ہیں۔ یہ بھی آپ دوسروں کے لیے ہی کرتے ہیں کہ مہمان اچھی جگہ پر بیٹھے اور دیکھ کر خوش ہو جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب کوئی شخص ہمارے لباس یا گھر کی سجاوٹ یا ہمارے کھانے کی تعریف کرتا ہے تو ہمارا دل خوش ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک اصول بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''لوگوں سے ویسے ہی پیش آؤ جیسا تم چاہتے ہو کہ وہ تمھارے ساتھ پیش آئیں۔'' کیسی اچھی نصیحت ہے۔

لہٰذا جب آپ اپنے کسی قریبی دوست کو خوبصورت یا نئے لباس میں ملبوس دیکھیں تو اس کی طرف ضرور توجہ دیں اور تعریف کریں، اچھے جملے استعمال کریں ''ماشاء اللہ! کیسا خوبصورت لباس ہے! آج تو سچ مچ دُولھا لگ رہے ہو!''

اگر کسی دن کوئی شخص آپ سے ملنے آتا ہے، اس کے کپڑوں سے آپ کو عطر کی خوشبو آتی ہے تو آپ اس پر توجہ دیں اور ضرور اس کی تعریف کریں، اس پر اپنے تاثرات ظاہر کریں، کیونکہ اس نے یہ خوشبو آپ کی خاطر لگائی ہے، اس کو بار بار کہیں ''کتنی اچھی خوشبو لگائی ہے! خوشبو کے معاملے میں آپ کا ذوق کتنا اچھا ہے!''

آپ اپنی بہن کے گھر گئے، اس کو دیکھا کہ اپنے بچوں کا خیال رکھتی ہے، ان سے محبت و شفقت سے پیش آتی ہے، تو توجہ دیں، تعریف کریں۔ کسی کی گاڑی میں بیٹھیں، اس کی گاڑی صاف ہو یا نئی ہو تو اس کی تعریف کریں، ڈرائیونگ اچھی کر رہا ہو تو بھی تعریف کریں۔ غرض یہ کہ آپ کو کسی کی چیز اچھی لگی، پسند آئی تو اس پسندیدگی کو باہر نکالیں، خوشی کا اظہار کریں، توجہ

دیں، مگر ہاں! یہ دھیان رکھیں کہ اتنی بھی تعریف نہ کریں کہ وہ سمجھے کہ آپ اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

شاید آپ کہیں کہ یہ تو بڑی عام سی باتیں ہیں..... جی بالکل! یہ معمولی باتیں ہیں مگر ان کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ خاص طور پر جب دوسرے آپ سے ان باتوں کی توقع رکھتے ہیں یا منتظر ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ نے دولھا کو شادی کے ایک ہفتے بعد دیکھا، یا ایک شخص نے بڑی ڈگری حاصل کی یا ایک شخص نئے گھر منتقل ہوا، یہ سب بلاشک آپ کی توجہ و تعریف کے منتظر ہوں گے تو آپ ویسا بن کر دکھائیں جیسا وہ چاہتے ہیں۔

حضور ﷺ اس مہارت کو استعمال فرماتے تھے بلکہ اس سے بھی اچھے اخلاق اور اچھی مہارت رکھتے تھے۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد، ایک مہاجر صحابی حضرت عبدالرحمٰنؓ نے تجارت کے ذریعے کچھ پیسے کمائے اور وہاں ایک انصاری عورت سے شادی کر لی۔ ایک دن وہ حضور ﷺ کے پاس آئے، ظاہر ہے ابھی نئے دولھا تھے۔ بہت اچھی خوشبو لگائی تھی، جیسے ہی آپ ﷺ نے ان کو دیکھا تو ان کی خوشبو اور اچھے لباس کی طرف توجہ فرمائی۔ فرمایا: ''ہاں عبدالرحمانؓ! کیا بات ہے؟'' عبدالرحمانؓ خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ یارسول اللہ ﷺ! میں نے ایک انصاری عورت سے شادی کر لی ہے۔'' رسول اللہ ﷺ حیران ہوئے کہ ابھی ابھی تو انھوں نے ہجرت کی ہے، اتنی جلدی شادی بھی کر لی! فرمایا: ''اس کو مہر میں کیا دیا؟'' انھوں نے کہا کہ ایک گٹھلی برابر سونا دیا ہے۔'' آپ ﷺ نے ان کی خوشی مزید بڑھانے کے لیے فرمایا: ''اب اس خوشی میں ایک دعوت کرو، خواہ ایک بکری ہی کیوں نہ ہو۔'' اور ان

ترانہ جو ملک سے باہر گایا گیا

سید ضمیر جعفری کا لکھا ہوا ترانہ (میرا وطن) پہلی بار بیرون ملک 9 اگست 1947ء کو سنگاپور کی ایک تقریب میں کورس کی صورت میں گایا گیا۔ سنگاپور میں اس وقت پاکستان آرمی کے کوئی سولہ یا سترہ افراد موجود تھے۔

میرا وطن ہے پاکستان
میرا وطن ہے پاکستان
چاندی چاندی جس کے دریا
سونا سونا جس کے صحرا
ذرہ ذرہ دنیا دنیا
موتی موتی ہر میدان
میرا وطن ہے پاکستان
میرا وطن ہے پاکستان
راوی، پدما اور چناب
جہلم سندھ کریں
جس کے ٹیلے بھی شاداب
نیچی گیہوں، نرمل دھان
میرا وطن ہے پاکستان
میرا وطن ہے پاکستان
اونچ نیچ کی بات نہیں ہے
کرودھ کپٹ کی بات نہیں ہے
انسانوں کی ذات نہیں ہے
ایک برابر سب انساں
میرا وطن ہے پاکستان
میرا وطن ہے پاکستان
تند بگولے، تیز ہوائیں
گنی گھٹائیں سجل فضائیں
سادہ بیٹے، سادہ مائیں
امن و سلام کا نشیمان
میرا وطن ہے پاکستان
میرا وطن ہے پاکستان

(انتخاب: عائشہ انعام، لاہور)

کے لیے برکت کی دعا فرمائی۔

حضورﷺ ہر چیز پر توجہ فرماتے حتیٰ کہ ضعیف اور مسکین لوگوں پر بھی اور ان کو ان کی قدر و قیمت کا شعور و احساس دلاتے تھے۔ ان کو محسوس کرواتے کہ آپ ان کی طرف توجہ فرما رہے ہیں اور وہ آپﷺ کے نزدیک اہمیت رکھتے ہیں اور جو بھی آپﷺ کی خدمت کے لیے کام کرتے، چاہے جتنا بھی چھوٹا ہو اس کے کام کی قدر کرتے اور جب کبھی وہ شخص کچھ دن نظر نہ آتا تو آپﷺ اس کا اچھے الفاظ میں ذکر فرماتے تھے۔ ان کے اعمال کی تعریف کر کے دوسروں کو بھی ان کے جیسے کام کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔

مدینہ منورہ میں ایک حبشی عورت تھی جو بڑی نیک اور صالحہ تھی۔ وہ مسجد کی صفائی کرتی تھی۔ آپﷺ اکثر اسے دیکھتے تھے کہ بڑے شوق اور لگن سے اپنے کام میں مصروف ہوتی۔ یہ دیکھ کر اس کی نیکی پر خوش ہوتے تھے۔ کئی دن گزر گئے وہ عورت آپ کو نظر نہ آئی تو آپﷺ نے صحابہ سے دریافت کیا۔ صحابہ نے عرض کیا کہ: یارسول اللہﷺ اس کا تو انتقال ہو گیا۔'' آپﷺ نے فرمایا: ''تم نے مجھے بتایا نہیں، دراصل ان حضرات نے اس کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی..... ان کی نظر میں وہ ایک غریب گمنام عورت تھی، اتنی اہم نہیں تھی کہ اس کے انتقال کی خبر رسول اللہﷺ کو دی جاتی۔ لہٰذا انھوں نے جواب میں اتنا کہا کہ ''اس کا انتقال رات کو ہوا تھا، ہم نے مناسب نہیں سمجھا کہ آپ کو جگایا جائے۔'' آپﷺ کا دل چاہا کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے، کیونکہ اس کا کام اگرچہ لوگوں کی نظر میں بہت معمولی اور حقیر تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اب کیسے نماز جنازہ پڑھی جائے جب کہ وہ دفن بھی کی جا چکی ہے؟ آپ نے فرمایا: ''مجھے اس کی قبر تک لے چلو۔'' صحابہ کرام آپﷺ کو اس کی قبر پر لے آئے۔ آپﷺ نے وہیں اس کی نماز جنازہ پڑھ لی۔ (یہ عام حکم نہیں ہے۔ دفن کے بعد قبر پر نماز پڑھنا، حضورﷺ کی خصوصیت تھی)۔ پھر آپﷺ نے فرمایا: ''ان قبروں میں مرحومین پر اندھیرا چھایا رہتا ہے، پھر جب میں ان کی نماز جنازہ پڑھ کر دعا کر لیتا ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو منور فرما دیتا ہے۔

ذرا غور کیجیے..... جن لوگوں نے دیکھا ہو گا کہ آپﷺ نے ایک ضعیف عورت کے اتنے معمولی کام کو اتنی اہمیت دی ہے تو ان کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوا ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے دل میں بھی ایسے یا اس سے بڑے نیکی کے کام کرنے کا جوش و جذبہ پیدا ہوا ہو گا۔

آخر میں آپ کے کان میں ایک بات کہوں؟ دراصل ہم لوگ ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں اکثر ایسے امور (مہارت اور نفسیاتی اصول) کا خیال نہیں رکھا جاتا اور انسانی تعلقات میں دوسروں کے احساسات کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اچھی چیزوں پر توجہ نہیں دی جاتی، تعریف نہیں کی جاتی۔ لہٰذا آپ اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ کا جوش و جذبہ اس وقت ٹھنڈا نہ پڑ جائے جب آپ معاشرے کے بعض روکھے اور سخت مزاج لوگوں کو دیکھیں کہ آپ نے ان کی کسی بات یا کسی چیز پر توجہ دی اور تعریف کی، لیکن ان پر اس تعریف کا کوئی اثر نہیں ہوا الٹا کچھ کڑوے کسیلے الفاظ میں جواب ملا..... اور ایسے لہجے میں بات کی جس سے آپ کو پریشانی ہو تو آپ ان کی وجہ سے اپنی اچھی مہارت کو ختم نہ کر دینا۔

■■■

باتیں نئی، تحریریں نئی

چھوٹا سا سفر

ایک بے روزگار نوجوان کے ارمانوں کا قصہ
وہ اپنے آپ سے بہت شرمندہ تھا

محمد قاسم رضا

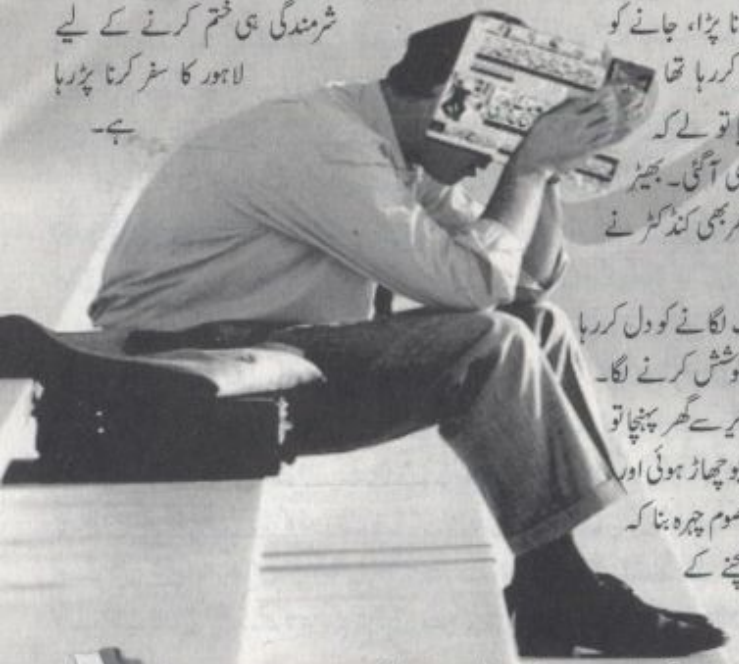

فکر معاش میں لاہور کے لیے نکلا تو ڈیڑھ دو گھنٹے گاڑی کا انتظار کرنا پڑا، جانے کو پہلے ہی دل نہیں کر رہا تھا گاڑی نہ ملنے کا بہانہ ہاتھ آیا تو لے کہ واپس آنے ہی لگا تھا کہ گاڑی آ گئی۔ بھیڑ بہت تھی اور سیٹ ایک ہی، پھر بھی کنڈکٹر نے مجھے ہی بٹھایا۔

چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانے کو دل کر رہا تھا۔ اب دل کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی کل ہی کی بات تھی جب دیر سے گھر پہنچا تو سب پریشان تھے، سوالوں کی بوچھاڑ ہوئی اور نصیحتوں کا انبار لگ گیا، پھر معصوم چہرہ بنا کہ معذرت کرنا پڑی، ابو سے بچنے کے بعد ماں کے آنسو پونچھے، آپی سے مذاق کرتے ہوئے بھابھی سے کھانے کا پوچھا۔ اب آپی کہنے لگیں دیر ہو جائے تو کم از کم بتا ہی دیا کرو آج کل حالات اتنے خراب ہیں اور تم گئے بھی موٹر سائیکل پہ تھے۔ اب میری باری تھی اچھا آپ موٹر سائیکل کی وجہ سے اتنے پریشان تھے۔ لیکن آج میں نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ کبھی ماں کو پریشان نہیں کرنا ان کے لیے یہ پریشانی کیا کم ہے کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔

میری عمر کے کافی لوگ کامیاب ہو چکے ہیں۔ 20 سال کا ایک لڑکا اولیول ٹاپ کر کے پوری دنیا میں مشہور ہو چکا، کئی دوست بیرون ملک جا کے لاکھوں روپے گھر بھیج رہے ہیں، رحمت نے پڑھائی کے اخراجات بھی خود پورے کیے اور اب گھر کی ذمہ داریاں بھی نبھا رہا ہے۔ میرے سامنے ایسی کئی مثالیں ہیں لیکن جب میں خود پر نظر دوڑاتا تو شرمندہ ہو جاتا اور آج یہ شرمندگی ہی ختم کرنے کے لیے لاہور کا سفر کرنا پڑ رہا ہے۔

لو جی دل باتوں میں آگیا اور ساتھ ہی سی این جی اسٹیشن بھی آگیا۔

گاڑی لائن میں اور مسافر لان میں۔ صرف ایک گھنٹے میں گیس مل گئی اور پھر سدابہار زیر تعمیر سڑک پر سفر کرتے ہوئے لاہور پہنچ گئے۔ 10 سال کا تھا تب بھی یہ سڑک بن رہی تھی اب 24 سال کا ہوں اب بھی یہ بن رہی ہے۔ دادا جان میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی دنیا سے کوچ کر گئے تھے ورنہ مجھے پتا ہوتا کہ جب وہ 10 سال کے تھے تب بھی سڑک بن رہی تھی۔

میٹرو میں بیٹھا تو ساری پریشانیاں ہی بھول گئیں، ہم تو رکشوں میں سوار ہونے والے لوگ تھے اور اب اتنی بہترین سواری مل گئی۔ پچھلے سال یونیورسٹی کی طرف سے ہینڈبال کھیلنے آئے تو 12 کھلاڑی ایک ہی رکشے میں گھس کے گراؤنڈ پہنچے تھے اور اب دھول، دھوئیں اور دھکم پیل کے بغیر سفر کرتے ہوئے عجیب سا لگ رہا تھا میٹرو نے تو عوام کو لائن بنانا بھی سکھا دیا۔

ہمیشہ کی طرح انٹرویو کے لیے دیر سے پہنچا، 4 بجے اندر بلایا گیا اور چار بج کے تین منٹ پہ باہر۔ ہر بار کی طرح دوبارہ کا کہہ کر فارغ۔

سستی پھر آڑے آئی اور بلاوجہ یہیں رکنے کا سوچا۔ حافظ عثمان نوکری کے چکر میں ادھر ہی کہیں ہاسٹل میں مقیم تھا۔ سو رکشہ پکڑا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ پہلے ہی تھکا ہوا اوپر سے اس نے جناح باغ کے چکر لگوا کر اور بُرا حال کر دیا، گاؤں کے باغ میں امرود ہوتے ہیں لیکن ادھر گھاس ہی گھاس اور بہت سے لوگ، سب فارغ بیٹھے تھے کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔ انھیں دیکھ کے دل کو تسلی ہوئی کہ چلو میں کون سا اکیلا ہی فارغ ہوں۔

یونیورسٹی میں تھے تو کھانا کھا کے پیسے سب مل کر دیتے۔ حافظ عثمان حساب کا بڑا پکا تھا اسے ایک روپیہ بھی کم ملتا تو لے کر ہی جان چھوڑتا۔ ڈرتے ڈرتے اس سے کھانا کھایا کہ کہیں حساب کرنے نہ بیٹھ جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور ہم نماز پڑھ کر ریس کورس چلے گئے۔

ریس کورس اور گاؤں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ یہاں تالاب میں کشتیاں چلتی ہیں اور وہاں بھینسیں اور بطخیں۔ یہاں لوگ فضول ہی بیٹھے تھے لیکن وہاں کوئی فارغ نہیں ہوتا بلکہ تاش کھیلتے ہیں۔ ادھر ورزش کے لیے دوڑ رہے تھے اُدھر گاؤں میں کتے کے خوف سے دوڑنا پڑتا ہے۔ یہاں ایک ایک گھوڑے پہ ایک ایک آدمی سوار ہو کر کھیل رہا تھا، گاؤں میں گھوڑے کے پیچھے تانگہ ڈال لیتے ہیں اور مل جل کر سفر کرتے ہیں، سچ ہی سنا تھا کہ شہر کے لوگوں میں اتفاق نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ کھانا ہضم کرنے کے لیے دوڑ رہے تھے اور کچھ روزی روٹی کمانے کے چکر میں نمکو، بسکٹ، چپس بیچنے کے لیے دوڑ رہے تھے تاکہ وہ بھی کھانا کھا سکیں۔

حافظ عثمان اِدھر اُدھر کی سناتا رہا اور میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، یونہی شام ہوگئی۔ مغرب کے بعد آئس کریم کھانے مال روڈ چلے گئے۔ وہاں تو جیسے ساری دنیا ہی آئس کریم کھانے آگئی تھی اتنا رش تو گاؤں میں دودھ کی سبیل پہ بھی نہیں ہوتا۔ خیر آئس کریم کھائی اور وہیں بیٹھے بیٹھے بار بار کھائی۔ عشاء کے لیے سامنے ہی مسجد الشہدا چلے گئے، نام سنا سنا سا لگا تو مسجد کے باہر لگے

ہوئے کتابوں کے سٹال سے مسجد کی تاریخ کے متعلق کوئی کتاب ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہاں صرف فرقہ واریت اور اختلافی امور پر ہی کتابوں کے ڈھیر نظر آئے۔

اب پیدل مارچ بلکہ لانگ مارچ شروع کیا اور پنجاب اسمبلی، واپڈا ہاؤس، الحمرا ہال اور گورنر ہاؤس کے ویرانے میں کھڑے دیو قامت درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے، جی۔او۔ آر کے ساتھ اندھیری گلیوں میں داخل ہوگئے۔ پھر کوئی گھنٹہ ڈیڑھ پیدل چلنا پڑا اور ہاسٹل پہنچ گئے۔ بڑی حیرانی ہوئی کہ راستے میں نہ کسی نے موبائل چھینا اور نہ ہی کسی نے پستول دکھا کر بٹوہ مانگا۔ اب عثمان نے ساری رات پڑھنا تھا اور میری جلدی سونے کی عادت نے چادر اوڑھا کے مجھے سلا دیا۔ صبح آنکھ کھلی تو عثمان سو رہا تھا۔ سوتے سے ہی اجازت لی اور، ایچ۔ای۔سی کے دفتر کی طرف چل نکلا۔ 2 گھنٹے کی خواری کے بعد دفتر پہنچا تو پتا چلا کہ ادھر تو ہفتے کی چھٹی ہے۔

لاہور آنے پر شہر بانو سے ملنے کا وعدہ تھا۔ اب اس کے ہاسٹل پہنچ گیا۔ سوچا تھا لڑکیوں کا ہاسٹل ہے اور وہ بھی سرکاری۔ خوب پوچھ گچھ ہوگی، بڑی مونچھوں اور کالی وردی والا کوئی بابا تو ضرور دروازے پہ ہوگا لیکن وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ البتہ داخلی دروازے کے ساتھ ہی ایک بڑی بی شیمپو، کریم، پاؤڈر، سُرخی اور اس طرح کی دوسری اشیاء کی دکان سجائے بیٹھی تھی، اس نے اپنے ادھ بُنے سویٹر سے ادھ کھلی آنکھ اٹھا کے دیکھا تو مجھے جاسوسی ناول کا وہ کردار یاد آگیا جو مجرم پکڑنے کے لیے بھیس بدل کر لوگوں کے دروازوں پر بیٹھتا تھا۔ لیکن بڑی بی نے کچھ نہیں کہا اور میں ہال میں لگے چارپائی نما صوفے پہ بیٹھ گیا۔

دوسرے دروازے سے مُٹھیاں اور ہاتھ بھینچے ایک گول مٹول سی لڑکی پوری رفتار سے اس طرف آئی، کچھ ہی دیر بعد یہ جاپانی گڑیا میرے پاس بیٹھی آنکھیں جھپک جھپک کے سر ہلانے لگی۔

یہ موم کی گڑیا شہر بانو ہے، اس کے پاس ہر سوال کا جواب سوال میں ہی موجود ہوتا ہے۔ آپ کوئی بات کریں یہ مسلسل سر ہلاتی جائے گی، اچانک خاموش ہو جائیں تو اس کا سر ہلتا ہی رہے گا جیسے کلاک کا پینڈولم۔

اگر یہ آپ کی بات سے متفق نہیں تو جی جی کی آواز آتی رہے گی اور اگر اسے موضوع پسند ہے تو آپ کون ہوتے ہیں بولنے والے۔

ڈاکٹر بننا اس کا شوق ہے جو پورا نہیں ہوا اور نرس بننا اس کی مجبوری کیونکہ وہ ماں کا شوق ہے۔

اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ چشمہ پہن کر جوان لگتی ہے اور اتار دے تو اپنی ہی دادی بن جاتی ہے۔ اب یہ چشمے کے پیچھے سے مجھے دیکھ رہی ہے اور میں آنے جانے والوں کو۔

ہاسٹل میں اونچی آواز میں میوزک چل رہا تھا۔ میوزک کی آواز سُنی تو مجھے شعیب کا ہاسٹل یاد آگیا جس میں کمرے کباڑ خانے بنے ہوئے تھے، کتابیں ردی کی طرح بکھری ہوتیں، بستر ایسے پڑے ہوتے جیسے پھینکے ہوئے ہوں، جوتے ڈھیر کی صورت ہوتے جیسے چوری کے ہیں، تولیہ تو اتنا گندا ہوتا کہ اس سے ہاتھ صاف کر کے پھر دھونے کے قابل ہو جاتے۔ کمپیوٹر کے ساتھ ہر قسم کی فلمیں ہوتیں اور ہر وقت اونچی آواز میں میوزک چلتا رہتا۔

یوں وہاں بیٹھے بیٹھے ہی ہاسٹل کا اندرونی منظر بھی نظروں میں گھوم گیا۔ اب اسے کلاس میں جانا تھا اور مجھے گھر۔ پھر وہ گیٹ تک چھوڑنے آئی کہ کہیں پھر نہ آجاؤں۔

اب میٹرو اسٹیشن پہ بڑا دلچسپ منظر تھا، دو ماں بیٹیاں برقی سیڑھیاں چڑھنے سے گھبرا رہی تھیں۔ بیٹی ماں کو آگے کرتی اور ماں دوپٹا منہ میں دبا کے ایک دم پیچھے ہوجاتی پھر بیٹی ہلکا سا شرما کر آگے آتی اور یوں گھوم جاتی جیسے آگے کوئی گہرا گڑھا ہے۔

میٹرو میں بیٹھا تو خوب محفل جمی تھی۔ لوگ رکشوں کے شور اور میٹرو کے سکون پہ خوب دلائل پیش کر رہے تھے جیسے یونیورسٹی کا مباحثہ ہے اور جیتنے پہ انعام لے کے جانا ہے۔ ایک صاحب ساتھ بیٹھے لاہور کے اہم مقامات دکھا رہے تھے، وہ دیکھو میانی صاحب قبرستان، اور لوگ اُسے دیکھنے لگتے وہ پھر باہر کی طرف اشارہ کرتا اور کہتا یہ ایشیا کا سب سے بڑا قبرستان ہے۔ (اگر خود کش حملوں میں مرنے والے بھی یہیں دفن کیے جاتے تو یہ دنیا کا سب سے بڑا قبرستان ہوتا) یہ ایشیا کا سب سے بڑا پُل ہے جس پہ گاڑی چل رہی ہے اور دنیا کا سب سے بڑا موڑ بھی پاکستان میں ہے۔ ایک اور بھائی صاحب بولے دنیا کا سب سے بڑا چور بھی تو پاکستان میں ہے۔ اب گاڑی میں قہقہے گونجنے لگے لیکن ایک صاحب جذباتی ہوگئے اور انھوں نے پوری تقریر ہی کر ڈالی۔

ہم غریب عوام ہیں اور صرف غریب ہی نہیں بیوقوف بھی ہیں۔ ہر کوئی ہمیں سبز باغ دکھا کر اپنا کام نکالتا ہے اور غائب۔ جن کو ہم محنت کش اپنا ووٹ دے کر چوہدری بناتے ہیں وہی لوگ ہمیں لوٹ کھاتے ہیں۔ ہم اپنے حالات کے خود ذمہ دار ہیں ہمیشہ ذات برادری، رکھ رکھاؤ اور ذاتی تعلقات کو تو ووٹ دیتے ہیں ہم۔ ہم خود ہی ایسے لوگوں کو منتخب کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں فلاں چور ہے۔ برگر، پیزا کھانے والے کو کیا پتا کہ کرایہ پانچ روپے بڑھ جائے تو غریب کو کتنا پیدل چلنا پڑتا ہے۔ چوروں سے تو تبھی جان چھوٹے گی جب ہم خود بدلیں گے اپنے آپ کو بدلیں گے اپنی سوچ میں تبدیلی لائیں گے۔

یہ صاحب یونہی تقریر کرتے رہے اور گاڑی شاہدرہ اسٹیشن پہ خالی ہوگئی۔

عوام پھر عوامی سواریاں ڈھونڈنے لگے۔ کچھ رکشوں پہ بیٹھے کچھ پیدل ہی اپنی منزل کو چلے اور ہم جیسے سڑک پہ کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے لگے۔ ایک دودھ لدی بس نے مجھے بھی اپنا ہم سفر بنالیا اور پچھلی سیٹوں پہ بیٹھے دُنبوں کے پاس کھڑے ہونے کو جگہ مل گئی۔ بس میں مسافروں کو جگانے کے لیے بڑا بہترین انتظام تھا، وقتاً فوقتاً چھت سے دودھ کے قطرے آتے اور سوئے ہوئے مسافروں کے سروں سے ہوتے ہوئے رخسار چھو کر، گردن پہ رینگتے ہوئے پیٹ پہ جا رکتے اور مسافر سوتے سوتے ہی ہنسنے لگتے جیسے انھیں کوئی گدگدی کر رہا ہو یا کوئی جنتی حور ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی ہو۔ لیکن جیسے ہی کہیں بس جھٹکے سے رکتی تو یہ خود کو پُل صراط سے گرتا ہوا محسوس کرتے اور ہڑ بڑا کہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔

بس کامونکی پہنچی تو سڑک بند تھی، کچھ لوگ ہاتھوں میں بینر اور ڈنڈے پکڑے انقلاب برپا کرنے آئے تھے۔ پتا نہیں کون سا انقلاب ہے جو یوں بیچارے مجبور عوام کو سڑکوں پہ روک کر آئے گا؟

رحمٰن کیانی

اے قوم کہ صدیوں سے مائل بہ تنزل ہے
یا محوِ تعیّش ہے، یا وقفِ تعطّل ہے
گم کردۂ جادہ ہے، بیگانۂ منزل ہے
اک ناقۂ آوارہ بے لیلیٰ و محمل ہے
واقف نہیں یوسف سے تو ایسی زلیخا ہے
فرہاد تو ہے لیکن شیریں ہے نہ تیشہ ہے
امروز سمجھتی ہے فردا کا تماشا ہے
اک خوابِ گراں یکسر تیرے لئے فردا ہے
ماضی بعید اپنے سینے سے لگائے ہے
اور دور اندھیروں پر نظروں کو جمائے ہے
اس آس میں شاید پھر نالوں کا جواب آئے
پھر کوئی حجاب اُٹھے، پھر کوئی خطاب آئے
"ترسم کہ تو می رانی زُورق بہ سراب اندر
زادی بہ حجاب اندر، میری بہ حجاب اندر"
(مجھے ڈر ہے کہ تو اپنی کشتی سراب میں کھے رہا ہے۔
تو پردے میں پیدا ہوا، اور پردے میں مرگیا۔)

شاہد مری باتوں کا یہ گنبدِ مینائی
اے صیدِ ملوکیت! اے کُشتۂ مُلّائی!
ملکوں میں تجھے بانٹا اربابِ سیاست نے
فرقوں میں فقیہوں نے، پیرانِ طریقت نے
قبل اس کے چلن تیرا اللہ پرستی تھی
تو قیصرو کسریٰ کے تختوں کو اُلٹتی تھی
اب شیعہ و سنّی ہے اور مصری و شامی ہے
صدیوں سے ترا شیوہ بندوں کی غلامی ہے
اے کاش کہ قرآں کو پڑھ لیتی، سمجھ لیتی
تو اپنا کھرا کھوٹا خود آپ پرکھ لیتی
قرآں سے میرا مطلب تفسیر نہیں کوئی
افراد کی من مانی تعبیر نہیں کوئی
"گر سُرمۂ رازی را از دیدہ فروشوئی
تقدیرِ اُمم بینی پنہاں بہ کتاب اندر"
(اگر رازی کے سُرمے سے اپنی آنکھوں کو دھولے تو
قوموں کی تقدیر کتاب میں پوشیدہ پائے گا)

اے رہبرِ فرزانہ! قرآن سے بیگانہ
صہبائے خودی سے ہے خالی ترا پیمانہ
"سرمایے" کو یہ مانا پڑھتا ہے سمجھتا ہے
سایوں کے تعاقب میں ہر آن بھٹکتا ہے
یہ روس کی دوشیزہ، وہ دُخترِ امریکا
یہ بُلبلِ بے نغمہ، وہ آہوئے بے نافہ
لادینی و لاطینی، کس پیچ میں الجھا تُو
دارو ہے ضعیفوں کا لا غالب اِلّا ھُو
آوارۂ آب و گِل، پا لے جو مقامِ دل
کوزے میں سمٹ آئے یہ قلزمِ بے ساحل
اک رُودِ رواں ہے تُو، چل جانبِ دریا چل
تو مردِ مسلماں ہے، چل جانبِ بطحا چل

"با مغربیاں بودی، کم جُستی و کم دیدی
مردے کہ مقاماتش ناید بحساب اندر"

(تو اہل مغرب کے ساتھ رہا۔ تو نے کم تلاش کیا، کم دیکھا، وہ مرد جس کے مقامات حساب کے اندر نہیں آتے۔)

اے صدر نشیں واعظ! اے حلقہ نشیں صوفی!
بے جذبۂ صدیقی، بے شوکتِ فاروقی
بے دولتِ عثمانی، بے تیغ یدِ اللہی
ہو کارِ جہاں کوئی سالوسی و رُوباہی
پرواز سے عاجز ہیں طاؤسِ دبستانی
حاکم ہیں فضاؤں کے شہبازِ بیابانی
تاویل کے پھندوں سے، تدریس کے دھندوں سے
چلّوں سے وظیفوں سے، تعویذ سے گنڈوں سے
قوموں کی زمانے میں تقدیر نہیں بنتی
بے تیغ مسلماں کی تصویر نہیں بنتی
ہیں بدر و اُحد شامل سیرت میں محمدؐ کی
ہونا ہے اگر کامل اُلفت میں محمدؐ کی

"بے دردِ جہانگیری آں قُرب میسّر نیست
گلشن بگریباں کش اے بُو بہ گلاب اندر"

(جہانگیری درد کے بغیر یہ قرب میسر نہیں آتا تو وہ بو ہے جو گلاب کے اندر ہے، (تجھے چاہیے) کہ باغ کو اپنے گریباں میں کھینچ لائے۔)

رُومی ہوں نہ رازی ہوں، سعدی نہ غزالی ہوں
بیدل ہوں نہ غالب ہوں، اقبال نہ حالی ہوں
انسان ہوں، ناطق ہوں، شاعر نہ غزلخواں ہوں
اک قاریٔ قرآں ہوں، اک مردِ مسلماں ہوں

فیضانِ محمدؐ سے واقف بھی ہوں بیش و کم
دائم نہیں حادث ہے یہ محفلِ دو عالم
کونین کسی کُل سے اجزا کی جدائی ہے
افراد سے ملت ہے، بندوں سے خدائی ہے
غنچے سے یہ گلشن ہے، خوشے سے یہ خرمن ہے
تنکے سے نشیمن ہے، ذرّے سے یہ درپن ہے
جو دیکھ کے درپن بھی اپنے کو نہ پہچانا
دیوانے کو کیا کہیے دیوانہ تو دیوانہ

"اے زاہدِ ظاہر بیں گیرم کہ خودی فانیست
لیکن تو نمی بینی طوفاں بحباب اندر"

(اے ظاہر بیں زاہد! میں جانتا ہوں کہ خودی فانی ہے۔ لیکن بلبلے میں جو طوفان پوشیدہ ہے اس کو تو نہیں دیکھ سکتا۔)

رحمٰن کیانی پر الزام یہ آتا ہے
اقبال کی نظموں سے کچھ شعر چُراتا ہے
کچھ ان میں گھٹاتا ہے کچھ ان میں بڑھاتا ہے
پھر اپنی کہی کہہ کر محفل میں سناتا ہے
اس بات کو یوں بھی تو اربابِ نظر سمجھیں
بیٹے کے تصرّف میں میراثِ پدر سمجھیں

آں قلب و نظر دارم، آں سوزِ جگر دارم
شمشیرِ پدر خواہم بازوئے پدر دارم
لرزم نہ گہے ترسم، می خندم و می رقصم
دانم کہ نمی داند در نالۂ شب گیرم

"ایں صوت دلآویزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجور چناں حُورے نالد بہ رباب اندر"

(یہ دلآویز آواز مطرب کے مضراب سے نہیں آرہی بلکہ یہ تو رباب کے اندر پوشیدہ حور ہے جو جنت کی جُدائی میں رو رہی ہے۔)

(انتخاب: کلیم اللہ فاروقی)

پاکستان کے حوالے سے تازہ ترین سنسنی خیز کتاب "تباہی سے بچاؤ"

Avoiding ARMAGEDDON

امریکی مصنف بروس رائیڈل کے انکشافات ☆ جب کلنٹن بھارتی وزیراعظم کو سن نہ پائے ☆ نکسن نے کہا میں پاکستان کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں ☆ اوباما کو ہالبروک پر اعتماد نہ تھا ☆ دلچسپ حقائق سے پردہ اٹھاتی کتاب Avoiding Armageddon پر ایک نظر

عمیر محمود

اپریل

1988ء کی دس تاریخ کو راولپنڈی اسلام آباد میں ایک آفت آگئی۔ راولپنڈی کا اوجھڑی کیمپ دھماکے سے تباہ ہوگیا۔ اس میں رکھا گیا ہزاروں ٹن اسلحہ اور گولہ بارود پھٹ گیا۔ راکٹ اڑ کر شہر کے مختلف علاقوں میں گرتے رہے اور آناً فاناً سیکڑوں افراد لقمہ اجل بن گئے۔

ان دنوں افغان جنگ عروج پر تھی۔ امریکا سے اسلحہ دھڑا دھڑ پاکستان آرہا تھا اور یہ اسلحہ اوجھڑی کیمپ اسلحہ ڈپو میں بھی رکھا جاتا تھا۔ تباہی کی وجوہ معلوم نہ ہو سکیں۔ اس کا الزام افغانستان اور روس کی خفیہ ایجنسیوں پر لگتا رہا، ملک دشمن حلقوں کی جانب سے یہ الزام بھی لگایا جاتا رہا کہ اسلحے کی ترسیل وغیرہ میں خرد برد کی گئی اور پھر احتساب کے خوف سے خود ہی یہ اسلحہ تباہ کردیا گیا۔

بروس رائیڈل کی کتاب Avoiding Armageddon نے آخر اس راز سے پردہ اٹھادیا۔

سانحہ اوجھڑی کیمپ

کتاب کے مصنف کو 2012ء میں بھارت کے دو سابق افسران نے بتایا کہ اوجھڑی کیمپ دھماکا بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی "را" نے کرایا۔ ان افسروں کے بقول پاکستان ان دنوں کشمیری اور سکھ حریت پسندوں کی حمایت کر رہا تھا، جس پر پاکستان کو "سزا" دینے کا منصوبہ بنایا گیا۔

تباہی سے بچاؤ، یعنی Avoiding Armageddon کے سرورق پر بھارت اور پاکستان کے دو فوجی دکھائے گئے ہیں، جو واہگہ بارڈر پر پریڈ کرتے ہوئے ایک دوسرے کو خون آشام نظروں سے گھور رہے ہیں۔ یہ کتاب بھی پاکستان بھارت اور امریکا کے تعلقات پر لکھی گئی ہے۔ پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ مصنف کا زیادہ جھکاؤ بھارت کی طرف ہے یا پھر شاید ہم ہی بھارت کے بارے میں لکھی گئی ہر بات کو تعصب کی

عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ کتاب کا آغاز ہی بھارت میں ہوئے ممبئی حملوں سے ہوتا ہے اور مصنف بھارتی راگ الاپتے ہوئے ہر چیز کا ذمہ دار پاکستانی خفیہ ادارے آئی ایس آئی کو قرار دیتا چلا جاتا ہے۔ بہرحال، تمام تر بحث اور دشنام طرازی کے آخر میں مصنف بھی اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ممبئی میں دہشت گردی کا مقصد بھارت یا پاکستان کو نقصان پہنچانے سے زیادہ، امن کے عمل کو نقصان پہنچانا تھا۔

اس کے باوجود پاکستان اور بھارت میں معاملات کو تیسرے امریکی فریق نے کیسے دیکھا، یا دیکھ رہا ہے، کتاب کے مطالعے نے معلومات میں اضافہ کیا۔

امریکا کی مجبوری ہے، بھارت بہت ضروری ہے

بروس رائیڈل نے کتاب میں امریکی مجبوری کا اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ امریکا نے پاکستان کے ساتھ دوستی اس لیے رکھی کہ روس کو کنٹرول کرنا مقصود تھا۔ پاکستان نے امریکا سے دوستی اس لیے رکھی کہ وہ بھارت کو کنٹرول کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بھارت ایسے جمہوری اور بڑے ملک کو نظر انداز کرنا بھی امریکا کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے تمام امریکی صدور اسی کوشش میں رہے کہ پاکستان بھی خوش رہے اور بھارت بھی ناراض نہ ہو۔

پاکستان کی سادگی امریکا کو بھی پسند

تعلقات کے آغاز میں پاکستان اور امریکا کی خوب نبھنے لگی۔ 1954ء میں ایوب خان نے بطور آرمی چیف امریکا کا دورہ کیا اور صدر آئزن ہاور پر بہت خوش گوار تاثر چھوڑا۔ انہی دنوں پاکستان کی فوجی امداد کا معاملہ بھی درپیش ہوا، تو نائب صدر رچرڈ نکسن کہنے لگے، ”میں پاکستان کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ پاکستان کے لوگ بھارتیوں کی طرح پیچیدہ نہیں ہیں۔“

ایک کہانی بڑی پرانی

امریکا کے لیے پاکستانی تعاون کی کہانی کوئی نئی نہیں۔ ملاحظہ کیجیے، مصنف 1958ء کا ذکر کر رہا ہے، ”پاکستان بڑے پیمانے پر امریکی خفیہ کارروائیوں کے لیے ایک مرکز بن گیا۔ پاکستانی اور امریکی خفیہ اداروں کے درمیان روابط مضبوط بنانے کے لیے سی آئی اے ڈائریکٹر ایلن ڈلس اور پاکستانی آرمی چیف ایوب خان نے مشترکہ کاوشیں کیں۔ 1958ء کے وسط میں امریکا کے لیے ایک خفیہ مرکز قائم کیا گیا۔ امریکی خفیہ طیارہ یوٹو پشاور کے قریب ایک ایئر بیس سے پرواز بھرتا اور روس کی جاسوسی کرتا۔ روس اور چین کی جاسوسی کے لیے پشاور کے قریب بڈھ بیر میں مرکز قائم کیا گیا۔ پاکستان امریکا کا اہم اتحادی اور ایوب خان اہم دوست بن گیا۔ 1960ء میں روس نے امریکی یوٹو طیارہ مار گرایا جس سے سارا خفیہ مشن منظر عام پر آ گیا۔ اس کے باوجود پاکستان امریکا کا اہم اتحادی رہا۔“

تب بھی ڈومور کا مطالبہ

بروس رائیڈل لکھتا ہے کہ امریکی صدر کینیڈی اپنے آخری دنوں میں پاکستان اور ایوب خان سے متنفر رہنے لگا۔ اپنی قومی سلامتی کی کمیٹی سے ایک میٹنگ میں صدر کینیڈی نے پوچھا، ”ہمیں پاکستان سے کیا ملتا ہے؟ ہماری مدد کے بدلے پاکستان ہمارے لیے کرتا کیا ہے؟“

امریکا روس پر جوہری حملہ کرنا چاہتا تھا

چین اور بھارت میں حدود کا تنازع ہے۔

1962ء میں چین نے بھارت پر حملہ کیا اور کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں بھارت نے امریکا سے مدد مانگی لیکن امریکا گومگو کی کیفیت میں رہا۔ آخر میں چین نے خود ہی جنگ بندی کر دی، لیکن بھارت کو بہت ہزیمت اٹھانا پڑی۔

اس موقع پر امریکی صدر کینیڈی نے 1963ء میں اپنے مشیروں سے ملاقات کی اور اس بات پر غور کیا کہ چین اگر بھارت پر حملہ کرتا ہے تو امریکی ردعمل کیا ہو؟ خفیہ ریکارڈنگ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے وزیر دفاع نے صدر کو مشورہ دیا، ”اگر ہمیں چینی حملے کی صورت بھارت کی حفاظت کرنی ہے، تو ہمیں جوہری ہتھیاروں کا استعمال کرنا ہوگا۔“

دکھاوے کے لیے ہی سہی، چند فوجی بھیج دو

امریکا کو ویت نام جنگ کا سامنا تھا۔ اس وقت کے امریکی صدر لنڈن جانسن نے پاکستانی ہم منصب سے کہا کہ دکھاوے کے لیے ہی سہی، چند پاکستانی فوجی ضرور ویت نام بھیجے جائیں۔ لیکن ایوب خان نے یہ درخواست رد کر دی۔ امریکا کی جانب سے متعدد بار یہ درخواست کی گئی، یہاں تک کہ امریکی صدر 1967ء میں مختصر وقت کے لیے کراچی آئے تو ایوب خان کے روبرو یہ درخواست پھر کی، لیکن پاکستان نے اپنے فوجی ویت نام بھیجنے سے انکار کر دیا۔

امریکی صدر پاکستان کے حامی، بیوروکریسی مخالف

1971ء کی پاک بھارت جنگ میں امریکی صدر رچرڈ نکسن نے اپنے وزیر خارجہ ہنری کسنجر کو حکم دیا کہ پاکستان کی مدد کی جائے۔ ہنری کسنجر نے یہ حکم بیوروکریسی تک پہنچایا تو وہاں سے شدید مخالفت آئی۔ یہ صورتحال اشتعال کی حد تک پہنچ گئی۔ قومی سلامتی کونسل کی ایک میٹنگ میں ہنری کسنجر پھٹ پڑا، ”صدر مجھے کہتے ہیں پاکستان کی جانب جھکاؤ رکھا جائے، لیکن بیوروکریسی کی جانب سے جو بھی تجویز آتی ہے وہ اس کے مخالف ہوتی ہے، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں پاگل خانے میں رہ رہا ہوں۔“

چین سے بات کرا دو، لیکن کسی کو پتا نہ چلے

1969ء میں رچرڈ نکسن نے پاکستان کا دورہ کیا اور پاکستانی ہم منصب یحییٰ خان سے منفرد درخواست کی۔ نکسن نے کہا کہ پاکستانی صدر ان کی چین سے بات چیت شروع کرائیں، لیکن کسی کو پتا نہ چلے۔ یہاں تک کہ امریکی سفارت خانے اور دفتر خارجہ کو بھی اس کا علم نہیں ہونا چاہیے۔

یحییٰ خان نے پیغام تو پہنچا دیا تاہم چین کو کوئی جلدی نہ تھی، اس نے 1970ء میں امریکی خواہش کا مثبت جواب دیا اور 1971ء میں ہنری کسنجر کو ملاقات کی دعوت دی۔

کسنجر نے خفیہ دورہ کیسے کیا؟

ہنری کسنجر پاکستان کے دورے پر آئے، صدر یحییٰ کے ہمراہ عشائیے کے بعد انہوں نے اپنے سٹاف کو بتایا کہ وہ بیمار ہیں اور کچھ دن آرام کریں گے۔ اس دوران وہ ایک دن کے لیے چین کے خفیہ دورے پر گئے، چینی قیادت سے ملاقات کی اور واپس آ گئے۔ ان کے اس دورے کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

چند دنوں بعد امریکی صدر نکسن نے اپنے عوام کو بتایا کہ امریکا اور چین کے تعلقات میں بریک تھرو کے لیے وہ چین کا دورہ کریں گے۔ ہنری کسنجر نے چینی

قیادت کو قائل کر لیا تھا۔

نکسن، یحییٰ کے شکر گزار

رچرڈ نکسن نے چین سے تعلقات کے لیے مدد کرنے پر پاکستانی صدر یحییٰ کا ان الفاظ میں شکریہ ادا کیا، ''جو افراد اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک پُرامن دنیا دیکھنا چاہتے ہیں، وہ ہمیشہ آپ کے مقروض رہیں گے۔''

بھارتی جرنیل کی سخت کلامی

امریکی قومی سلامتی کونسل کے نائب مشیر رابرٹ گیٹس کی بھارتی فوج کے سربراہ جنرل سنتھ فرانسس راڈریگز سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بھارتی جرنیل کو قائل کرنا چاہا کہ بھارت جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط کرے اور اپنا جوہری پروگرام پرامن رکھے۔ بھارتی جرنیل نے دفعتاً رابرٹ گیٹس کو بولنے سے روک دیا اور آگے جھکتے ہوئے کہا، ''ہمیں امریکا کی جانب سے بار بار ایک ہی بات کیوں کہی جاتی ہے؟ امریکا ہماری جوہری صلاحیت پر تو قدغن لگاتا ہے، لیکن اگر کسی ملک نے اپنے دشمن پر جوہری ہتھیار استعمال کیے ہیں تو وہ امریکا ہے۔ اور خود امریکا کے پاس ہزاروں کی تعداد میں جوہری بم رکھتا ہے۔ پھر بھی آپ ہمیں وہ نہ کرنے کا کہتے ہو جو خود پہلے کر چکے ہو۔ اور امریکا اسرائیل کے جوہری ہتھیاروں کی جانب سے کیوں آنکھیں بند کر لیتا ہے؟''

مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ رابرٹ گیٹس نے بھارتی جرنیل کو کیا جواب دیا۔

بھارتی دھماکے کا منصوبہ لیک ہو گیا

دسمبر 1995ء ہی میں بھارت اپنی جوہری صلاحیت کو جانچنے کے لیے دھماکا کرنے جا رہا تھا کہ سی آئی اے کو علم ہو گیا۔ اس خفیہ ادارے نے فوراً ہی اخبار نیویارک ٹائمز کو یہ خبر پہنچا دی۔ یوں دھماکے کا یہ منصوبہ لیک ہو گیا اور خبر کی بنیاد پر بھارت میں امریکی سفیر نے بھارتی انتظامیہ کو قائل کر لیا کہ دھماکا نہ کیا جائے۔

تاہم 1998ء میں بھارت سی آئی اے کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا اور اپنے عزائم کا علم نہ ہونے دیا۔

نواز شریف کو امریکی ترغیب

بھارت کے جوہری دھماکوں کے بعد کلنٹن انتظامیہ کی کوشش تھی کہ پاکستان ایسا نہ کرے۔ ایسے میں امریکی نائب وزیر خارجہ کی ہمراہی میں تین رکنی ٹیم پاکستان گئی تاکہ وزیراعظم نواز شریف کو دھماکے نہ کرنے پر قائل کر سکے۔ مصنف بھی اس ٹیم کا حصہ تھا۔ بروس رائیڈل بتاتا ہے کہ نواز شریف کو معاشی اور فوجی امداد کی مد میں کروڑوں ڈالروں کی پیشکش کی گئی، اور ایف سولہ طیارے بھی جلد از جلد دینے کی یقین دہانی کرائی گئی۔ نواز شریف نے جواب میں مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے امریکا کو ثالث کا کردار ادا کرنے کے لیے کہا۔ مصنف کے مطابق ان تمام مذاکرات کے باوجود، ''ہماری واپسی سے قبل ہی نواز شریف دھماکا کرنے کے احکامات جاری کر چکے تھے۔''

کلنٹن بھارتی وزیراعظم کو سن ہی نہ پائے

کتاب کے مصنف نے امریکی صدر کلنٹن اور بھارتی وزیراعظم اندر کمار گجرال کی ملاقات کا دلچسپ قصہ لکھا ہے۔ مصنف کہتا ہے، ''گجرال کی شہرت تھی کہ وہ بہت ہی آہستہ بولتے ہیں، لیکن کلنٹن سے ملاقات

میں تو انہوں نے اپنا ہی ریکارڈ توڑ دیا۔ وہ اس قدر آہستہ بول رہے تھے کہ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ میری ذمہ داری تھی کہ میں گفتگو کے نوٹس لوں۔ صدر کلنٹن بھارتی وزیراعظم کو سننے کے لیے ان کے مزید قریب ہو گئے اور میں بھی کلنٹن کے اوپر جھک گیا۔ لیکن ہماری تدبیریں کسی کام نہ آئیں۔ ملاقات کے اختتام پر کلنٹن نے مجھ سے کہا کہ وہ گفتگو کے نکات پڑھنا چاہیں گے.....'' لیکن گفتگو کوئی سن پایا ہوتا تو نکات درج کرتا۔

اوباما کو ہالبروک پر اعتماد نہ تھا

رچرڈ ہالبروک کو افغانستان اور پاکستان کے لیے امریکا کا خصوصی ایلچی مقرر کیا گیا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ہالبروک کی شہرت ایک سخت گیر افسر کی تھی، جس کے ساتھ کام کرنا مشکل ہوتا ہے اور باراک اوباما نے ہالبروک کو خود پسند پایا۔ اسی وجہ سے اوباما اہم مواقع پر ہالبروک کو اپنے ہمراہ نہ رکھتے۔ یہاں تک کہ جب اوباما نے افغانستان کا پہلا دورہ کیا، تب بھی رچرڈ ہالبروک کو اپنے ہمراہ نہ رکھا۔ یہ واضح پیغام تھا کہ اوباما کو ہالبروک پر اعتماد نہ تھا۔

2009ء میں ہالبروک کو افغانستان میں انتخابات کی نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی۔ مصنف کہتا ہے کہ افغان صدر حامد کرزئی نے اپنے حق میں دس لاکھ سے زائد جعلی ووٹ ڈلوائے اور ہالبروک اس فراڈ کو پکڑ نہ سکے۔ اس وجہ سے بھی وائٹ ہاؤس میں ان پر بہت تنقید کی جاتی تھی۔

کتاب یوں تو بہت دلچسپ ہے اور اس میں بیان کیے گئے حقائق چشم کشا ہیں، لیکن مصنف پاکستان کے خفیہ ادارے آئی ایس آئی سے خاصا متنفر دکھائی دیتا ہے۔ جہاں جہاں موقع ملا، موصوف نے اس ادارے کے خلاف ہرزہ سرائی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ الزام بھی لگایا کہ 2007ء میں جب امریکا نے ڈرون حملے شروع کیے تو آئی ایس آئی کو حملوں سے قبل پیشگی وارننگ دی جاتی۔ لیکن اکثر معلومات افشا ہونے کی وجہ سے اکثر حملے ناکام رہتے۔

اسامہ بن لادن کی پاکستان آمد، ایبٹ آباد میں رہائش اختیار کرنا، بے نظیر بھٹو کا قتل، قتل کے بعد جگہ کو پانی سے دھویا جانا، ثبوتوں کا ضائع ہونا، کابل میں بھارتی سفارت خانے پر حملہ، ممبئی میں حملے..... الغرض مصنف نے ہر جگہ الزام کی توپیں آئی ایس آئی کی جانب موڑ دی ہیں۔

یہاں تک کہ مصنف کہتا ہے بلوچستان اور خیبر پختونخوا کی سرحدیں افغانستان سے ملتی ہیں۔ 2002ء کے انتخابات میں آئی ایس آئی نے ان دونوں صوبوں میں ایسی حکومتیں قائم کیں جو طالبان کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھیں۔

گویا سیاست سے لے کر سماجی رویوں تک، کون سا ایسا شعبہ ہے جہاں مصنف کے بقول آئی ایس آئی نے قطع و برید نہیں کی۔ اور یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس نے امریکا بہادر کو بھی ناکوں چنے چبوا دیے ہیں۔

ایک جگہ لکھا ہے ''پاکستان کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہونے کی ٹھوس وجوہ موجود ہیں۔ تشدد، دہشت گردی اور سیاسی قتل عام ہیں۔ سول اور فوجی تعلقات زہر آلود ہیں۔ آئی ایس آئی کی جانب سے دہشت گردوں کے لیے نرمی نے پاکستان کو دنیا بھر میں دہشت گردی کا دارالحکومت بنا دیا ہے اور یہ

کوئی حادثہ نہیں تھا کہ اسامہ بن لادن نے اپنی زندگی کے آخری سال پاکستان میں گزارے۔''

پاکستان کو دہشت گردی کا دارالحکومت قرار دیتے ہوئے بروس رائیڈل اسی دہشت گردی کے ہاتھوں پاکستانی عوام اور افواج کی ہلاکتوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔

آخر میں مصنف نے تجویز پیش کی ہے کہ پاکستان اور بھارت آپس میں روابط کو بہتر بنائیں اور باہمی تعلقات کے ساتھ ساتھ تجارت کو بھی فروغ دیں اور یہ کہ بھارت کو کشمیر پر اپنے موقف میں لچک لانا ہوگی۔

کتاب پڑھتے ہوئے ہم تو چونکہ ایک قسم کے مدافعتی تعصب میں مبتلا تھے، اس لیے جہاں جہاں مصنف نے تجزیہ کیا، اسے ہم نے شک کی نظر سے پڑھا۔ جہاں جہاں واقعات بیان ہوئے، ان کا لطف لیا، اور آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور اگر کہیں مشورہ دیا گیا تو ہم نے ذہن نشین کر لیا۔

یہ بھی اندازہ ہوا کہ امریکا کو اگر کبھی مدد کی ضرورت پڑی تو اس نے پاکستان کی طرف دیکھا، لیکن اپنا کام نکلنے کے فوراً بعد ہی آنکھیں پھیر لیں اور جہاں فائدہ پہنچانے کی بات آئی تو وہ بھارت کو پہنچایا گیا۔ (یہ اعتراف کتاب میں بھی جا بجا نظر آتا ہے)۔

بروس رائیڈل مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے امور پر چار امریکی صدور کے مشیر رہے ہیں۔ وہ القاعدہ اور جہاد کے موضوع پر تین کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ گاہے گاہے سیکیورٹی اور دہشت گردی کے موضوعات پر اخبار میں بھی لکھتے ہیں۔ آج کل وہ بروکنگز انسٹی ٹیوٹ کے انٹیلی جنس پروجیکٹ کے ڈائریکٹر ہیں۔ Avoiding Armageddon یہ کتاب دو سو تیس صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت 995 روپے ہے۔

خاموش رہنے سے کلمہ شریف کا ذکر۔ درود شریف اور استغفار پڑھنا بہتر ہے

کتاب: ہمارا اسلام قبول کرنا

نومسلم مردوں اور خواتین کے انٹرویوز

مولانا کلیم صدیقی صاحب

ہم نیک بنیں نیکی پھیلائیں

منشورات منصورہ۔ لاہور

042-35434909

ہم انسانیت پسند اچھے مسلمان بنیں

طالبِ دعا: شیخ محمدؐ عاطف پوری۔ اوکاڑہ

زندگی کی سب سے قیمتی متاع اچھی کتاب سے زیادہ کچھ اور نہیں

آیئے.....! کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریئے

کتابوں کی کہکشاں

غلام سجاد

کتابوں پر تبصرے کے روایتی کالم سے تھوڑا مختلف

مفہوم القرآن

آج کے دور میں انسان دنیاوی کاموں، پیسہ، عزت، شہرت اور ظاہری نمود و نمائش میں اتنا غرق ہے کہ اپنی زندگی کا حقیقی مقصد اور کائنات میں اپنا مقام مرتبہ سب کچھ بھلا بیٹھا ہے۔ اس پُرفتن دور میں انسان کی درست سمت میں راہنمائی کرنے اور لوگوں کو اسلام و قرآن سے روشناس کرانے کے لیے رفعت اعجاز نے قرآن پاک کا مفہوم عام اور سادہ الفاظ میں لوگوں تک پہنچانے کے لیے ''مفہوم القرآن'' کو مرتب کیا

ہے۔ اس کی کل چھ جلدیں ہیں۔ اس میں قرآن پاک کے ہر لفظ کا ترجمہ و مطلب مکمل تفصیل کے ساتھ بالکل آسان الفاظ میں لکھا گیا ہے کہ ہر عام و خاص آسانی سے سمجھ سکے۔ ''مفہوم القرآن'' تمام عمر کے افراد کے لیے قابلِ فہم ہے۔ اسے پڑھ کے بندہ قرآن کو زیادہ آسانی سے اور واضح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اس میں الم سے لیکر والناس تک تمام الفاظ کے معنی و مطلب اور تفصیل کے ساتھ ساتھ قرآن پاک میں بیان کیے گئے تمام واقعات، پیغمبر و صحابہ کرامؓ کے مرتبہ و مقام سے متعلق تفصیل بھی درج ہے۔

نام کتاب: مفہوم القرآن' پبلشر: زبیت القرآن' لاہور

مصنفہ: رفعت اعجاز، ہدیہ 65 روپے (فی جلد)

پتا: پوسٹ بکس 150 جی پی او لاہور

فون نمبر: 042-11173111

سیدہ فاطمۃ الزہراؓ

عورت کو جو مرتبہ و مقام اسلام نے دیا ہے دنیا کے کسی اور مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ عورت کے تین روپ ہیں ماں، بیوی اور بیٹی۔ عورت کا ہر رُوپ بہت پیارا اور قابلِ عزت ہے۔ بیٹی ہے تو گھر کے لیے رحمت ہے، بیوی ہے تو رزق کی کُشادگی کا باعث ہے۔ جبکہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ عبداللہ فاروقی کی کتاب ''سیدہ فاطمۃ الزہراؓ'' عورتوں کے انہی مقامات و عزتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مگر اس کتاب میں خاص طور

پر سیدہ فاطمۃ الزہراؓ پر جو کہ حضور نبی پاک ﷺ کی پیاری بیٹی حضرت علیؓ کی بیوی اور حسنینؓ کی والدہ ہیں کی ذات سے متعلق ہر بات اور ہر واقعہ کو نہایت خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کے جہاں ہمیں حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے مرتبہ و مقام سے آگاہی ہوتی ہے وہیں اسلام میں عورت کو دیے جانے والے مرتبہ و مقام کا بھی پتا چلتا ہے۔

نام کتاب: سیدہ فاطمۃ الزہراؓ، مصنف: عبداللہ فاروقی
پبلشر: زمزم پبلشرز کراچی، قیمت: 300 روپے
پتا: شاہ زیب سنٹر نزد مقدس مسجد اُردو بازار کراچی
صفحات: 234، فون نمبر 021-32760374

جدید ہتھیار

موجودہ صدی ٹیکنالوجی کی ہے: جو کام انسان دنوں مہینوں میں کرتا تھا آج وہ منٹوں اور گھنٹوں میں کر لیتا ہے۔ موبائل اور انٹرنیٹ ہر فرد اور ہر گھر کی تقریباً ضرورت بن چکا ہے۔ جہاں اس نے ہزاروں فائدے دیے ہیں وہاں اس کے کچھ منفی پہلو بھی منظرِ عام پر آئے ہیں۔ کچھ لوگ غلط فہمی کی بنا پر یا جان بوجھ کر یا پھر مذاق و شغل میں ان چیزوں کا غلط استعمال کرتے ہیں اور بہت سی ناگہانی آفتوں کو دعوت دے کر مسائل و پریشانیوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ میر بابر مشتاق کی کتاب ''جدید ہتھیار'' انٹرنیٹ اور موبائل ٹیکنالوجی سے متعلق تمام تر فوائد و نقصانات سے آپ کو آگاہ کرتی ہے ''جدید ہتھیار'' کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو احساس ہوتا ہے کہ موبائل، فیس بک، ٹوئٹر، اور انٹرنیٹ کو آپ نے اپنی زندگی کا لازمی جزو بنالیا ہے اور اسے 24 گھنٹے استعمال کرتے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ یہ آپ کو کتنا برباد کررہا ہے۔ یہ کتاب آپ کو موبائل اور انٹرنیٹ کے مفید استعمال کرنے کے طریقے اور اُس کے منفی استعمال کے مضر اثرات سے روشناس کراتی ہے۔

نام کتاب: جدید ہتھیار، مصنف: میر بابر مشتاق
قیمت: 300 روپے، صفحات: 264، پبلشرز: عثمان پبلی

کیشنز کراچی
پتا: اسلامک سنٹر نزد سائنس ڈگری کالج گجرات
فون نمبر: 0364-4874074

اُردو غزل کا فلسفیانہ پس منظر

اُردو ادب میں غزل کو شاعری کی صف میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ غزل ہی کے ذریعے بہت سارے لوگوں نے فلسفیانہ گفتگو کی ہے۔ فلسفہ کیا ہے، شاعری کیا ہے، غزل کیا ہے، غزل اور شاعری میں فلسفہ کی اہمیت کیا ہے؟ یہ سب الگ الگ چیزیں ہیں، مصنفہ نے بہت سے مسائل پر بحث کی ہے۔ انسان کیا ہے، کائنات میں انسان کا منصب، کائنات سے تعلق، حقیقت اولیٰ کا ادراک، اخلاقیات اور فنا و بقا تمام موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ بشریٰ شیریں نے اُردو غزل میں ان تمام مسائل کی فلسفیانہ تعبیر کی ہے، اس کے علاوہ اس کتاب میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ کن کن شعرا نے اس کو موضوعِ سخن بنائے رکھا

جن میں ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی میر، درد، غالب اور اقبال جیسے شعرا شامل ہیں۔ اس کتاب میں اُردو غزل کے فلسفیانہ عناصر، تصوفِ اسلامی کی تاریخ، فارسی غزل کی صوفیانہ روایت، شمالی ہند میں صوفیانہ روایت اور اقبال کی غزلوں میں تصوف کے حوالے سے مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔

نام کتاب: اُردو غزل کا فلسفیانہ پس منظر

مصنف: بشریٰ شیریں
قیمت: 350 روپے صفحات 174
پتا: دی رائٹرز اے۔ زی بک سنٹر شاہ کمال روڈ رحمٰن پورہ لاہور
فون نمبر 0300-4972079، تبصرہ نگار: غلام سجاد

بیت بازی

شاعری ہر خاص و عام اور ہر چھوٹے بڑے کی دلچسپی کا ذریعہ ہے۔ تقریباً ہر شخص اکثر مواقع پر اپنی بات کو منوانے، زور دینے یا پھر اپنے دل کا درد بیان کرنے کے لیے شاعری کا سہارا لیتا ہے۔ اچھی شاعری اعلیٰ ظرف اور اعلیٰ ذوق کے حامل لوگوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بیت بازی کے مقابلے کرائے جاتے ہیں۔ جن میں طلبہ کے شاعری کی طرف رجحان اور شوق کا پتا بھی چلتا ہے۔ بشریٰ شیریں کی کتاب ''بیت بازی'' اُن تمام طالب علموں اور نوجوانوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی جو بیت بازی کے مقابلوں میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کتاب میں۔ ''الف'' سے لے کر ''ے'' تک تمام حروف سے شروع ہونے اور ان تمام حروف پر ختم ہونے والے اشعار اور اُن کے ساتھ شاعر کا نام بھی درج کیا گیا ہے۔ کوئی بھی شخص اس کتاب کی مدد سے بیت بازی کا مشکل سے مشکل مقابلہ جیت سکتا ہے۔

حقیقتِ وحی اور قرآن کا سائنسی جائزہ

یہ کتاب دور حاضر کے ممتاز اسکالر ڈاکٹر ذاکر نائیک کی ترجمہ شدہ دو کتب ''حقیقتِ قرآن، ایک جدید سائنسی جائزہ'' اور ''حقیقت الفاظِ خدا، افسانہ یا سچی وحی'' کا مجموعہ ہے۔ دونوں کتابوں کا پس منظر یکساں ہے اور موضوعاتی یکسانیت باہم دگر گندھی ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مترجم زاہد کلیم ہیں۔

یہ کتاب ڈاکٹر ذاکر نائیک کا قرآن اور وحی کی صداقت پر جدید سائنسی بنیادوں پر ایک مفصل جائزہ ہے۔ کتاب کو مندرجہ ذیل ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (1) قرآن ..... وقت کے آخری کنارے تک (2) قرآن کا ماخذ (3) خدا کون ہے (4) نظریۂ امکانات (5) قرآن مجید اللہ کی ''Signs'' کی کتاب ہے محض ''Science'' کی نہیں (6) قرآن میں مصدقہ سائنسی حقائق کہاں سے آن ٹپکے؟ (7) مکالمات (8) حقیقت قرآن (سائنس کی نظر میں) اس کے علاوہ درج ذیل ابواب ہیں۔ فلکیات، طبیعات، آبیات، علم الارض، بحریات، نباتیات،

حیوانات، علم طب، علم الافعال الاعضاء، جینیات، عمومی سائنس، اتمام حجت۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے سائنسی موضوعات پر 26 سوالوں کے جو جوابات دیے ہیں وہ بھی کتاب میں شامل ہیں۔

ناشر: زمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز۔

پتا: اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔ Ph:051-5551519

قیمت: 450 روپے

قرآن وسنت کا دینی تصور اور بنیادی اسلامی عقائد

چودھری مشتاق احمد صاحب نے قرآن وسنت کے دائرہ میں محدود رہتے ہوئے اسلامی عقائد کے بارے میں تمام اہم باتیں اپنی اس کتاب میں سمودی ہیں۔

کتاب میں دین کی ضرورت اور اہمیت، اسلام کا تاریخی پس منظر، دین اسلام کا مفہوم اور حقیقت، اسلام اور عدل و توازن، نزول قرآن کا مقصد۔ عقیدہ توحید، سنت رسول ﷺ، سنت خلفائے راشدین، ایمان، عقیدہ وعمل کا مجموعہ، توحید الٰہی، شرکت کی حقیقت، غرض عقائد کے حوالے سے تمام ضروری امور کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ملنے کا پتا: چودھری مشتاق احمد، شہزاد کالونی، جہلم روڈ گجرات، فون نمبر: 0334-4639886

قیمت: 300 روپے

میڈیکل سائنسز

کسی طالب علم کی زندگی میں اہم ترین کام، کیریئر کا انتخاب ہے یعنی کہ اسے عملی زندگی میں کیا بننا ہے۔ اس ضمن میں ایک طالب علم کے ذہن میں کئی سوالات ابھرتے ہیں۔ میں کس تعلیمی شعبے میں جاؤں، کون سا پیشہ اپناؤں اور ایک

اچھی طرزِ زندگی کے لیے کتنی رقم درکار ہوگی وغیرہ؟ ان سوالات کا خاطر خواہ جواب ہمارے ہاں نہ تو گھر سے ملتا ہے اور نہ کہیں اور سے۔ ان سوالات کا مختصر جواب "کیریئر پلاننگ" ہے۔ کیریئر پلاننگ، وہ کلید ہے جو کسی بھی طالب علم کو کامیابی اور روشن مستقبل کی ضمانت دیتی ہے اور انسانی وسائل کے بہترین استعمال سے ہماری ترقی کی رفتار بھی تیز تر ہوسکتی ہے۔ اس کتاب میں میٹرک پاس تمام طلبا و طالبات کے لیے جو میڈیکل کی فیلڈ میں جانا چاہتے ہیں مکمل معلومات موجود ہیں۔

نام کتاب: کیریئر گائیڈ، میڈیکل سائنسز

مصنف: یوسف الماس، قیمت: 200 روپے،

ناشر: ایجوکیشن اسلام آباد، 051-2213201

کھیل کھلاڑی

کیا ایمانداری سے کرکٹ کھیلنے کا زمانہ لد گیا!

انڈیا "پیسہ" لیگ کا تماشا

کروڑوں روپے معاوضہ پانے والوں کی ہوس نے اُنھیں کہیں کا نہ چھوڑا

عالیہ احمد

جمعرات 16 مئی صبح تک 30 سالہ بھارتی بالر، سری سانتھ اپنی آبائی ریاست کیرالہ میں ہیرو کا درجہ رکھتا تھا۔ لوگوں کے نزدیک وہ ایک دلیر کرکٹر تھا جس نے کئی مشکلات کا مقابلہ کیا اور قومی ٹیم میں جا شامل ہوا۔

نوجوان لڑکے لڑکیاں اکثر سری سانتھ کے گھر کے باہر کھڑے ہوتے تاکہ اس کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ فلمی ہیروئنیں اسی کے ساتھ ڈانس کر کے خوشی محسوس کرتیں۔ حتیٰ کہ سیاست دان اور سرکاری آفیسر بڑی چاہت سے اُسے اپنی تقریبات میں بلاتے، لیکن لالچ و ہوس نے اُسے ذلیل و خوار کر دیا۔

ہوا یہ کہ مارچ 2013ء میں نئی دہلی پولیس کو اطلاع ملی کہ دہشت گردی کا کوئی بڑا واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ چنانچہ پولیس بیرونِ ممالک سے آنے والی تمام کالیں ریکارڈ کرنے لگی۔ اس آپریشن کے دوران بکیوں (جوئے بازوں) کی کالیں بھی ریکارڈ ہوئیں۔

بعدازاں جب ریکارڈ شدہ کالیں سنی گئیں تو ان میں چند بار سری سانتھ، انکیت چاون اور اجیت چاندیلا کے نام سنائی دیے۔ گو اور بیرون ملک موجود ان کے ساتھی رمزی الفاظ (کوڈ ورڈز) میں گفتگو کر رہے تھے، لیکن پولیس کو محسوس ہوگیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

سری سانتھ مشہور بالر ہے اور بھارت کی طرف سے 27 ٹیسٹ اور 53 ایک روزہ بین الاقوامی مقابلے کھیل چکا۔ انکیت اور اجیت فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلتے ہیں۔ تب اتفاق سے تینوں کھلاڑی آئی پی ایل (انڈیا پریمیئر لیگ) کی ٹیم راجستھان رائلز میں شامل تھے۔

دہلی پولیس پھر خفیہ طور پر تینوں کھلاڑیوں کی کالیں ریکارڈ کرنے لگی۔ جلد ہی اُسے معلوم ہوگیا کہ

تینوں بکیوں سے رابطے میں ہیں اور ان روابط کا مقصد آئی پی ایل کے حالیہ مقابلوں میں اسپاٹ فکسنگ کرنا تھا۔

پہلی اسپاٹ فکسنگ 5 مئی کو اجیت چاندیلا نے انجام دی۔ اسی دن پونہ وارئیر ٹیم کے خلاف کھیلتے ہوئے اسپنر اجیت چاندیلا نے دوسرے اوور میں 15 رن دیے۔ بکیوں کے حسب منشا اوور کرانے پر اُسے 49 لاکھ روپے ملے۔

9 مئی کو فاسٹ بالر سری سانتھ نے کنگز XI پنجاب کے خلاف کھیلتے ہوئے اسپاٹ فکسنگ کی۔ اس نے طے شدہ رمزی اشارے کے مطابق ہاتھ منہ پونچھنے والا تولیہ پتلون کی جیب میں ڈال دیا۔ یہ اشارہ تھا کہ بکی شرطیں لگانا شروع کردیں۔ اس اوور میں سری سانتھ نے 13 رن دیے۔ دہلی پولیس کا کہنا ہے کہ اس ایک اوور کے دوران بکی چندریش پٹیل نے ڈھائی کروڑ روپے کمالیے۔ یہ بکی گرفتار ہوچکا ہے۔ دوسری طرف سپاٹ فکسنگ کرنے پر سری سانتھ کو 60 لاکھ روپے دیے گئے۔

15 مئی کو اسپنر انکیت چاون سرگرم عمل ہوا۔ اس بار راجستھان رائلز کا ٹاکرا ممبئی انڈینز سے تھا۔ اُس نے دوسرے اوور میں دانستہ آسان گیندیں کرائیں جن پر بکیوں نے اُسے 60 لاکھ روپے ادا کیے۔

جب دہلی پولیس تینوں کھلاڑیوں کے خلاف ثبوت جمع کرچکی، تو 16 مارچ کی صبح انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتاری کے وقت سری سانتھ نشے میں گرل فرینڈ کے ساتھ کار میں سوار تھا۔ کرکٹر نے گرفتار کرنے والے پولیس افسروں کو دھمکیاں دیں اور کہا کہ کیرالہ و آندھرا پردیش کے وزرائے اعلیٰ اس کے جاننے والے ہیں۔ ان سے کہہ کر وہ انھیں برطرف کرادے گا۔ لیکن جب تھانے پہنچ کر نشہ اترا تو وہ بھیگی بلی بن گیا اور معافیاں مانگنے لگا۔

اسپاٹ فکسنگ کا یہ واقعہ واضح کرتا ہے کہ دنیا میں ٹی ٹوئنٹی کرکٹ کا سب سے بڑا اور امیر کبیر ٹورنامنٹ، آئی پی ایل جوئے بازی میں لتھڑ ہوا ہے۔ اس ٹورنامنٹ میں عام افراد سے لے کر کھلاڑی حتیٰ کہ ٹیموں کے مالکان تک میچوں پر مختلف اقسام کا جوا کھیلتے ہیں۔

سب سے پہلے تو اسپاٹ فکسنگ کو سمجھیے۔ فرض کریں آپ ایسے بس اسٹاپ پہ بیٹھے ہیں جس کے سامنے سے مختلف ماڈلوں کی گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ یہ معمول کی بات ہے۔ لیکن جب آپ دوسروں کے ساتھ شرط لگاتے ہیں کہ اگلی کار ہنڈا ہوگی، تو معمول غیر معمولی بن جاتا ہے۔ یہ اسپاٹ فکسنگ اس وقت بنتی ہے جب آپ اپنے دوست کو فون کرکے کہیں کہ ہنڈا کار لیے آجاؤ۔

اب آئی پی ایل کے میچوں کی یہ حالت ہوچکی ہے کہ کوئی نہیں جانتا، بلے باز نے فلاں شاٹ مرضی سے لگائی یا اس کے پیچھے بکیوں کی فرمائش کار فرما تھی۔ مزید براں دوران میچ کھلاڑی مختلف اشاروں کے ذریعے بکیوں سے رابطہ رکھتے ہیں مثلاً ہاتھ میں بندھی گھڑی گھمانا، تولیہ پتلون کی جیب میں ڈالنا، پانی پیتے ہوئے کلی کرنا، قمیص سے لاکٹ نکالنا، پتلون اوپر کرنا وغیرہ۔

غرض جوئے بازی اور شرطیں لگانے کا عمل کرکٹ جیسے کھیل کو بری طرح داغدار کرچکا۔ ایک زمانے میں شائقین لطف اُٹھانے کے لیے کرکٹ مقابلے دیکھتے تھے۔ تب جیتنے کے لیے کھلاڑی بھی

جان لڑا دیتے اور محیر العقول کارنامے انجام دیتے۔ مثلاً 1979ء میں عمران خان نے بشن سنگھ بیدی کو ایک اوور میں دو چھکے مار کر پاکستان کو ٹیسٹ جتوایا۔ جاوید میاں داد نے 1985ء میں

سری سانتھ

شارجہ میں آخری گیند پر چھکا مار کر پاکستانیوں کو خوشی سے نہال کردیا تھا۔

لیکن اب ایمان داری سے کرکٹ کھیلنے کا زمانہ گزر گیا کیونکہ مادہ پرستی کے جرثومے اس کھیل میں داخل ہوچکے۔ کھلاڑی اب کارکردگی دکھائے بغیر راتوں رات امیر ہونا چاہتے ہیں۔ اور اسی لالچ و ہوس کو دنیائے کرکٹ میں سب سے زیادہ آئی پی ایل ہی نے رواج دیا۔

2007ء میں جب بھارتی کرکٹ بورڈ نے آئی پی ایل کی بنیاد رکھی، تو شائقین کو یقین تھا کہ اب جوش و جذبے سے بھرے میچ دیکھنے کو ملیں گے۔ لیکن جلد ہی یہ مقابلہ دولت میں لت پت ہوگیا۔ یہ اب بھارتی کرکٹ بورڈ کے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی بن چکا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمہ اقسام کے اسکینڈلوں کے باوجود بھارتی کرکٹ بورڈ یہ بدنام زمانہ ٹورنامنٹ ختم کرنے کو تیار نہیں۔

اب حالیہ آئی پی ایل 2013ء کو ہی لیجیے۔ ٹکٹوں کی فروخت، ٹی وی اور انٹرنیٹ حقوق کی فروخت، اشتہار بازی، سپانسرشپ وغیرہ سے بھارتی کرکٹ بورڈ کو تقریباً ''15 ارب روپے'' کی آمدن ہوئی۔ یہ آمدن کرکٹ بورڈ اور آئی پی ایل کی ٹیموں کے مابین تقسیم ہوجاتی ہے۔

اسی آمدن کے باعث آئی پی ایل کی ٹیمیں پُرکشش معاوضے پر ملکی و غیر ملکی کھلاڑی بھرتی کرتی ہیں۔ مثلاً آل راؤنڈر، گلین میکس ویل کو 10 لاکھ ڈالر (10 کروڑ روپے) معاوضہ دیا گیا۔ گویا محض ڈیڑھ ماہ کھیل کر یہ کھلاڑی کروڑ پتی بن گیا۔ اسی طرح سری لنکن اجنتھا مینڈس کو سوا سات کروڑ روپے، آسٹریلوی کین رچرڈسن کو سات کروڑ روپے اور تھیرا پریرا کو پونے سات کروڑ روپے معاوضہ دیا گیا۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ کروڑوں روپیہ معاوضہ بھی بعض کھلاڑیوں کی ہوس ختم نہیں کرپاتا۔ مثال کے طور پر سری سانتھ ہی کو لیجیے۔ اُسے آئی پی ایل 2013ء کھیل کر ''4 کروڑ روپے'' ملنے تھے۔

ونود دارا سنگھ

لیکن اس نے صرف ساٹھ لاکھ روپے کی خاطر نہ صرف اپنا کیریئر ختم کرڈالا بلکہ ملک و قوم کو بھی پوری دنیا میں رسوا کردیا۔

پیسے کی ہوس ہی نے انڈین پریمیئر لیگ کو اب ''انڈین پیسا لیگ'' بنا ڈالا ہے۔ دہلی پولیس کے چیف نیراج کمار کا کہنا ہے'' آئی پی ایل میں اب کھلاڑی اور بکیوں کے مابین جُگل بندی (شراکت داری) ہوچکی۔ اب ہر رن اور ہر اوور پر سپاٹ فکسنگ کرنا ممکن ہے۔ بس کوڈ ورڈ میں اشارے دینے کا طریقہ آنا چاہیے۔''

بھارت میں پچھلے ایک عشرے کے دوران اقربا پروری بھی دولت مند ہونے کا بڑا ذریعہ بن چکی۔ یہ امر بھی حالیہ سکینڈل میں نمایاں ہوکر سامنے آیا۔ سری سانتھ نے دوران تفتیش پولیس کو بتایا ''اگر آج میرے ساس سُسر بھی بارسوخ و طاقتور ہوتے، تو میں آئی پی ایل کے میچ فکس کرکے کروڑوں روپے کماتا۔ اور حکومت میں کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ مجھ پر ہاتھ اُٹھا سکے۔ لیکن میں نے بے وقوفی کی حد کردی۔''

سری سانتھ کے مطابق پچھلے 3 سال میں کیرالہ اور تامل ناڈو کے بڑے بڑے سیاست دانوں نے اُسے پیش کش کی تھی کہ وہ ان کی کسی بیٹی سے بیاہ کرلے۔ لیکن وہ ٹالتا رہا۔ اس سستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے جیل میں سڑنا پڑا۔

بھارتی بالر نے پولیس کے سامنے مزید انکشاف کیا'' 2 سال قبل ایک تقریب میں میری ملاقات رابرٹ وودرا (سونیا گاندھی کے داماد) سے ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا، زندگی میں ایک بہترین چال چلو، پھر قدرت تم پر نعمتوں کی بارش کردے گی۔ تب مجھے بات سمجھ میں نہیں آئی۔ مگر اب سمجھ چکا۔ رابرٹ بتانا چاہتا تھا کہ کسی بارسوخ خاندان کے داماد بن جاؤ، پھر دولت تمھارے گھر کی باندی بن جائے گی۔''

دہلی پولیس کمشنر، نیراج کمار بتاتا ہے'' جب ہم سری

> **پروفیسر**
>
> اعداد و شمار کے ماہر پروفیسر نے ایک مرتبہ اپنے دوستوں کو بتایا: ''اوسط درجے کا ایک آدمی روزانہ تقریباً دس ہزار الفاظ بولتا ہے جب کہ اوسط درجے کی عورت روزانہ تیس ہزار الفاظ بولتی ہے۔'' پھر وہ آہ بھر کر بولے: ''بدقسمتی سے شام کو جب میں گھر پہنچتا ہوں تو اپنے دس ہزار الفاظ استعمال کرچکا ہوتا ہوں جب کہ میری بیوی تیس ہزار الفاظ بولنے کا آغاز کرتی ہے۔''
>
> (عبداللہ رمضان۔ عارف والا)

سانتھ کی باتیں سن رہے تھے، تو ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے۔''

بھارتی بکی بہت چالاک و ہوشیار ہیں۔ وہ اسپاٹ فکسنگ کرانے کے لیے ایسے کھلاڑیوں کو پھانستے ہیں جو عیش و عشرت کے دلدادہ اور نوجوان ہوں۔ یا پھر ایسے کھلاڑی جو جلد ہی کرکٹ کو خیر باد کہنے والے ہوں۔ دونوں قسم کے کھلاڑی وافر پیسا چاہتے ہیں۔ یہی خواہش انھیں بکیوں کے اشاروں پر چلانے لگتی ہے۔

آئی پی ایل کے مخالفین یہ حقیقت بھی واضح کرتے ہیں کہ اس نے بھارت میں جنسیت (Sexism) کو فروغ دیا ہے۔ ہر میچ میں نیم برہنہ لڑکیاں چوکے چھکے پڑنے یا آؤٹ ہونے پر فحش ناچ پیش کرتی ہیں۔ پھر روزانہ رات کو تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ ان میں شراب و شباب کی فراوانی ہوتی ہے۔

لیکن اسی جنسیت کے فروغ نے بھارتی معاشرے سے شرم و حیا کو نیست و نابود کردیا۔ اب وہاں مادر پدر آزادی کا چلن ہے۔ نتیجتاً روزانہ عصمت دری کے کئی

واقعات جنم لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اب شہروں میں بھی خواتین خصوصاً رات کو باہر نکلتے ہوئے ڈرتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آئی پی ایل نے بھارت کو بدنامی و رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ یہ ایسا عفریت ہے جو ممکن ہے ایک دن کرکٹ کو بھی کھا جائے۔ پیچھے صرف دولت اور شراب و شباب کی ہوس باقی رہے گی۔ دہلی پولیس نے انکشاف کیا کہ منان اور چاند نامی بکی سری سانتھ اور دیگر کھلاڑیوں کے لیے لڑکیوں کا بھی بندوبست کرتے تھے۔

16 مئی کو دہلی پولیس نے آئی پی ایل میں جوئے بازی کا جو نیٹ ورک افشا کیا، وہ رفتہ رفتہ پھیلتا چلا گیا۔ انکشاف ہوا کہ سری سانتھ وغیرہ تو محض مچھلیاں تھیں، بڑی شارکیں تو ابھی دریا میں تیر رہی ہیں۔ ایک ایسی ہی شارک انھیں بالی وڈ اداکار و نود دارا سنگھ کی صورت میں ملی جسے 21 مئی کو گرفتار کیا گیا۔

جب ونود دارا سنگھ سے تفتیش ہوئی، تو اس نے انکشاف کیا کہ وہ آئی پی ایل کی ایک ٹیم، چنائے سُپر کنگز کے مالک گروناتھ میاپان کے کہنے پر میچوں پر جوا کھیلتا تھا۔ یہ گروناتھ میاپان بھارتی کرکٹ بورڈ کے سربراہ این سری نواسن کا داماد ہے۔ یوں پولیس کی تفتیش پھیلی تو آئی پی ایل میں موجود شارکیں بھی سامنے آنے لگیں۔

جلد ہی کوئی اور نہیں، گروناتھ کا سالا ایشوین سری نواسین گھر کے پول کھولنے لگا۔ اس نے انکشاف کیا کہ گروناتھ 2011ء سے میچ و اسپاٹ فکسنگ کررہا ہے اور یہ کہ اس کے چنائے اور دبئی کے بکیوں سے تعلقات ہیں۔ ایشوین نے مزید بتایا کہ گروناتھ نے شوقیہ جوا کھیلنا شروع کیا تھا، لیکن اب وہ منظم کاروبار کی شکل میں تبدیل ہوچکا۔

ایشوین نے دعویٰ کیا کہ 20 مارچ کو ممبئی میں چنائے سُپر کنگز اور ممبئی انڈینز کے مابین کھیلا جانے والا میچ فکس تھا۔ اس میچ میں چنائے سُپر کنگز کو جیتنے کے لیے صرف 139 رن درکار تھے لیکن ٹیم 79 رن پہ آؤٹ ہوگئی۔ حالانکہ اس میں دنیا کے نامی گرامی کھلاڑی تھے۔ حتیٰ کہ ''9 کھلاڑی'' دس یا اس سے کم رن ہی بنا پائے۔

آخر 24 مئی کو پولیس نے گروناتھ کو بھی جیل خانے پہنچا دیا۔ اس پر میچوں پر سٹہ کھیلنے کا الزام ہے۔ یوں آئی پی ایل اپنی تاریخ کے سب سے سنگین بحران میں گھر گئی۔ اُدھر بھارتی کرکٹ بورڈ کا سربراہ خود کو معصوم ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب وہ آئی پی ایل 6 کا فائنل دیکھنے پہنچا، تو شائقین کرکٹ نے آوازیں لگا کر اس کا مذاق اُڑایا۔ اس کھلی بے عزتی کے باوجود بھارتی کرکٹ بورڈ کے سربراہ نے استعفیٰ دینے سے انکار کردیا تھا۔

اُدھر بھارت میں حالیہ سکینڈل کے بعد یہ بحث شروع ہوگئی ہے کہ کیا کرکٹ میچوں پہ جوا جائز قرار دے دیا جائے؟ اس تجویز کے حامی کہتے ہیں کہ یوں ملک کو بکیوں کی لعنت سے چھٹکارا مل جائے گا جو نوجوان کھلاڑیوں کو کرپٹ کرتے ہیں۔ جبکہ مخالفین کا کہنا ہے کہ کرکٹ میں جوئے بازی در آئی، تو شرفا کا یہ کھیل مکمل طور پر کمرشل ازم کا شکار ہوجائے گا۔

کئی بھارتی ماہرین نے یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ چند برس کے لیے آئی پی ایل کو التوا میں ڈال دیا جائے۔ یوں اس ٹورنامنٹ نے معاشرے میں پیسے اور عیش و عشرت کی جو دوڑ لگا دی ہے، وہ بھی اختتام کو پہنچے۔ لوگوں میں صبر و سکون جنم لے اور وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے اپنا بھلا برا سوچنے کے قابل ہوسکیں۔

■■■

باتیں دانش کی

رفیدہ کلیم فاروقی

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ (9 نومبر 1877ء۔21 اپریل 1938ء)

مفکر پاکستان، شاعرِ مشرق، حکیم الامت، علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ نور محمد انتہائی متقی اور پرہیزگار شخص تھے۔ آپ کے بزرگ کشمیری برہمنوں کی سپرو گوت سے تعلق رکھتے تھے۔ جنھوں نے تقریباً سو سال قبل اسلام قبول کر لیا تھا اور ہجرت کر کے پنجاب میں آباد ہوئے۔ آپ نے اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف اے، گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ لندن سے بار ایٹ لاء اور جرمنی سے فلسفہ ایران لکھنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سیالکوٹ میں خوش قسمتی سے آپ کو مولوی میر حسنؒ کی شاگردی اور صحبت نصیب ہوئی جنھوں نے آپ کے دل میں نہ صرف عربی فارسی کا حقیقی شوق پیدا کیا بلکہ علمی تحقیق و جستجو کا مادہ بھی پیدا کیا۔ آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں بحیثیت استاد اور اورینٹل کالج میں عربک ریڈر اور استاد رہے۔ فلسفے کی تعلیم مشہور استاد سر تھامس آرنلڈ سے حاصل کی اور انہی کے مشورے سے اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے۔ جرمنی میں آپ کی استاد ویگے ناسٹ نے آپ کو مشہور جرمن مفکر و شاعر گوئٹے، نطشے اور برگساں سے روشناس کرایا۔ آپ کی تصنیفات میں بانگ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز کا کچھ حصہ (اردو شاعری)، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق اور زبورِ عجم (فارسی شاعری) اور نثر میں اقتصادیات کے علاوہ آپ کے چودہ خطبات الٰہ آباد بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ نے برصغیر ہند کے شمال مغرب میں مسلمانانِ ہند کے لیے ایک الگ مملکت کی تجویز پیش کی۔ 1922ء میں انگریز بادشاہ جارج نے آپ کو سر کا خطاب دیا اور آپ کی سفارش پر آپ کے استاد مولوی میر حسن کو شمس العلما کا خطاب دیا گیا۔ آپ کو پاکستان کا قومی شاعر مانا جاتا ہے۔ آپ مولانا رومی کو اپنا روحانی مرشد مانتے تھے۔

آپ نے قومی ذمہ داریوں اور شاعری کی وجہ سے وکالت کو خیر باد کہا۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں آپ نے اپنی شاہکار نظمیں خصوصاً شکوہ جواب شکوہ اور نالۂ یتیم وغیرہ سنائیں۔ خودی، عشقِ رسول ﷺ، اسلام، قومیت، انسانی مساوات، اور امید کے متعلق آپ کے اشعار شاہکار ہیں۔ آپ کی شاعری کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ قائداعظم کو آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی کی ترغیب دی۔ اسرارِ خودی کا ترجمہ علامہ کے استاد پروفیسر نکلسن نے انگریزی میں کیا۔ آپ کا مزار شاہی مسجد لاہور کے صدر دروازے کے جنوبی دروازے کے پاس ہے۔

اقوال:

1۔ زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ۔

2۔ بات سجدوں کی نہیں خلوصِ نیت کی ہوتی ہے۔

3۔ یقین ایک عظیم قوت ہے۔

4۔ سفارش خودداری کے قطعی منافی ہے۔

5۔ عالم قلم پر چلتا ہے صوفی قدم پر۔

6۔ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی۔

7۔ مجھے ان جوانوں سے محبت ہے جو ستاروں پر کمندیں ڈالتے ہیں۔

صحت نہیں وزن کم کریں

یہ کیا کلچر بن رہا ہے کہ روزہ نہیں رکھنا اور ڈاکٹر سے کہلوانا ہے

داؤدی روزے سے بہتر کوئی روزہ نہیں

حالیہ ریسرچ کے مطابق "روزہ" انسانی جسم پر بڑھاپا آنے کے عمل میں کمی کا باعث بنتا ہے

اپنے دل کو بتائیے اور یقین دلائیے
چند گھنٹے کی بھوک سے مر نہیں جائیں گے

انرجی لیول برقرار رکھنے کے لیے
دن بھر کے لیے ایک روٹی بھی بہت ہے

نوشین ناز: (نیوٹریشنسٹ، ماہر غذائیات)
0301-4585405

ڈاکٹر صاحبہ میرا دل گھبراتا ہے۔ ٹانگوں سے جان نکل جاتی ہے! چکر آتے ہیں۔ میرا فشارِ خون (بلڈ پریشر) بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ تو پھر میں روزہ نہ رکھوں؟

میرے پاس رمضان شروع ہونے سے پہلے اس طرح کی باتیں اور سوال لے کر اتنے زیادہ مریض آئے کہ میرا دل گھبرانے لگا ہے ہر دوسرے شخص کو روزے رکھنے سے چھٹکارا چاہیے!

سوچتی ہوں تو گھبرا جاتی ہوں!! اب یہ کیا نیا کلچر ہے؟ روزہ بھی نہیں رکھنا؟؟

اور ڈاکٹر سے رخصت پر Stamp بھی لگوانی ہے۔ میں نے سب کو انکار کیا۔ اوّل تو واقعی وہ لوگ روزہ رکھ سکتے تھے۔ دوسرا میں کیوں گناہ گار بنوں اور کسی لالچی مفتی کا سا کام کروں۔

وجہ بے وجہ اُن کو رخصت دوں!!

روزہ اور جنگ دونوں جذبے سے ہوتے ہیں۔ میں نے بہت لاغر اور ضعیف لوگوں کو ہنسی خوشی روزے رکھتے دیکھا ہے۔

"ہم روزہ نہیں رکھ سکتے!!"

یہ ہمارے جسم کی بیماری کی وجہ نہیں ایمان کی کمزوری اور راہِ فرار کی وجہ سے ہے۔

سال بعد جو رَبِّ کریم کی رحمت اور نعمت لوٹنے کا موقع ہم ہاتھ سے گنوا دیتے ہیں۔ آہ!! اُن لوگوں کو بھی تو دیکھیں جو رمضان المبارک سے صرف چند روز قبل اِس دُنیا سے چلے گئے۔ اُن کو روزے نہ مِل سکے کیوں کہ وہ دُنیا چھوڑ گئے انھیں نیکی، رحمتیں اور اجروثواب کی موجیں لوٹنے کا موقع نصیب نہ ہوا۔ لیکن جو زندہ ہے وہ خود پر اتنا ظلم کیسے کرسکتا ہے، کیسے اپنے آپ کو محروم رکھ سکتا ہے؟

میں آپ کو ایک اہم بات بتاتی ہوں، غذا کے ماہرین سائنسی بنیادوں پر کہتے ہیں کہ انسان خوراک کے بغیر اکیس دن زندہ رہ سکتا ہے جب کہ پانی کے بغیر تقریباً سات دن۔ یہ ایک عام سی بات ہے۔

اپنے دل کو بتائیے اور یقین دلائیے ہم چند گھنٹوں کی بھوک سے مر نہیں جائیں گے، پلیز مجھ پر بھروسہ کریں۔ میں اپنے سب مریضوں کو بتا رہی ہوں کہ آپ کو سارے دِن میں ایک روٹی کافی ہے اپنا انرجی لیول Energy Level ٹھیک رکھنے کو۔ تفسیر کی ایک کتاب میں، میں نے پڑھا کہ ایک نبی میں چالیس مردوں کی طاقت ہوتی ہے اور ہمارے نبی ﷺ صرف چند کھجوروں یا دُودھ کے ایک پیالے سے دِن گزار لیتے تھے اور ہم اُن کی اُمت ہیں؟

ابھی پیٹ میں کچھ کھانا باقی ہوتا ہے اور ہم اگلا مینیو سوچ رہے ہوتے ہیں۔ سارا دِن کھانا پکانا اور کھانا! اور پھر مزید کھانا۔ یہ ہمارا مستقل اور پسندیدہ کام ہے اور اس کام سے صرف ایک ماہ کو ہم رخصت نہیں لے سکتے؟ وہ ماہ مبارک جس میں ہر نماز پر نیکی اور ہر اچھے بول کا کم سے کم چار گناہ زیادہ ثواب ہے۔

راجا صاحب پر جدید ملبوسات کی سیل (sale) لگی ہو تو میاں اور بجٹ کو تنگ کرکے اُس کا فائدہ اُٹھانے ہم پہنچ جاتے ہیں۔ اور یہاں کم ٹائم میں زیادہ نیکی کی sale پر ہمیں رخصت چاہیے! کیا اندازِ فکر ہے۔ کیا سوچ اور پسند ہے۔

ہم ایسے اندھے کیوں ہوگئے ہیں؟ ہمیں اپنا حقیقی نفع بھی نہیں نظر آتا۔ یاد رکھیے: ''روزہ اللہ کے لیے ہوتا ہے اور اُس کا اجروثواب اور ہمت، طاقت اور صبر وہ خود دیتا ہے!''

''یہ کیا کم ہے کہ زمین و آسمان کا مالک کہتا ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور اس کا اجر میں ہی دوں گا۔''

روزے کی بھوک سے ڈرنے والے پلیز میری بات مانیں۔ ایک بار مزید اس کو چکھ کر دیکھیں یقین رکھیے! آپ نہیں مریں گے بلکہ فائدہ ہی ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں کہہ لیں کہ روزہ بدن کی زکوٰۃ ہے۔

روزے سے عمر میں اضافہ اور بڑھاپا کے عمل میں کمی ہوتی ہے۔ روزے کے دوران جب روزانہ جسم کو کچھ دیر کے لیے کیلوریز نہیں مہیا ہوتیں تو اِس غذائیت کو روکنے کے عمل (Caloric Restriction) کے جسم پر نہایت صحت مند اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جدید طبی تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ جسم کو مخصوص اوقات میں خوراک سے روکنے (روزے) کی وجہ سے جسم کو سرطان، دِل کے امراض، شوگر، دماغی امراض (Immune disorder) کے لاحق ہونے کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی پتا چلا ہے کہ روزہ رکھنے کی وجہ سے انسانی جسم میں بڑھاپا آنے کے عمل Ageing Process میں کمی آجاتی ہے۔ بلکہ

انسان کی عمر لمبی ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ جیسا کہ حال ہی میں ریسرچ آئی ہے کہ ایک دِن چھوڑ کر ایک دِن روزہ رکھنے سے سرطان کی بیماری لاحق ہونے کے امکانات میں بھی کمی آجاتی ہے۔ امریکی سائنسدانوں کی ایک تحقیق بھی ہے کہ روزانہ روزہ رکھنے کی طرح ایک دِن چھوڑ کر روزہ رکھنے سے بھی انسان کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ایرک کے مطابق:

"Alternate day Fasting may be an Alternative to prolonged die restriction for increasing the life span"

''طویل عرصے تک ایک دِن چھوڑ کر روزہ رکھنا انسان کی عمر لمبی کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔''

(صحیح بخاری حدیث نمبر 170، صحیح مسلم حدیث نمبر 1159) اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب نماز داؤد علیہ السلام کی نماز ہے اور سب سے زیادہ محبوب روزے بھی داؤد علیہ السلام کے ہیں، حضرت داؤد علیہ السلام آدھی رات سوتے تھے اور اُس کا تیسرا حصہ قیام کرتے اور چھٹا حصہ سوتے تھے اور ایک دِن روزہ رکھتے اور ایک دن نہیں رکھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ بخاری اور مسلم کی ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ نے جب حضور ﷺ سے اصرار کرکے پوچھا: میں ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھنے (داؤدی روزے) سے بہتر روزہ رکھ سکتا ہوں یعنی روزانہ روزہ

آپ کے لیے تحفتاً کیلوریز کا چارٹ دے رہی ہوں اپنا ڈائیٹ پلان اس کے اندر رکھیں اور فٹ رہیں۔

اپنی مرضی کا وزن پانے کے لیے آپ اپنے پورے دن کی کیلوریز کو 1000 سے 1500 تک محدود رکھنا سیکھیں

دال یا سبزی ایک پلیٹ	200 کیلوریز	ایک پلیٹ نہاری چھوٹی	700 کیلوریز	ایک سلائس	60 کیلوریز
دال سبزی ایک بوٹی گوشت	300 کیلوریز	ایک پیالہ پائے	600 کیلوریز	ایک انڈا اُبلا ہوا	90 کیلوریز
ایک پلیٹ ابلے چاول (50 گرام)	150 کیلوریز	ایک پیالہ مرغ چنے	400 کیلوریز	فرائی انڈا	125 کیلوریز
ایک پلیٹ گھی والے چاول	250 کیلوریز	گھر کی چپاتی (60 گرام)	200 کیلوریز	آملیٹ	150 کیلوریز
ایک چکن پیس (100 گرام)	200 کیلوریز	سادہ روٹی تندوری (90 گرام)	300 کیلوریز	ایک سادہ بسکٹ	30 کیلوریز
ایک شامی (50 گرام)	200 کیلوریز	خمیری روٹی تندوری 100 گرام	340 کیلوریز	کریم والا بسکٹ	500 کیلوریز
ایک پلیٹ بریانی	300 کیلوریز	کلچہ (80 گرام)	250 کیلوریز	ایک پیسٹری (80 گرام)	300 کیلوریز
ایک کباب (بیف)	100 کیلوریز	پراٹھا (100 گرام)	450 کیلوریز	ایک سموسہ درمیانہ	300 کیلوریز
آدھی پلیٹ پکوڑے (100 گرام)	400 کیلوریز	فنگر چپس چھوٹی پلیٹ (50 گرام)	200 کیلوریز	چکن برگر بڑا	500 کیلوریز
بیف برگر بڑا	600 کیلوریز	پیزا چھوٹا سو گرام	500 کیلوریز	ملک شیک (کیلا)	210 کیلوریز
ملک شیک (سیب)	180 کیلوریز	ملک شیک (آم)	200 کیلوریز	دودھ ایک گلاس بغیر بالائی	150 کیلوریز
تازہ پھلوں کا جوس	120 کیلوریز	بوتل (پیپسی کولا)	110 کیلوریز	بوتل (جوس)	130 کیلوریز
شربت (روح افزا)	130 کیلوریز	لسی (ایک گلاس)	200 کیلوریز	لسی ایک گلاس (آدھا دودھ آدھا دہی)	250 کیلوریز
کچی لسی (ایک گلاس)	40 کیلوریز	چائے بغیر چینی	30 کیلوریز	چائے چینی کے ساتھ	60 کیلوریز

رکھ سکتا ہوں؟ تو رحمتِ عالم ﷺ نے وہ جواب دیا جو روزے کے متعلق جدید سائنس کی تحقیق ہے۔

(لا افضل من ذالک)

زندگی ایک بار ملتی ہے اور یہاں ہر کام کرنے کا چانس ایک بار ملتا ہے۔ کوئی سین اور لمحہ Rewind نہیں ہوتا، پلٹ کر نہیں آتا۔

پلیز روزے سے نہ ڈریں یہ آپ کو اس دُنیا میں بہت سی بیماریوں سے بچاتا ہے اور اُس دُنیا میں عذاب سے بچائے گا۔ اِس بار ایک بات کو کہنے کے لیے اتنی بڑی تمہید باندھنی پڑی کہ آپ کے سوالات کی جگہ کم پڑ گئی۔ معذرت خواہ ہوں!! آیندہ ماہ اِن شاءاللہ ضرور آپ کے سوالات کا جواب دوں گی۔

ڈاکٹر ایرک کی اس تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ رمضان کے مسلسل ایک مہینا روزے رکھنے کے علاوہ سال کے بقیہ گیارہ مہینوں میں اگر کوئی چاہے تو ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزے (Alternate day Fasting) رکھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر ایرک کو شاید اس بات کی خبر نہ ہو لیکن رسول کریم ﷺ نے ہمیں اس طرح کے روزے کے متعلق حدیث مبارک میں بتادیا تھا کہ سب سے بہترین نفلی روزے "داؤدی روزے" ہیں جیسا کہ عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔

خوشخبری

محمد سلیمان آزاد کشمیر نے تین ماہ میں 140 سے 119 وزن کیا ہے۔ اس قدر بہترین نتائج پانے پر شاباش۔ آپ اپنا مزید پلان بنوالیں۔ پانی اور دُودھ زیادہ استعمال کریں۔

☆ سدرہ کمال کراچی: آپ کو اولاد کی خوشخبری مبارک ہو۔ شادی کے چھ سال بعد اللہ نے آپ پر کرم کیا ہے۔ آپ کا Baby نیچے کی طرف زیادہ ہے اس کے لیے تھوڑی زیادہ احتیاط کریں۔ سفر، سخت کام اور زیادہ جھکنے سے پرہیز کریں۔ اللہ کرم کریں گے۔

☆ مبشرہ لاہور: آپ کی ماہواری کا مسئلہ ٹھیک ہوگیا بہت اچھا ہے لیکن پلیز وزن ابھی بھی بہت زیادہ ہے۔ 95 سے 80 پر آئی ہیں۔ آپ کا قد پانچ فٹ ہے۔ اس لحاظ سے آپ کی عمر کے مطابق آپ کا 60 کلو وزن آئیڈیل ہوسکتا ہے۔ مسلسل محنت جاری رکھیں۔

☆ اکمل شبیر صاحب: بہت بہت مُبارک ہو آپ کی محنت رنگ لائی ہے۔ آپ کی رپورٹس نارمل آئی ہیں۔ اب آپ کے دوسرے مسئلے کے لیے ڈاکٹر شاہد جو Male Sperm فرٹیلٹی کے ماہر ہیں مدد کرسکتے ہیں۔ اگر نمبر چاہیے تو فون پر رابطہ کرلیں۔ ویسے تو لاہور میں فرٹیلٹی ماہرین کے کئی سنٹرز کام کررہے ہیں مگر یہ بہت پیسے لیتے ہیں۔ اللہ آپ کو نیک اولاد سے نوازے (آمین)

☆ رجب احمد ساہیوال: آپ کا نام بہت پیارا ہے پہلی دفعہ سنا ہے! بہت مبارک ہو آپ نے بھی تین سال بعد کنسیو (Conceive) کیا ہے۔ پولی سسٹک اووری کوئی بہت بڑا مرض نہیں ہے بلکہ دُنیا میں کوئی مرض بڑا نہیں ہے صرف اللہ کی ذات بڑی ہے۔ شفا من جانب اللہ ہے۔ اس پاک ذات نے ہر مرض کی شفا اُتاری ہے۔ اللہ سے پُر اُمید رہنے والا ضرور شفایاب ہوتا ہے اور نا اُمید تو ہمیشہ خسارے میں رہتا ہے۔ بے شک اللہ سب سے بڑا اور مہربان ہے۔

اجازت چاہوں گی مجھے میرے اہل خانہ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ کیلوریز کا دھیان رکھ کر ہی آپ رمضان المبارک اور اس کے بعد اپنی زندگی کو بہتر اور خوب صورت بنا سکیں گے۔

قصہ کوئز 1

قائداعظم کی پہلی شادی ان کے لڑکپن میں انہی کے خاندان کی ایک لڑکی سے ہوئی تھی مگر چند ہی سال بعد جب وہ انگلستان میں زیر تعلیم تھے، ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ 1916ء میں جب وہ بمبئی کے سیاسی حلقوں میں خاصے معروف ہو چکے تھے، ان کے وسیع حلقہ احباب میں ایک پارسی دولت مند تاجر بھی تھے۔ رتی پٹیٹ ان کی بڑی بیٹی تھیں جو 20 فروری 1900ء کو پیدا ہوئیں۔ جب ان کی پہلی ملاقات قائداعظم سے ہوئی تو وہ فقط سولہ برس کی تھیں اور قائداعظم چالیس برس کے۔ جب رتی کی عمر قانونی طور پر بلوغت یعنی 18 سال ہوگئی تو وہ اپنے والدین کی دولت و ثروت کو خیرباد کہہ کر قائداعظم کے پاس پہنچ گئیں۔ 18 اپریل 1918ء کو رتی نے بمبئی کی جامع مسجد کے امام مولانا نذیر احمد خندی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا۔

(الف) رتی پیٹٹ کے والد کا نام بتائیے؟

(ب) رتی پیٹٹ کا اسلامی نام کیا رکھا گیا تھا؟

قصہ کوئز 2

16 نومبر 1897ء کو مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں موہیر میں پیدا ہوئے۔ قصبہ کی مسجد میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اینگلو سنسکرت ہائی اسکول جالندھر سے میٹرک میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور ان کی علمی، نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔

28 فروری 1933ء کو انہوں نے کیمبرج سے وہ تاریخ ساز پمفلٹ جاری کیا، جس میں پاکستان کا مطالبہ واضح طور پر کیا گیا تھا "ناؤ اور نیور" (اب یا کبھی نہیں) اس پمفلٹ کا عنوان تھا جس کی ذیلی سرخی تھی "ہمیں زندہ رہنا ہے یا ہمیشہ کے لیے نابود ہو جانا ہے۔" اس کتابچے میں انہوں نے پنجاب، کشمیر، سندھ اور بلوچستان کے علاقوں کو ایک وفاق کی صورت دینے کی تجویز پیش کی اور اس آزاد و خودمختار ملک کا نام "پاک ستان" تجویز کیا۔ پاکستان کے اجزائے ترکیبی کی وضاحت یوں کی گئی کہ پ پنجاب، ا، افغانیہ یعنی صوبہ سرحد، ک کشمیر، س سندھ اور تان بلوچستان کو ظاہر کرتا تھا۔

(الف) کس شخصیت کا ذکر ہے، نام بتائیے۔

(ب) وہ کب فوت ہوئے اور اُن کی قبر کہاں واقع ہے؟

قصہ کوئز 3

تحریک آزادی کے صف اوّل کے قائد، صحافی، شاعر۔ 1953ء میں موضع کوٹ مہرتھ ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ حیدر آباد سے 1905ء میں اپنا ماہنامہ "دکن ریویو" جاری کیا۔ ایک ڈراما "جنگ روس و جاپان" لکھا۔ اکتوبر 1909ء میں واپس کرم آباد آئے، جہاں سے ان کے والد مولوی سراج الدین احمد نے ہفت روزہ "زمیندار" جاری کر رکھا تھا۔ والد کے انتقال پر اخبار "زمیندار" کی ساری ذمہ داریاں ان پر آپڑیں۔ ساتھ ہی انہوں نے ایک ماہنامہ "پنجاب ریویو" کے نام سے بھی جاری کیا۔ مئی 1911ء میں وہ دونوں رسالے لے کر لاہور چلے آئے۔ یہیں سے ان کی ادبی، صحافیانہ اور سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔

(الف) کن صاحب کا ذکر ہے، نام بتائیے؟

(ب) انہوں نے کب وفات پائی؟

انعامات کے لیے تعاون

منشورات

خوبصورت اور معیاری کتب، کم قیمت اعلیٰ معیار

منصورہ، ملتان روڈ لاہور 042-35434909 042-35425356

چمنِ خیال

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

احمد ندیم قاسمی پہ خاص نمبر، عمدہ کام

بہت عمدہ شمارہ ہے۔ میں خود احمد ندیم قاسمی کا فین ہوں۔ اُردو ڈائجسٹ نے ان پہ خاص نمبر چھاپ کر بہت اچھا کام کیا ہے۔ فوج نے پڑھنے لکھنے کی ایسی عادت ڈالی کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مطالعہ ہی پہلی ترجیح اور محبت ہے۔ (بریگیڈیئر (ر) محمد اکرم۔ لاہور)

قائد کی ریذیڈنسی کی تباہی کا افسوس

جون کے وسط میں قائداعظم ریذیڈنسی کو تباہ کر دیا گیا۔ یہ تاریخی عمارت ہمارا قومی ورثہ ہے مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم قائد کے نظریات کے بھی وارث ہوتے، ہم لوگ ان کے نظریے کی پیروی کرتے۔ پھر شاید ہمیں عمارات کی تباہی سے اتنا دکھ نہ ہوتا۔

عمیر محمود نے اسامہ بن لادن کو ڈھونڈنے والے کی کتاب کے حوالے سے ایک معلوماتی تحریر پیش کی، اچھی اس لیے بھی لگی کہ کون 1345 روپے خرچ کر کے کتاب خریدے؟ عائشہ عباسی نے اللہ کے بارے میں اپنے قیمتی احساسات تحریر کیے۔ بہت کمال تحریر تھی۔ مزید قارئین کو بھی اس پر لکھنا چاہیے۔ 100 سال کی کہانی انتہائی دلچسپ مضمون تھا۔ رمضان المبارک کے مہینے کی مناسبت سے معظم علی کا رمضان المبارک کی قدیم روایات والا مضمون انتہائی دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ یہ روایات ہی جدید دور میں داخل ہونے کے باوجود ہمیں اپنی اقدار سے جوڑے رکھتی ہیں۔ معروف صنعت کار الماس حیدر کا انٹرویو پڑھا تو محنت و کوشش پر یقین مزید پختہ ہوگیا، شاندار انٹرویو تھا۔ اللہ تو خود قرآن میں فرماتا ہے کہ "اور انسان

کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔"
فیصل وڑائچ نے جیمز کیمرون کی جدوجہد سے بھرپور کہانی بیان کی، ٹائی ٹینک سے حاصل ہونے والی رقم اور ایک نوجوان کی مثال دلچسپ لگی۔ اصل بات یہ ہے کہ انسانی زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ کیونکہ زندہ انسان ہی کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھتے ہیں ورنہ کولہو کے بیل کی طرح زندگی گزارنے والوں کی بھی ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں۔

احمد ندیم قاسمی کا شمار اس عہد کے بڑے ادیبوں و شعراء میں ہوتا ہے۔ ان سے تو سیکھنے والے آج اوج کمال پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اُردو ڈائجسٹ مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے ادب کی دنیا کے ایک بڑے نام کو اتنے زبردست انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔

(رانا محمد شاہد۔ بورے والا)

خلیل جبران کی تحریر

لبنان کے عظیم شاعر اور فلسفی خلیل جبران کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ مجھے شاعروں میں اقبال اور غالب پسند ہیں اور نثر میں خلیل جبران میرا محبوب ادیب ہے۔ اگر آپ نے آج تک ان کی کوئی تحریر اپنے میگزین میں شائع نہیں کی تو ضرور شامل کریں۔ شکر گزار رہوں گی۔

(ڈاکٹر سید شفقت حسین جعفری۔ الفورڈ لندن)

زیارت۔ حملہ آور ناکام ہوئے

ایک افسوس ناک دلدوز خبر بار بار نشر ہوتی رہی کہ قائداعظمؒ کی ریزیڈنسی زیارت میں تباہ کر دی گئی۔ ملک سے محبت کرنے والے اس واقعے پر افسردہ ہوئے ہیں۔ حملہ کرنے والے لوگ مسلمان تو کیا انسان کہلانے کے بھی لائق نہیں ہیں۔ وہ کسی بھی رعایت کے مستحق نہیں۔ اس واقعے سے انھیں کچھ حاصل نہیں ہوا، الٹا بلوچستان کے غیور عوام نے اپنے قائداعظم سے بھرپور محبت کا اظہار کر کے، حملہ آوروں کے مقاصد ہی کو ناکام بنا دیا۔ لکڑی سے بنے کمرے اور فرنیچر دوبارہ بن جائیں گے مگر وہ محبت جو ہم سب کے دلوں میں اپنے وطن اور قائداعظم سے ہے اس کو ایسے واقعات سے نہ مٹایا جا سکتا ہے نہ اس میں کمی لائی جا سکتی ہے۔ (قاضی محمد یوسف۔ سلطنت اومان، مسقط)

اُردو ڈائجسٹ کا اعجاز۔ ہمیں محروم نہ کیجیے گا

ستمبر میں مولانا مودودیؒ کی وفات کے حوالے سے ایک تحریر "ابو الاعلیٰ مودودیؒ، ایک ہمہ جہت شخصیت" ارسال ہے۔ اُمید ہے کہ اشاعت کی مستحق قرار پائے گی۔ مولانا جیسی باکمال شخصیت پر اُردو ڈائجسٹ میں تحریریں، یہ آپ کا ہمیشہ سے اعجاز رہا ہے۔ ہمیں محروم نہ کیجیے گا۔ میں چند شخصیات کے حوالے سے تحریریں بھیجنا چاہتا ہوں۔ شورش کاشمیری کی تحریروں کے حوالے سے ایک مضمون "شورش شیریں و شورش بیاں" تیار کر رہا ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ حاصل مطالعہ کی مناسبت سے چیدہ چیدہ افراد مثلاً مشتاق یوسفی، مختار مسعود، ممتاز مفتی، اشفاق احمد اور دیگر چند کے حوالے سے جو مواد تیار کیا ہے وہ اردو ڈائجسٹ میں جگہ پا سکے۔ آپ کے حوصلے کا امتحان درکار ہے۔ (ڈاکٹر ندیم اکرام۔ راولپنڈی)

(ڈاکٹر صاحب! آپ شوق فرمائیے۔ ہمارے حوصلے ان شاء اللہ ایسے محبت بھرے امتحانوں میں سرخرو ہوں گے۔ مولانا کے حوالے سے آپ کی تحریر اور مشورہ دونوں زیر نظر ہیں)

جذبوں کی لَو کو تازہ رکھنے کی ضرورت

اگست میں ہم آزادی کا جشن منا رہے ہیں اور ستمبر میں اپنے قومی ہیروز اور آزادی کی راہ میں جان و مال اور اپنے خاندان تک قربان کر دینے والوں کی یاد تازہ کریں گے۔ پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی بات ہو یا مدینہ میں کسی فلاحی ریاست کا قیام، یہ عظیم خواب، قوموں کے زندہ اور متحرک ہونے کا ثبوت ہوتے ہیں۔

میرے خیال میں ان موضوعات، خصوصاً ماضی کی مکمل تصویر کو اُجاگر کر کے مستقبل کے لیے مشعل راہ بنایا جانا چاہیے۔ ہمیں ایسی فکری تحریک چلانے کی ضرورت ہے جو الجزائر نے فرانس کے خلاف اور فرانس نے نازیوں کے خلاف چلائی تھی۔ امید کی کرن اور آزادی کی مشعل ہر اس دل میں جلانے کی ضرورت ہے جو پاکستان اور اسلام کے نام پر دھڑکتا ہے۔ اُردو ڈائجسٹ اس مشعل کی لَو اپنے خاص نمبروں کے ذریعے تازہ رکھنا بخوبی جانتا ہے۔

(بریگیڈیئر مبشر الحق عباسی۔ راولپنڈی)

دل نشیں نمبر

احمد ندیم قاسمی کے نام کی طرح خاص نمبر بھی بڑا ہی دل نشیں لگا۔ پڑھ کر دل خوش ہوا۔ عطا الحق قاسمی کی تحریر زبردست خراج تحسین تھا۔ ٹائٹل بھی بے حد عمدہ تھا۔ ایک بڑے ہی سادہ، مخلص اور جدوجہد آزادی کے عظیم رہنما مولانا حسرت موہانی پر بھی کوئی گوشہ شائع کیجیے تاکہ نوجوان نسل کو آگاہی ہو سکے کہ آج کے سیاست دانوں اور ماضی کے سیاست دانوں میں کیا فرق تھا۔ سفرنامہ مصر و فلسطین بے حد معلوماتی اور امید سے بھرا ہوتا ہے۔ ایسی معلومات سچی بات ہے پہلے کہیں نہیں پڑھنے کو ملیں۔ کوئی غزا گیا ہی نہیں تو کہاں سے معلومات آتیں۔ اختر عباس کا درِ دل پہ دستک پڑھ کر دل میں ہمدردی کا جذبہ کچھ اور بڑھ گیا۔ واقعی لاجواب تحریر تھی۔ واہ کیا نام تجویز کیا ہے اللہ جی کو سلام، سبحان اللہ۔ جو لوگ بھی شوکت خانم ہسپتال گئے ہیں، کسی وجہ سے بھی ان کا یہ کہنا ہے کہ بھئی یہ غریبوں کے نام پر امیروں کا ہسپتال ہے۔ صاحب تحریر نے ان لوگوں کے خیالات کی تصدیق کر دی۔

جیمز کیمرون کی ہمت، حوصلہ، عزم اور محنت کا صلہ اللہ تعالیٰ نے اسے خوب دیا ہے۔ یہ نوجوانوں کے لیے ایک مثال ہے جو کہ گھر بیٹھ کر فقط سرکاری نوکری کے انتظار میں اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو ضائع کرتے ہیں۔

(محمد اویس دانش خانزادہ راجپوت۔ سکرنڈ)

دانائی اور حکمت بھرے سوال

کچھ عرصہ سے اُردو ڈائجسٹ میں سلسلہ وار اسلامی معلومات کے حوالے سے سوالات شائع ہوتے ہیں اور ان کا صحیح جواب بھیجنے پر انعام دیا جاتا ہے۔ بوجھیں تو جانیں کے عنوان سے بچپن سے بوجھو تو جانیں پڑھتے تھے۔ یہ بوجھنا عموماً پہیلی کے لیے ہوتا تھا۔ اور وہ اکثر بچوں کے لیے ہوتی ہیں، آپ نے 18 سے 28 سال کے افراد کو دعوت دی ہے۔ اس لیے "بوجھیں" لکھنا شروع کر دیا۔ اچھا ہے نئی ترکیب بن گئی۔ آپ جو کچھ پوچھتے ہیں یہ پہیلیاں نہیں یہ اچھی خاصی تاریخی معلومات ہوتی ہیں

اور بڑی دانائی اور حکمت سے قارئین تک پہنچا دی جاتی ہیں۔ کوئز (Quiz) کا متبادل اردو میں نہیں ہے کیا؟ (محمد اکرم خان۔ کوٹلی آزاد کشمیر)

(اردو میں مقابلہ معلومات اور کسوٹی وغیرہ استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اب کوئز بھی اردو ہی کا حصہ ہے۔ اردو زبان کی اس خوبی کو مولوی عبدالحق بابائے اردو نے اردو زبان کی مہمان نوازی سے تعبیر کیا تھا کہ نئے الفاظ کو بخوشی اپنا لیتی ہے)

بہتری کی گنجائش

10 جولائی کو اردو ڈائجسٹ ملا۔ میرے پاس ہی بیٹھی بیٹی مدثرہ خلیل ادارہ اردو ڈائجسٹ اور آپ کا شکریہ ادا کر رہی ہے کہ قصہ کوئز میں بذریعہ قرعہ اندازی اس کا انعام نکلا ہے۔ اردو ڈائجسٹ اب باکمال ڈائجسٹ لگتا ہے۔ کیونکہ جس محنت، جانفشانی اور لگن سے یہ شائع ہوتا ہے۔ اس نے اسے مارکیٹ میں دستیاب تمام ڈائجسٹوں کا شہنشاہ بنا دیا ہے۔ یقین کریں کوئی رسالہ معیار میں اس کے قریب بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ سب کی انتھک تخلیقی محنت سے یہ ممکن ہوا ہے۔

ہر شمارہ جلد کروا کر رکھنے کے قابل ہے۔ ایک ذاتی واقعہ بتاتا ہوں۔ میں جون 1999ء سے رسالہ کا سالانہ خریدار ہوں۔ ہر ماہ باقاعدگی سے رسالہ مل رہا ہے اور گزشتہ چودہ سال کے 168 شمارے میرے پاس محفوظ ہیں۔ پڑھ کر بڑے سلیقے سے رکھ دیتا ہوں۔ جب راولپنڈی سے بھابی ڈاکٹر فرزانہ یاسمین آتی ہیں تو اردو ڈائجسٹ مطالعہ کے لیے مانگتی ہیں۔ گزشتہ شمارے دیکھ کر حیران ہو کر مجھ سے پوچھنے لگیں کہ بھائی آپ رسالہ پڑھتے نہیں ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ پورا رسالہ اوّل تا آخر پڑھنے کے بعد لائبریری کی زینت بنا دیتا ہوں۔

اگر شمارے کی ہر تحریر پر تبصرہ کیا جائے تو کئی صفحات درکار ہوں گے اور چمن خیال کا کالم اس کی اجازت نہیں دیتا۔ بہتری کی گنجائش تو ہمیشہ رہی ہے۔ خصوصی نمبر کا سلسلہ شروع کر کے بہت اچھا کیا ہے۔

ہیپاٹائٹس سی کی وجہ سے انجکشنوں نے بے حد کمزور کر دیا ہے۔ 65 انجکشن لگ چکے ہیں 7 باقی ہیں۔ آخری چھٹے ماہ کا کورس جاری ہے۔ (محمد خلیل چودھری۔ دینہ جہلم)

ماہ رواں کی شخصیات

جولائی کا شمارہ جناب احمد ندیم قاسمی پر مبنی ایک ایسی یادگار دستاویز ہے جسے درس گاہوں کے کتب خانوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ کاش جہاں اس قدر محنت کی تھی وہاں سال بہ سال احمد ندیم قاسمی صاحب کا ادبی سفر بھی بیان کر دیا ہوتا، اس کام کو میں کر دیتا لیکن میں خود ایک مہینا کے نوٹس پیریڈ پر اس انتظار میں رہا کہ شاید کوئی دوسرا لکھ دے۔ قاسمی صاحب کا نمبر آپ کی ٹیم کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

خاص الخاص چیز مجھے ''ماہ رواں کی شخصیات'' کا کالم لگتا ہے جو دو ماہ گیپ کے بعد موجود ہے۔ اردو ڈائجسٹ پڑھنے میں اس قدر مزہ آ رہا ہے جو گزشتہ پچاس برسوں میں نہیں آیا۔ اس کام کو مزید سندِ پسندیدگی بخشنے کے لیے میں نے چھپن برس کی عمر میں اردو کمپوزنگ سیکھی، انٹرنیٹ کا استعمال سیکھا کیونکہ میں کیڈٹ کالج، آغا خان اور پھر گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن میں پڑھا چکا ہوں۔

(پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی، کراچی)

بزنس رول ماڈل

ماہ جولائی کا شمارہ بہت ہی اعلیٰ پائے کا تھا۔ خاص کر حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے متعلق لکھ کر ہماری خواہش پوری کی۔ بزنس رول ماڈل میں لباس حیدر سے آپ کی ملاقات پسند آئی، ان کی باتیں قابل غور اور قابل عمل ہیں۔ جب کہ ایلیا کا سردار پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اس وجہ سے ان قوموں کے نام زندہ ہیں۔ قاسمی نمبر شائع کر کے ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ ماضی کا سفر سو سال کی کہانی بھی ایک بہت اچھا معلوماتی مضمون تھا۔ اسی طرح سفرنامہ غزہ بھی ایک شاہکار ہے۔ اللہ تعالیٰ مصر کے حالات درست کرے اور یہ اسلامی ملک ترقی کرے۔ (محمود منور خان۔ بمقام کوٹ سنبلا نوالہ)

ہم اس طرف دھیان نہیں دیتے

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی بیمار ہو تو ضرور عیادت کو جائیں۔ اس ضمن میں کچھ رہنمائی دی جا رہی ہے:

1۔ مریض کے کمرے میں داخل ہوتے وقت اس کے لیے نیک جذبات رکھیں اور چہرے پر ایسے تاثرات لائیں جن سے باہمی اعتماد اور ہمدردی کی فضا پیدا ہو۔

2۔ مریض سے ملاقات کے وقت اسے صحت یابی کی امید دلائیں اور چہرے پر ایسے تاثرات پیدا نہ ہونے دیں کہ آپ بہت پریشان ہیں۔

3۔ مریض کے بستر سے دور بیٹھیں۔ یہ خیال رہے کہ پلنگ کو ٹھوکر نہ لگے۔

4۔ کمرے میں ایسی نشست پر بیٹھیں جہاں آپ مریض کی نگاہوں کے سامنے بآسانی رہ سکیں تاکہ اسے آپ کو دیکھنے کے لیے مڑنا یا گھومنا نہ پڑے۔

5۔ مریض کے سامنے زور زور سے بولنے اور قہقہے لگانے سے احتراز کریں۔

6۔ مریض کے پاس اچھی خبریں لے کر جائیں اور پریشان کن باتوں سے اجتناب کریں۔ کسی کے مرنے کی خبر ہرگز نہ دیں، مریض کو مالی اور معاشی مشکلات کی اطلاع بھی نہ پہنچائیں۔

7۔ آپ کی موجودگی کے دوران معالج جب کمرے میں داخل ہو یا کھانا آئے تو اگر ممکن ہو تو خاموشی سے کمرے سے باہر آ جائیں۔

8۔ مریض سے ملاقات کا وقت دس منٹ سے زیادہ نہ رکھیں، بیمار کے کمرے میں زیادہ دیر مت ٹھہریں۔ بستر پر پابند کر دیے گئے مریضوں پر بیماری کا غلبہ ہوتا ہے اور ان کو انتہائی آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

9۔ مریض کے عزیز و اقارب کو ملاقات کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اہتمام کرنا چاہیے کہ مریض کے اہل خانہ کو اگر کسی تعاون کی ضرورت ہے تو ان کی مدد کی جائے۔ مثلاً بیمار کے بچوں کو اسکول چھوڑنا اور گھر کا سودا سلف لانا وغیرہ۔

10۔ بیمار سے رخصت کے وقت جذباتی ہرگز نہ ہوں کہ اسے لگے کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ جلد صحت یابی کی دعا کر کے واپس آ جانا چاہیے۔ مختصر ملاقاتوں سے بیمار تھکتا بھی نہیں ہے اور اُسے یہ احساس بھی رہتا ہے کہ اسے فراموش نہیں کیا گیا۔ (حافظ احمد ہاشمی۔ لاہور)

اختر عباس

urdudigest.pk

akhterabas@ymail.com

ہماری لکیر کی طرف للچائی نظریں

زندگی کی لکیر سے انکار کیونکر ممکن ہے

ڈرائیور کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ شملہ کی پوری خوب صورتی اور موسم کی خوشگواری کا احساس رخصت ہونے میں بس چند لمحے لگے۔ ہم ابھی تک اس پارسی خاتون کے چہکنے اور بھٹو صاحب کی اندرا گاندھی سے دوستی اور شخصی التفات کے واقعات کے تجزیے میں مصروف تھے جو اس نے آنکھوں دیکھے بیان کیے تھے۔ پھر خود بھری محفل میں بھٹو صاحب سے سوال کر کے سنے تھے۔ اسی نے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس شملہ کے اس کمرے سے متعارف کرایا جہاں شملہ مذاکرات (جولائی 72ء) ناکامی سے دوچار ہونے والے تھے اور پھر دونوں سربراہان کمرے سے اُٹھ کر سائیڈ لان میں ٹہلنے کے بہانے اُٹھ گئے تھے۔ اس سیر کے دوران کیسے مذاکرات کا پانسہ پلٹا اور ہر چیز دونوں کے بیچ کیسے طے ہوئی اس راز کو کوئی نہ پا سکا۔ اس کی وہ گفتگو اور بیان کردہ واقعات ان تاریخی لمحات کا ایک نیا زاویہ سامنے لا رہے تھے۔ ہم نے اس دوران اس تاریخی کمرے میں گروپ فوٹو بنوانے کے بعد دونوں وزراء اعظم کے لیے مخصوص نشستوں پر خصوصی اجازت سے بیٹھ بیٹھ کر تصویریں بنوائیں۔ بھارتی حکام، صحافیوں کے پاکستانی وفد کی پذیرائی اور راہنمائی اتنے اہتمام سے کر رہے تھے کہ شملہ پریس کلب کے صدر دنیش گپتا کی باتوں کی تلخی بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی کہ جب اس نے یہ کہا کہ ”ابھی دونوں ملکوں کے تعلقات چاہے حکومت کی سطح پر ہوں یا عوام کی سطح پر، اس میں وہ گہرائی نہیں آئی کہ پائیدار اور قابل اعتبار کہلا سکیں۔“ ایک بم دھماکا، کوئی دہشت گردی کا واقعہ تعلقات کی ساری خوشی اور گرم جوشی کی جان لے سکتا ہے۔“ بات تلخ مگر سچ تھی اور آنے والے چند ماہ بعد 2005ء میں ’پیپل ٹو پیپل کانٹیکٹ‘ (People to people contact) کا نعرہ اور مظاہرہ یوں ختم ہوا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔

وی آئی پی بس کے ڈرائیور کی بے بسی بھری بڑبڑاہٹ پہلے ہم نے سنی، ”سر بریک کام نہیں کر رہے“ وہ انڈین ٹورازم ہوٹل سے گاڑی ریورس کر رہا تھا۔ اور پہلی بار پہاڑی علاقے میں بس چلا رہا تھا۔ شملہ بالکل ہمارے مری کی طرح ہے۔ بلندی 6 ہزار فٹ سے

کہیں زیادہ ہے اور خوب صورتی ایسی کہ انگریز حکومت نے اسے موسم سرما کا پایہ تخت بنا لیا تھا اور ریل کو اتنی سہولت اور آسانی کے ساتھ اس اونچائی تک لے گیا تھا کہ وائسرائے ہند کا خصوصی سیلون اور سیاح بڑے سکون اور تحفظ کے ساتھ شملہ کے صحت افزا ہل اسٹیشن پہنچ جاتے جہاں یخ بستہ ہوائیں اور قدرت کے بنائے موسم کی خوبصورتی بڑی فیاضی سے آنے والوں کا استقبال کرتی ویسے استقبال ہمارا بھی کوئی کم یادگار نہیں ہوا تھا۔ ہماچل کے وزیر اطلاعات نے بطور خاص اپنے ہاتھوں سے ہمیں مقامی روایت کی عکاس ٹوپیاں پہنائی تھیں۔ پنجاب اور ہریانہ کے گورنروں اور وزراء اعلیٰ کی دعوتیں اس پر سوا تھیں ہر جگہ لمبی تقریروں کے بعد شاندار کھانا کھلایا گیا تھا۔ مگر اس لمحے سب بے کار جانے والا تھا، ڈرائیور کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور پاؤں چل رہے تھے۔ آگے چلنے والی پولیس کی گاڑی کے حکام اس کیفیت سے بے خبر اور رونما ہونے والے حادثے سے بے نیاز تھے کہ بس میں کیا گزر رہی ہے؟ وہ ذرا فاصلے پر بس کے ریورس ہونے کے منتظر تھے۔ ڈرائیور جانتا تھا کہ کوئی لمحہ جاتا ہے وی آئی پی بس اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس نے بچنے کا آخری موقع جانتے ہوئے بس کو پولیس کی گاڑی سے جا ٹکرایا، پولیس وین ایک دوسری بس کے نیچے جا گھسی۔ ڈرائیور کی قسمت اچھی تھی ورنہ ٹانگیں کاٹ کر نکالنا پڑتا۔ سب لوگ کلمہ پڑھتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ فکر مند منتظمین نے جلد ہی دوسری گاڑی کا انتظام کر لیا۔ اس دوران پنجابی ڈرائیور کی آہ و بکا کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ جناب یہ لوگ مجھے مار دیں گے، آپ ساتھ لے کر ہی جائیں۔ کیا کرتا زندگی کی لکیر پر پولیس کی گاڑی کھڑی تھی، ٹکرانا پڑا۔ ابھی وہاں سے رخصت ہی ہوئے تھے کہ پاکستان سے ٹیلی فون آنے شروع ہو گئے، پتا چلا جیو پر پٹی چل رہی ہے کہ شملہ میں صحافیوں کی بس حادثے کا شکار ہونے سے بال بال بچ گئی۔ جیو کے رپورٹر نے شکر کا سانس لینے سے پہلے ہی خبر بھجوا دی تھی۔

یہ اسی دورے کی بات ہے، شملہ جانے سے پہلے ہم چندی گڑھ میں اراکین اسمبلی کے لیے بنائے گئے ہاسٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ پنج دریا کانفرنس کے موقع پر دوپہر کا کھانا اگر کانگریس کی طرف سے ہوتا تو رات کا کھانا بی جے پی کے کسی راہنما کی طرف سے ہوتا۔ بعض جگہوں پہ یہ بھی ہوا کہ کھانا اگر ایک پارٹی کے راہنما کی طرف سے تھا تو کھانے سے پہلے شراب کا اہتمام دوسری پارٹی کے راہنما نے کیا۔ یہ معمول پورے دورے کے دوران جاری رہا۔ ہندی اخبار دینک بھاسکر (Dainik Bhaskar) کے بیورو چیف شامی سارن (Shami Sarin) نے مجھ سے پوچھا آپ کو یہ دورہ کیسا لگا؟ میرا جواب اس کی توقع کے برعکس تھا اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ”پاکستان سے محبت کرنے کا ارادہ ہو تو بھارت ضرور آنا چاہیے۔ ایک بے پروا آدمی کا دل بھی واپسی تک ملک کی محبت سے آدھے سے زیادہ بھر جائے گا۔“ سارن جس کا اخبار چندی گڑھ، ہماچل، ہریانہ، مدھیا پردیش، راجستھان اور چتیس گڑھ سے چھپتا تھا، نے پوچھا کیوں؟ میرا جواب تھا ”جب سے ہم آئے ہیں کسی بھارتی اخبار کے صحافی سے لے کر کسی عام بھارتی نے بھی اپنے ملک کے خلاف کچھ کہا ہے نہ اپنی کسی ناپسندیدہ سیاسی پارٹی اور اس کے راہنما کے خلاف ہمارے ساتھ بیٹھ کر بات کی ہے۔ خدا جانے آپ سب کیسے جانتے ہیں کہ کیا بات کرنی ہے۔ کس حد تک کرنی ہے۔ آپ ہی نہیں آپ کے اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا بھی..... یہ دیش بھگتی سے زیادہ اپنی مٹی سے کھلی آنکھوں کیے گئے پیار کا عملی اظہار ہے۔“ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اگلی بات کہنے سے روکا کہ ”ہمارے ہاں سے جانے والے ہر وفد کے اراکین (جن کے بارے میں

ہمارے ہندو گائیڈ بڑی معصومیت سے بتاتے تھے۔ فلاں صاحب یہاں گرے تھے اور اس ہوٹل کی لابی سے فلاں عظیم رائٹر اور صحافی کو ہم اُٹھا کر لے گئے تھے) یہ لوگ وہاں نجی اور بڑی محفلوں میں توجہ پانے کے لیے اپنے ہی ملک اور لوگوں کے خلاف بات کر رہے ہوتے ہیں۔ ان سے اپنی شکایت کر کے داد لینے کی آرزو سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ کبھی سوچتا ہوں جیسے حج اور عمرے کے موقع پر اکثر بریفنگ اور میڈیکل چیک اپ کا سرکاری انتظام کیا جاتا ہے۔ بے شک جس کا یہاں لوگوں نے کاغذی خانہ پُری کے لیے متبادل نکال لیا ہے مگر پھر بھی میری دلی آرزو اور بھرپور خواہش ہے کہ بھارت ہر اکیلے یا وفد کی صورت جانے والوں کو سرحد پار کرنے سے پہلے Do's اور Do'nts ضرور بتائے جائیں۔ اس سے کم سے کم یہ تو ضرور ہوگا کہ واہگہ پار کرتے ہی جن پیاسوں کی زبانیں لٹک جاتی ہیں اور متلاشی نگاہیں اپنی سوچ کے مطابق ہر درخت کے ساتھ لٹکی اور دکان پر رکھی شراب کی بوتلیں ڈھونڈتی ہیں اور نہ پا کر ان کے بارے میں اشتیاق بھرے سوال پوچھ پوچھ کر خود شرمندہ ہوتے اور ہم سفروں کو شرمندہ کرتے ہیں، وہ باز آجائیں۔ وہاں جا کر کھانے پینے کے دوران آدابِ محفل کا خیال اور احساس کرنے لگ جائیں، وہاں محفلوں اور تقریبات میں کھانا دھیرے دھیرے چلتی قطار میں کھڑے ہو کر لیا جاتا ہے۔ قطار توڑ کر اچانک ڈونگوں پر جا پڑنے کا منظر شاید ہی کہیں دیکھنے کو ملا ہو۔ دوران گفتگو لوگ ہلکی پھلکی سماجی، ادبی گفتگو کرتے ہیں۔ ہماری طرح ہر لمحے سیاسی واقعات اور شخصیات کو موضوع گفتگو نہیں بناتے اور خاص طور پر اپنے گندے کپڑے تو دوسروں کے سامنے بالکل نہیں دھوتے، ملکی سلامتی سے متعلق اداروں کے بارے میں تو بات کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جانے والوں پر اگر یہ حقیقت واضح ہو تو یقین مانیے وہ لمحاتی دوستی کی نمائشی مسکراہٹ لینے کے لیے اپنے وطن کے حوالے سے کی گئی تلخ اور خلافِ حقیقت باتوں کا سلیقے سے جواب دینے کا موقع کبھی نہ گنوائیں گے۔ اپنے ملک کا نام، مقام اور تاریخ کی عزت کرنے والے ہی دوسروں کی نگاہوں میں باعزت ہوتے ہیں، خود کو برا سمجھنے، برا کہنے کی لت اور عادت میں مبتلا کسی فرد یا قوم کی دوسرے بھلا کیونکر عزت کر سکتے ہیں؟ ان کے چھوٹے بڑے لوگ کتنے سالوں سے ہمارے ہاں آرہے ہیں، مجال ہے کبھی اپنے نظام اور لوگوں کی خرابیوں پر انٹرویو اور بیان دیتے ہوں۔ یہ ہم میں سے ہی ہیں کہ وہاں جا کر یوں بچھ بچھ جاتے ہیں جیسے کمر میں ریڑھ کی ہڈی ہی نہ رہی ہو اور ان کی محبت اور توجہ میں مرے جا رہے ہوں۔

بھارت میں ''مصنوعی لکیر'' کا ذکر کچھ اس تواتر اور تسلسل سے ہر دورے کے دوران ہوتا ہے کہ ہمارے بعض نرم دل احبابِ صحافت اور اربابِ سیاست کو بھی وہ آہستہ آہستہ مصنوعی ہی لگنے لگی ہے۔ اس مصنوعی لکیر کے بارے میں ''اُس پار سے'' آنے والے مہمان تو بطور خاص ہمیں یقین دلاتے ہیں، بلکہ اسی بات کو بتانے، سمجھانے اور یقین دلانے کے لیے دوروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کی تقریروں، ظہرانوں اور عشائیوں میں اسی بات کا ذکر پیرائے بدل بدل کر ہوتا ہے۔ پاکستانی قوم بالخصوص اور ہمارے بڑے بڑے سیاسی لیڈر بالعموم بڑے بامروت اور مہمان نواز ثابت ہوئے ہیں۔ کسی کے اظہارِ خیال میں نہ مخل ہوتے ہیں، نہ تردید کرتے ہیں، نہ تصحیح کرتے ہیں۔ ہماری بنیاد اور اصل کے بارے ایسی لایعنی باتوں کے مواقع پر ہم جس طرح جھوٹے دانشوروں کی طرح جھوٹا مسکراتے ہیں اور وسعتِ قلب کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ منظر تو ریکارڈ کر کے کسی فلم یا ٹیلی ویژن سوپ کا حصہ بنا دینا چاہیے تاکہ دیکھنے والوں کو کچھ تو عبرت ہو۔

اس دورے کے دوران ایک روز مشرقی پنجاب کی

ڈپٹی چیف منسٹر سردارنی راجندر کور مٹھل کے گھر کھانے پر مدعو تھے۔ بھارت میں یہ ہمارا آخری دن اور آخری دعوت تھی، جو ناشتے سے شروع ہو کر لنچ تک چلی۔ سردارنی نے میزبانی بھی بہت دل سے کی اور تقریر بھی اسی جذبے سے کی، پھر اچانک یہ بتاتے بتاتے کہ 1947ء میں، ان کا جنم لاہور کی ایک جیل میں ہوا تھا، جہاں ان کی ماتا جی جنگ آزادی کی وجہ سے قید تھی۔ وہ کہنے لگیں ''1947ء ایک خوفناک خواب تھا، ہمیں اب اس کو بھول جانا چاہیے، تب سے ہمارا پنجاب ادھورا اور نامکمل ہو گیا ہے، ہمیں اس کو مکمل کرنا چاہیے۔'' (ادھورے پنجاب نوں مکمل کرن لئی ساڈھے بازو تہاڈے لئی کھلے نیں) (ادھورے پنجاب کو مکمل کرنے کے لیے ہمارے بازو آپ کو گلے لگانے کے لیے کھلے ہیں)

یہ سن کر میں بے اختیار مسکرا دیا۔ اتنی سنجیدہ تقریر کے جواب میں مسکراہٹ پر حامد ریاض ڈوگر نے پوچھا: کیا ہوا؟ میں نے انھیں لان کے ایک کھلے حصے کی طرف لے جا کر بتایا کہ 1980ء کی دہائی میں جب لاہور کے سابق میئر خواجہ حسان، پنجاب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر تھے۔ انھوں نے بھی سال اوّل کے ایک استقبالیہ میں، جہاں چھ سات ہزار لڑکے لڑکیاں جمع تھے، اسی طرح کا جملہ کہا تھا ''ہمارے دل ہی نہیں بازو بھی میری بہنو! آپ کے لیے کھلے ہیں۔'' اس جملے کے بعد مسکرانے کی باری حاضرین کی تھی، جو صنف نازک کی نشستوں کی طرف دیکھتے تھے اور مسکراتے تھے، بعض کے قہقہے تو خاصے بلند آہنگ تھے۔ ابھی ہم یہ بات کر ہی رہے تھے کہ اعلان ہوا پنجاب اسمبلی کے سپیکر اور ممتاز کانگریسی رہنما ڈاکٹر کیول کرشن خطاب فرمائیں گے۔ کچھ حاضرین کرسیوں پر بیٹھے جوس پی رہے تھے، کچھ مکئی اور ساگ کھا رہے تھے اور باقی دائرے میں بڑے احترام اور مروت سے کھڑے تھے۔ ڈاکٹر کیول نے تو آغاز ہی مصنوعی لکیر سے کیا..... کہنے لگے ''دو قومی نظریہ، انگریزوں کی پھیلائی ہوئی سازش تھی، ہم ایک ہی قوم کے لوگ ہیں۔ اس مصنوعی لکیر کے باعث الگ الگ ہو گئے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ سامراج کے بنائے ہوئے دو قومی نظریے اور مصنوعی لکیر کو بھلا کر ہاتھ ملا کر آگے بڑھیں۔''

ڈاکٹر صاحب تو ابھی اور آگے بڑھنے والے تھے، مگر حافظ شفیق الرحمٰن، حامد ریاض ڈوگر، امجد وڑائچ، شفیق پسروری اور ظہیر بابر کے منہ بن گئے۔ حافظ صاحب نے تو غصے میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ ''آپ دو قومی نظریے کے بارے میں ایسی بات کر کیسے سکتے ہیں؟ فضا میں بڑبڑاہٹ بڑھ گئی تو ڈاکٹر صاحب نے کسی بدمزگی سے بچنے کے لیے اپنی گفتگو ختم کر دی۔ وہ جونہی تقریر سے فارغ ہوئے اور ایک راؤنڈ ٹیبل پر آکر بیٹھے، میں نے آگے بڑھ کر تعارف کرایا اور ساتھ بیٹھ گیا، میز چونکہ مرکزی تھا، دیگر اہم کانگریسی راہنما بھی یہاں موجود تھے۔ کل ملا کر ہم 14 لوگ تھے۔ میں نے بڑا معصومانہ سا سوال کر ڈالا ''ڈاکٹر صاحب! پنجاب اور ہریانہ کا دارالحکومت ایک ہی شہر ہے، پھر صوبے الگ الگ کرنے کی ضرورت کیوں پڑی؟ انھوں نے اس بے ضرر سے سوال کو سنا اور بولے: ''اصل میں ہمارے ہاں 1966ء میں بہت ہنگامے ہوئے تھے، جن میں 10 ہزار کے قریب لوگ مارے گئے۔ مردم شماری میں پنجاب اور ہریانہ کی آبادی کی زبان الگ الگ قرار دے دی گئی تھی۔ ہریانہ میں زیادہ ہندو آبادی ہے، ان کی زبان پنجابی نہیں ہے، ان کا خیال تھا کہ پنجاب ان کا استحصال کر رہا ہے، اس لیے بڑی سوچ بچار کے بعد صوبے الگ الگ بنا دیے گئے۔ دوسرا کوئی موزوں شہر تھا نہیں، اس لیے چندی گڑھ ہی دونوں صوبوں کا دارالحکومت قرار دے دیا گیا۔''

میں مسکرایا تو کئی ایک ساتھیوں نے باقاعدہ ساتھ دیا۔ شاید وہ جان گئے تھے کہ میرا اگلا سوال کیا ہوگا۔ میں نے اسی لہجے میں پوچھا: ڈاکٹر صاحب! 14 ضلعوں پر مشتمل مشرقی پنجاب کو دو نہیں تین صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہماچل پردیش (پہاڑی علاقہ)، ہریانہ (ہندو اکثریت کا علاقہ) اور پنجاب (پنجابی اکثریت کا علاقہ) جب ان کو الگ الگ کیا گیا تو انگریز کو گئے 19 سال ہوگئے تھے۔ کیا یہ تقسیم بھی انگریزی سازش تھی!" بولے "نہیں نہیں! یہ تو انتظامی تقسیم تھی" اب ان کے چہرے پر پسینے کے قطرے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب! تھوڑی زیادتی نہیں ہے کہ ہمارے لاکھوں لوگوں کی جانیں گئیں، آزادی اور عزت کے ساتھ جینے کے حق کے لیے تقسیم ہوئی تو وہ بقول آپ کے مصنوعی لکیر ہے اور آپ اسے انگریز کی سازش کہتے ہیں۔ دو قومی نظریے کو بھی برا بھلا کہتے ہیں، خود آپ اپنے لوگوں کے مطالبے پر دس ہزار بندوں کے مرنے کے بعد اپنے ایک صوبے کو تین صوبوں میں تقسیم کردیتے ہیں اور اسے انتظامی تقسیم کہتے ہیں۔ سازش بھی نہیں مانتے اور ان کو اکٹھا کرنے کی بات بھی نہیں کرتے جب کہ "ہماری لکیر کو مٹانے کے لیے فرما رہے ہیں۔"

گول میز پر بیٹھے کچھ چہروں پر مسکراہٹ آئی اور کتنے ہی چہروں پر پسینہ۔ لیفٹیننٹ کرنل (ر) سی ڈی سنگھ کمبوہ نے جو تب وہاں پنجاب ہیلتھ فاؤنڈیشن کے چیئرمین تھے، نے میری طرف دیکھا اور بولے "بس کریار! توں تے سپیکر صاحب نوں لاجواب کر دِتا اے۔" (بس کریار! اس موضوع پر بہت بات ہوگئی، آپ نے تو سپیکر صاحب کو لاجواب کردیا ہے)

کھانے کے دوران بھی اس موضوع پر گفتگو جاری رہی، مگر اب اس کا لہجہ اور ٹون بدلی ہوئی تھی۔ سربجیت بندھائک بے اختیار بول اُٹھا "تقسیم ایک سچ ہے، لکیر ایک حقیقت ہے، مصنوعی نہیں ہے، یہ خود انسانوں نے انسانوں سے تنگ آکر بنائی تھی اور یہ بنی رہے گی۔ اس کو حقیقت مان کر ہی بات کرنی چاہیے۔"

اس گفتگو کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ امرتسر میں جب الوداعی دعوت اور گفتگو ہو رہی تھی تو چندی گڑھ پریس کلب کے صدر رمیش چودھری، (ڈیلی ٹریبون) نے اپنی تقریر میں کہا کہ "لکیر کو مصنوعی کہنے اور مٹانے کی باتیں کرنے سے دوستی نہیں بڑھے گی، بلکہ دوریاں بڑھیں گی، اس لیے حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے۔ دونوں ملکوں کی الگ الگ حیثیت ہے، اس کو مان کر ہی دوستی ہوسکتی ہے۔

کتنا اچھا ہو بھارت میں ہمارے میزبانوں اور یہاں سے جانے والے مہمانوں کو بھی یہ یاد رہے کہ ہمارے وطن کی آزادی اور علیحدگی کی یہ لکیر مصنوعی نہیں ہے۔ نہ تو ریت پر کھینچی لکیر ہے، نہ پانی پر بنی لکیر..... اسے دکھ، درد اور قربانیوں کی ایک لازوال تحریک نے جنم دیا تھا، تاکہ ہم آزادی، وقار اور خوشحالی سے اپنے دین اور تہذیب کے مطابق جی سکیں۔ مروت اپنی جگہ پر بجا، مگر تاریخ کا ریکارڈ درست رکھنا بھی ضروری ہے..... نئے نئے دوستوں کے لیے پرانی تاریخ سے نہ انکار ممکن ہے، نہ تبدیلی..... یہ اتفاقیہ لکیر تھی، نہ انتظامی۔ بس کا ایک ڈرائیور زندگی کی لکیر کی تلاش میں پولیس کی گاڑی کو جا ٹکراتا ہے یہاں تو پوری مسلمان قوم ٹکرائی تھی تب جا کر یہ لکیر واضح ہوئی تھی۔ یہ ہماری زندگی کی لکیر ہے اور بھلا اپنی زندگی کی لکیر سے انکار کیونکر ممکن ہے اور اگر انھیں لکیر مٹانی ہی ہے تو اپنی انتظامی لکیر مٹا کر تینوں صوبے اکٹھے کرلیں۔ یہ ہماری لکیر کی طرف یوں للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھیں۔

TENDER NOTICE

Scaled tenders based on item-rates / percentage rates circulated by Finance Department for District OKARA (amended up to the date of tenders) are hereby invited for the work mentioned below from the approved Contractors / Firms of the C & W Department, District Government / EDO (W&S) OKARA.

Tenders documents can be obtained from the office of the undersigned & Office of the EDO (W&S), Okara against 2% earnest money in the shape of deposit call from schedule bank of Pakistan and written request on letter pad accompanied with attested copies of enlistment, upto date fee deposit with the district and registration of Pakistan Engineering Council / License fee, Authority letter (only in favour of member of firm will be accepted), identity card of the contractor / managing partner of the firm alongwith registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee. The tender documents shall only be issued on payment of prescribed tender fee. Without fulfillment of the above requirements tender shall not be issued.

Tendered rates and amounts should be filled in figures as well as in words and Tenders should be signed as per general directions given in the Tender documents. No rebate on tendered rate will be acceptable.

Tender will be issued upto 13-08-2013 during office hours and Tender will be received in the office of the EDO(W&S), Okara up to 15-08-2013 at 12-30 P.M on the date of opening of tenders and will be opened immediately thereafter by the Tenders Opening Committee in the presence of in tending contractors or their representatives.

Participation of elected representative, press reporters or any person in tending to observe the tendering process will be appreciated.

Conditional Tenders and Tender not accompanied with earnest money in shape of Deposit at Call receipt from Scheduled Bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firm will not be entertained.

Undersigned shall have the right of rejecting any or all of the tenders without assigning any reason thereof.

Note: Last date for issue Tenders is 13-08-2013 & Opening date 15-08-2013

S #	Name of work.	Estimated cost & Earnest Money	T/S No. & Dated	Completion time	Tender Fee.
1	Provision of Missing Facilities (Addl: Class Room, Dangerious Buildings in Govt: Primary School Rehman Colony Okara.	Rs.4000000/- Rs.80000/-	D.O. No.621/DB dt: 12-07-2013	6- Month	2000/-
2	Provision of Missing Facilities (Addl: Class Room, Dangerious Buildings in Govt: Boys High School Molia Chishti Tehsil Depalpur District Okara.	Rs.3000000/- Rs.60000/-	D.O. No.627/DB dt: 12-07-2013	5- Month	1500/-
3	Provision of Missing Facilities (Addl: Class Room, Dangerious Buildings in Govt: Boys High School at Chak No.12/G-D District Okara.	Rs.4000000/- Rs.80000/-	D.O. No.632/DB dt: 12-07-2013	6- Month	2000/-
4	Provision of Missing Facilities (Addl: Class Room, Dangerious Buildings in Govt: Girls High School at Rajowal Tehsil Depalpur District Okara.	Rs.5000000/- Rs100000/-	D.O. No.638/DB dt: 12-07-2013	6- Month	2500/-

NOTE:- In case of tenders amount being less then 5% of estimated amount, the lowest bidder will have to deposit Additional Performance Security in the shape of deposit at call from any schedule bank equal to the amount difference between estimated & quoted amount with in 15-days otherwise it will be rejected.
The cost of tender fee must be prepared in shape of CDR from any schedule bank of Okara City.

IPL — 7333

SECRETARY
TENDERS OPENING COMMITTEE
DISTRICT OFFICER
BUILDINGS DIVISION, OKARA

از مرتضیٰ غلام ایچیول ایڈمنسٹریشن تحصیل پاکپتن کو جوڑا والہ

اشتہار نیلام گرایداد برائے قائم کرنے کینٹین سٹی پارک تحصیل پاکپتن کو جوڑا والہ

(05) 2017-18 تا 2013-14 سال

برنظر نیلام عام مورخہ 11 بجے دن ہوگا۔

ہفت صد ۷۰۰ ۔ ۸

ہر مشتہر اشیاء کرایداری برائے قائم کرنے کینٹین کیلئے بقدر 12 مرلے کرسلاٹ
بعد کرایداری ازتاریخ قبضہ شروع ہوگی۔ معیاد کرایداری بتقاضا پانچ سال ہوگی جس میں ہر چھ ماہ بعد کرایہ میں
مبلغ ۱۰ فیصد اضافہ کے ساتھ ہوگی مدت پانچ سال پوری ہونے پر نیلامی ہوگی جس میں سب سے زیادہ بولی
دینے پر موجودہ کرایدار اگر دیئے چڑھا نہیں ہوگا تو پہلا حق اس کا ہوگا۔
جس شخص کی بولی منظور کی جائے گی وہ سالانہ کرایہ کی بولی کی چوتھائی اقساط میں جمع کرانے کا پابند ہوگا کینٹین کرایدار پر دو ماہ بعد پانچ
ماہ کی قسط کی ادائیگی کرنے کا پابند ہوگا جن کرنے کی صورت میں سود ماہ کر دیا جائے گا۔
کرایدار کینٹین میں منظور شدہ ہی اشیاء فروخت کرنے کا پابند ہوگا جس کے ہر ایک ریٹ سے بعد از منظوری ایڈمنسٹریٹر TMA
کرایدار کینٹین میں ہیٹ کے کینٹین ہائے پر اوزان کرنے کا کرایدار پابند ہوگا۔ اور ہر گز زائد وصولی نہیں کرے گا۔ اگر زائد وصولی کرتا ہوا پایا گیا
تو اس کے خلاف حسب ضابطہ کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ تمام مشتہر اشیاء خطان صحت کے اصولوں مطابق فروخت کی جائیں گی۔
کینٹین کی صفائی کا ساتھ ساتھ کرایدار کا اور پانی کے بھرنے کی ذمہ داری کرایدار کی ہوگی اور کرایدار کا اصول مقررہ اور سرکاری اداروں کو
نقصان نہ پہنچے کرایدار کو از کرنے وغیرہ کے لئے چھوٹے ڈرم (بانک) کا استعمال کرے گا۔ شمول
ہیکڈ ائیک وغیرہ کا کرایدار کو لوگ حاضر ہوں اپنے خرچ پر کرایدار کا پابند ہوگا۔
کسی بھی قسم کی ضمانت نہ ہوگی۔ کینٹین پر صرف اس کے ہر کا پابند ہوگا کسی بھی کمپنی کا پابند ہوگا
سے پہلے ہفتہ میں ایک دن کے لئے کینٹین کے مطابق قسم جمع کرانے کا پابند ہوگا۔
موجودہ کے انتظام پر ہر چیز پر الاؤنس مدت حالات میں ہے پانچ کا پابند ہوگا۔ اور ہر مدت پر لاکھ قسم بکھرنی کی قسم سے کاٹ لی جائے گی۔
کینٹین بنانے اور مدت حالات میں ہے پانچ کا پابند ہوگا اور ہر مدت پر لاکھ قسم بکھرنی کی قسم میں سے کاٹ لی جائے گی۔
بجلی کی بکھرنی اور چارج کی ادائیگی ہوگی۔

کرایدار کو دوبارہ چلانے کے لئے خلاف ضرور کیا جائے گا۔ کرایدار کی دوسرے شخص کو کرایہ پر
کرایدار کو دوبارہ چلانے کے لئے خلاف ضرور کیا جائے گا۔ کرایدار کی دوسرے شخص کو کرایہ پر
دینے کا اجازت نہ ہوگا۔ اجازت اپنے سامان کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوگا۔ کم از کم بکھرنی کا دوبارہ اپنے خرچ سے
کرنے کا پابند ہوگا۔

درخواست کی کمی بیشی بل محکمہ کی طرف سے جاری کردہ کال نوٹس کی صورت میں وصول کی جائے گی جو کہ کام پر لی ہوگی ان کو موقع پر
ادا کرنا ہوگا۔

[illegible] کی طرف سے نوٹس منظوری کرایہ داری جاری ہونے کے سات دن کے اندر جمع کروانے ہوں گے۔ منظوری کی رقم [illegible] کرایہ داری پر واپس دی جائے گی۔

[illegible] کرایہ داری اگر نقل کی متعلقہ دفعات کی روشنی میں سالانہ کرایہ کا اظہار کرنے کا پابند ہوگا۔

[illegible] کرایہ داری کی منظوری تابع توثیق ہوگا اتھارٹی ہوگی تصدیق کون دے گا اتھارٹی منظور یا نہ منظور کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہوگا۔

[illegible] کسی بھی باہمی اختلاف یا کسی بھی شق پر تنازعہ کی صورت میں معاملہ برائے مصالحت جناب DCO صاحب کو ارسال کیا جائے گا جس کا فیصلہ [illegible] قابل تسلیم کیلئے حتمی ہوگا اور فیصلہ کے خلاف کسی بھی عدالت میں یا کسی بھی فورم پر اپیل نہیں کی جا سکے گی تا فیصلہ ثالث ٹھیکہ دار کا [illegible] اشتہار دینے کی پابند ہوگا۔

[illegible] دیگر شرائط و مزید معلومات دفتر ٹی او ٹی کار میں دفتر TO(I&S) سے معلوم کی جا سکتی ہیں نیز موقع پر شرائط نیلام پڑھ کر بھی سنائی جائیں گی

نوٹ:- کرایہ داری پر پراپرٹی رائٹ کی روشنی میں نیلام کی جائیگی۔

نمبر	نام مدات آمدن	سرکاری بولی	زر ضمانت	معیاد ٹھیکہ جات
1	پانسہ (نزد مین گیٹ)	2,16,000/-	20,000/-	معیاد کرایہ داری از تاریخ قبضہ شروع ہوگی
2	عارضی (نزد فن لینڈ)	1,50,000/-	15,000/-	ایضاً
3	عارضی (نزد ہم پارٹ)	1,50,000/-	15,000/-	ایضاً

آئی پی ایل نمبر 1275

المشتہر

[illegible] سعید

ایڈمنسٹریٹر، ٹھنڈی پریذیڈنٹ گوجرانوالہ

یہ اکلوتا بیان ہی صاحبزادے پر بھاری پڑا تھا
جو قوم کو چاہئے تھا وہ تو 5 سال حکومت نے نہ دیا
جو نہیں چاہئے، اس کے ذکر کا فائدہ؟